پاکستان کے متنازعہ سیاستدان

سیاستدانوں اور سیاسی بیوروکریٹس پر لگنے والے
سیاسی و مالی بدعنوانیوں کے الزامات کی داستان

مجاہد حسین
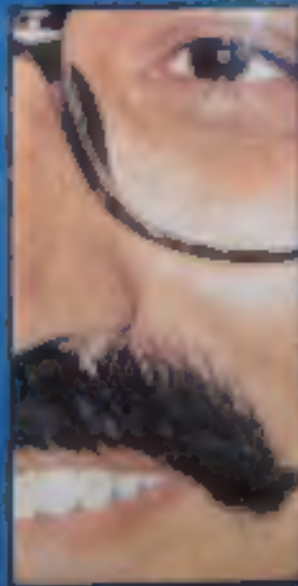
Ebook By

Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

پاکستان کے متنازعہ سیاستدان

مجاہد حسین

اکرم آرکیڈ، ۲۹، ٹیمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۳

ناشر : تخلیقات لاہور
زیر نگرانی لیاقت علی
پرنٹرز : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سن اشاعت : 1997ء
قیمت : 230/= روپے

انتساب

ان باضمیر لوگوں کے نام

جو پاکستان میں کرپشن، سیاسی بددیانتی اور

سیاسی جرائم

کے خلاف پچاس سال سے برسرپیکار ہیں

فہرست

پہلی بات	7
شخصیات کا عروج، ریاست کا زوال	9
آصف علی زرداری	15
جنرل آصف نواز جنجوعہ	31
جنرل مرزا اسلم بیگ	39
الطاف حسین	47
نواب کالا باغ امیر محمد خان	57
اظہر سہیل	63
جنرل رانی	77
جنرل ایوب خان	85
بے نظیر بھٹو	97
بلخ شیر مزاری	113
جی ایم سید	119
حامد ناصر چٹھہ	127
خالد احمد کھرل	133
ذوالفقار علی بھٹو	141
رعنا شیخ	155
سلمان فاروقی	161
شفیع محمد سوانی	167
جام صادق علی	171
جنرل ضیاء الحق	179
چودھری ظہور الٰہی	193
سردار عارف نکئی	203

○ سید عبداللہ شاہ	217
○ عثمان فاروقی	225
○ عمران خان	235
○ غلام اسحاق خان	243
○ غلام حیدر وائیں	251
○ گورنر جنرل غلام محمد	257
○ غلام مصطفیٰ کھر	267
○ غلام مصطفیٰ جتوئی	277
○ سید غوث علی شاہ	285
○ سردار فاروق لغاری	291
○ قاضی حسین احمد	299
○ لیاقت علی خان	305
○ میر مرتضیٰ بھٹو	311
○ ملک مشتاق اعوان	317
○ شیخ مجیب الرحمٰن	331
○ جسٹس محمد منیر	341
○ محمد خان جونیجو	345
○ میاں منظور وٹو	353
○ ایڈمرل منصور الحق	369
○ نواب زادہ نصراللہ خان	377
○ مس ناہید خان	383
○ نواز شریف	395
○ نصیراللہ بابر	409
○ یحییٰ خان	415
○ یونس حبیب	424

پہلی بات

یہ کتاب ان شخصیات میں شامل ایک تہائی شخصیات کا تذکرہ کرتی ہے جو گزشتہ نصف صدی سے پاکستان کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ جمہوری حکومتوں اور مارشل لاء کے زیر سایہ "سرگرم" رہنے والی ان شخصیات نے ذاتی مفادات کشید کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس دوران ذرائع ابلاغ میں ان شخصیات پر جو الزامات لگائے گئے' ان الزامات نے انھیں متنازعہ بنا دیا ہے۔ میں نے مکمل پیشہ ورانہ غیر جانبداری اور تحقیق سے کام لیتے ہوئے ان طاقتور شخصیات پر لگائے جانے والے الزامات کو یکجا کر کے آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ یہ کام تنہائی اور خطرات کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس کے باوجود یہ میرے پیشہ ورانہ عمل کا دوسرا مرحلہ ہے۔ پہلا مرحلہ "پاکستان لوٹنے والے" لکھ کر عبور کیا۔ اس دوران دوستوں اور چند خیر خواہوں نے حوصلہ افزائی تو کی لیکن خدشات کے ذکر کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ ہمارے یہاں تو ایک صحافی کے لیے اپنے آپ کو "محفوظ" کرنے کا نادر نسخہ یہ ہے کہ کسی ایک سیاسی یا مذہبی جماعت یا پھر اقتدار کے لیے مارے مارے پھرنے والے غیر معمولی طور پر امیر ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کر لیا جائے۔

ایسی درجنوں مثالیں موجود ہیں کہ کس طرح ہمارے دوست صحافیوں نے اپنی نوکریاں محفوظ کر لیں اور معاشی مسائل کا تدارک کر لیا۔ لیکن یہ ان کا مسئلہ ہے اور ہمت ہے۔ میں نہ تو کسی سیاسی جماعت یا مذہبی جماعت سے نفرت کرتا ہوں اور نہ ہی کسی شخصیت کے ساتھ میرا کوئی فکری مجادلہ ہے۔ میں تمام چیزوں کو اپنے پیشے کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

پاکستان کی متنازعہ شخصیات پر لکھنے کی میری شروع سے خواہش رہی ہے۔ جبکہ

اس خواہش کی تکمیل بہت محنت مانگتی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان تمام شخصیات پر لکھ سکوں جنہوں نے اس ملک پر اپنا "اثر" چھوڑا ہے اور جو آج بھی اس ملک کے مقدر سے کھیل رہی ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد میں صرف اس مرحلے کا ایک تہائی کام مکمل کر سکا ہوں۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو میں شاید یہ سارا کام مکمل کر جاؤں۔ زیر نظر کتاب میں شامل زیادہ تر مواد میری ذاتی تحقیق کا ثمر ہے جبکہ میں نے مختلف اخبارات' رسائل اور جرائد سے بھی مدد لی ہے لیکن میں اس سارے مواد کا تفصیلی ذکر کرنے سے قاصر ہوں۔

اس کتاب کی تکمیل میں میرے جن مہربانوں اور دوستوں نے میرا ساتھ دیا ہے' میں ان کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں۔ خصوصاً روزنامہ "خبریں" اور "صحافت" کے چیف ایڈیٹر جناب ضیاء شاہد کا میں بہت ممنون ہوں' کہ انہوں نے "خبریں" کے سنڈے میگزین کے لیے مجھے لکھنے کی دعوت دی اور ملازمت بھی دی۔ یہ انہیں کا آئیڈیا تھا کہ ایک شمارے میں ایک بڑی سیاسی شخصیت کے تمام "کارناموں" کو یکجا کیا جائے۔ میں یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا کیونکہ مجھے "خبریں" کی ملازمت چھوڑنا پڑی۔ لیکن یہ آئیڈیا مجھے ذاتی طور پر بہت پسند آیا اور میں نے کتاب لکھنے کی ٹھان لی۔

کتاب کی تکمیل میں معاونت کرنے والے دوستوں خصوصاً سرفراز ملک' احمد نواز وٹو' انجم ممتاز اور طالب فریدی کا بھی میں بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میری خصوصی مدد کی۔ میں محترم دوست صابر نذر کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے خصوصی طور پر کتاب کے لیے کارٹون بنائے۔

آخر میں' میں ان دو شخصیات کا خصوصاً ذکر کروں گا' جن کا تعاون اور حوصلہ افزائی میری سب سے بڑی قوت ہے۔ یہ ہیں عندلیب حیدر اور زاہد حسین جن کی مدد کے بغیر میں شاید بہت بیکار ہوں۔

مجاہد حسین

24 ستمبر 97 _ اقبال ٹاؤن لاہور

شخصیات کا عروج' ریاست کا زوال

تاریخ میں مثالی معاشرے کے بارے میں بحث چلتی آئی ہے۔ اس کے تحت ریاست کا تخیل اجتماعیت پر زور دیتا ہے۔ اگر معاشرہ صحیح خطوط پر تشکیل پا جائے تو انفرادی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ یونان میں پہلے مثالی معاشرے کا تصور سقراط نے پیش کیا۔ اس کی کتاب "نظریہ ریاست" کا ذیلی موضوع "انصاف" یا "عدل" تھا۔ اس سے پہلے وہ "حسن" کا تصور پیش کر چکا تھا۔ اس کی نظر میں حسن کا تصور انفرادی تھا اور عدل کا تصور اجتماعی۔ اس کی مثالی ریاست میں انفرادی حقوق کو نظر انداز کیا گیا اور ریاست کو مثالی بنانے کے لیے شخصی آزادی پر پابندی لگائی گئی۔ سقراط جمہوریت سے ناراض تھا' کیونکہ یہ مثالی نہ تھی' بلکہ اس کا عامیانہ پن اس کے تخیل کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ چنانچہ جب ایتھنس میں آمریت آئی تو سقراط نے ان جرنیلوں کا ساتھ دیا' جو اس کی نظر میں مثالی ریاست کے تصور کو سمجھتے تھے۔ بد قسمتی سے آمریت نہ چل سکی۔ جمہوریت واپس آ گئی اور سقراط کو یونانی اسمبلی کے انتقام کا نشانہ بننا پڑا۔ اس دن سے مثالی ریاست کا نظریہ جبر اور آمریت سے منسلک چلا آ رہا ہے۔

دوسرا مثالی ریاست کا تصور کارل مارکس کے فلسفے سے اخذ کیا گیا۔ سوویت یونین اور اس کی طفیلی ریاستوں میں مثالی آمریت قائم ہوئی۔ اس کو محنت کشوں کی آمریت کہا گیا اور اس کا مقابلہ ان ریاستوں سے رکھا گیا' جہاں فسطائی قوم پرستی کے مثالی تصور کے تحت جرمنی' جاپان اور اٹلی میں شخصی آمریتیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ

سب سقراط کے تصور کی تقلید میں نظریاتی ریاستیں تھیں۔ عوام کے سامنے یوٹوپیا کا
وعدہ رکھا گیا اور سب جگہ آمریتیں قائم ہوئیں۔ تصور یہ تھا کہ جب مثالی ریاست
قائم ہو جائے گی تو اجتماعی تشکیل کے نتیجے میں انفرادی کردار خودبخود نکھر جائے گا۔ عدل
کی اخلاقیات میں نشوونما پانے والا فرد محفوظ ہوگا اور اس کے حقوق کے لیے علیحدہ
سے قانون سازی کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

تاریخ نے دیکھا کہ مثالی ریاست جبر پر قائم ہونے کے بعد نہ تو اجتماعی
اخلاقیات قائم کر سکی اور نہ ہی فرد کو ریاست کے جبر کے خلاف تحفظ دے سکی۔ ایک
ِن تصور کا سہارا لے کر افراد نے شخصی آمریت قائم کی، انتقال اقتدار کا کوئی طریقہ
مع نہ ہو سکا اور عدل کا دعویٰ کرنے والے معاشرے میں تشدد نے قانونی سند حاصل
کی۔ اجتماعی کردار صرف اطاعت پر استوار ہوا اور عدل کا ایسا میزان قائم ہوا، جس
میں انفرادی سوچ کو الحاد کا نام دے کر سزا کا حقدار قرار دیا گیا۔ نظریاتی ریاست میں
غیر معمولی انفرادیت کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ نہ تو
اجتماعی سطح پر باکردار ہو سکا اور نہ ہی اس نے اچھے کردار کو انحراف کی صورت میں
پیدا ہونے کا موقع فراہم کیا۔

پاکستان میں نظریاتی ریاست کے تصور سے بہت سی برائیوں نے جنم لیا۔ یہ
تصور معاشرے کے دوسرے اوصاف سے مل کر اثر انداز ہوا۔ جاگیرداری کے نظام
نے ایک ایسے فرد کو جنم دیا، جو انتہائی خود مختاری میں اپنی ذات کی تشکیل چاہتا تھا۔
پاکستان کے سارے شہر ماسوائے کراچی کے جاگیردارانہ تشخص سے باہر نہیں نکل پائے
تھے۔ پاکستانی معاشرے کا انسان شہری شعور حاصل کرنے سے پہلے ہی نظریے سے
متعارف ہو گیا۔ جمہوری قدریں، جن کا جھکاؤ عام شہری یا فرد کے حق میں ہوتا ہے،
نظریاتی قدروں کے مقابلے میں کمزور پڑ گئیں۔ نظریہ متبادل رائے کو برداشت نہیں
[illegible] اور آہستہ آہستہ آزادی اظہار کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاگیردارانہ
احول میں تشکیل پانے والی شخصیت کو نظریہ راس آیا۔ نظریاتی ریاستوں کی تاریخ نے
یا [illegible] حکمران نظریے کو نافذ تو کرتا ہے، لیکن اس کا اطلاق اپنے اوپر نہیں
[illegible] مطلق العنان حکمرانی کا موجب بنتا ہے اور مطلق

انسانی شخصیت نظریے کی حقیقی اطاعت کر کے اپنی خود مختاری کو زائل کرنا نہیں چاہتی۔

نظریاتی سوچ آج جمہوریت کا حصہ بن چکی ہے۔ فکری انفرادیت ختم ہو چکی ہے اور معاشرہ اس نقطے پر پہنچ چکا ہے جہاں فرد کا ذہن اسے اپنے ہی حقوق کے خلاف موقف اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نظریے کا علم الکلام عمل کی جگہ لے لیتا ہے اور معاشرے کے افراد اس علم الکلام پر عبور حاصل کر کے اپنے آپ کو عمل سے قطعی طور پر مستثنیٰ کر لیتے ہیں۔ ہم‌ راسنہ شخصیات کے لیے نظریہ بہترین مواقع فراہم کرتا ہے۔ آج کا پاکستانی حکمران مہم جوئی کا ایک طویل راستہ طے کر کے مسند اقتدار تک پہنچتا ہے۔ اس کے پاس علم الکلام کا ہتھیار ہوتا ہے' جس کے ذریعے وہ عوام سے ذاتی رابطہ قائم کرتا ہے۔ نظریہ فکری اہلیت کو غیر ضروری بنا دیتا ہے۔ سوویت یونین کے تمام حکمران فکری لحاظ سے تقلیدی تھے۔ عمل اور علم الکلام کے بعد سے ان کے کردار مسخ کر دیئے تھے۔ وہ دوہری سطح پر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے اور ان کے دور میں سوویت معاشرہ کرپشن کا شکار ہو گیا

پاکستان کا بحران نظریے کا بحران ہے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان کا بحران شخصیات کا بحران ہے۔ جن شخصیات کا اس کتاب میں ذکر ہے' ان کے کردار میں حیران کن یکسانیت اور تقلید ہے۔ تقریباً سب ہی پر کرپشن کے الزامات ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ تمام ایک دوسرے پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہیں۔ اس خصلت کے پیچھے نفسیاتی استثنیٰ سازی کا خفیہ ہاتھ ہے۔ مہم جو جب اقتدار میں آتا ہے تو جلد ہی نظریاتی علم الکلام اسے ذاتی پارسائی کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کرپشن سے مستثنیٰ قرار دے لیتا ہے اور جو کرپشن کرتا ہے' اس کو نظریاتی سیاست کی تاویلوں سے جائز قرار دے لیتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے اسے جمہوری اختلاف کو شدید کر کے دشمنی کے نقطے تک لانا ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیاست اسی وجہ سے قطبین میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر قطب دوسرے کو نظریاتی طور پر ریاست کے وجود کے لیے خطرناک ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ رقیب کی کرپشن تو کرپشن تصور ہوتی ہے' لیکن اپنی کرپشن سیاست کے لیے موافق قوتوں کو ابھارنے کا عمل گردانا جاتا ہے۔ حکمرانیت کی نوعیت جاگیردارانہ

ہوتی ہے' کیونکہ ریاستی قانون دراصل حکمران کے لیے معطل رہتا ہے۔

جاگیردارانہ شخصیت کی جو وضاحت پاکستان میں کی جاتی ہے' اس کی بنیاد زمینداری کو بنایا جاتا ہے' حالانکہ حکمران شخصیات کا تجزیہ اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ مطلق العنانیت دراصل جاگیردارانہ شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ جو فرق دیہی علاقے اور شہری علاقے سے ابھرنے والے سیاست دانوں میں نظر آتا ہے' وہ سطحی ہے۔ شہری سیاست دان نظریاتی سیاست کرتا ہے اور علماء کی تکریم کرتا ہے۔ عموماً وہ کسی عالم دین کو اقتصادی تحفظ دے کر نظریئے اور اپنے درمیان بعد کو ختم کرتا ہے۔ لیکن اس کی حکمرانیت کا قرینہ جاگیردارانہ حکمرانیت کے قرینے سے مختلف نہیں ہوتا۔ پاکستان میں یہ رجحان بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جاگیردار حکمرانوں نے شہری سیاست دانوں کے طریقہ واردات کی شعوری طور پر نقالی کی' تاکہ ان کی کرپشن اتنی ہی موثر اور بھرپور ہو۔ انھوں نے سرکاری نوکرشاہی کو اس نقالی کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ حکمران چاہے جاگیردار ہو یا شہری' وہ ایک ہی قسم کے سرکاری افسروں کو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ سب سے زیادہ معنی خیز دونوں قسم کے حکمرانوں کا یہ بیان ہے "ہمیں وہ بیوروکریٹ چاہیے جو ضوابط کا حوالہ دینے کی بجائے فوری طور پر تعمیل کرے اور نتائج سامنے لائے"۔

ہر نظریاتی ریاست میں خفیہ اداروں کا کردار مرکزی ہوتا ہے۔ شاید ان اداروں کی شخصیات اس تناسب سے اس کتاب میں شامل نہیں کی جا سکیں' جو کہ واقعاتی لحاظ سے صحیح تھا۔ یہی بات علماء کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ دو یا تین مذہبی شخصیات تو بلا خوف و خطر شامل کی جا سکتی تھیں کہ ان پر خود علماء کا اجماع ہے۔ اسی طرح عدلیہ کے شعبے سے بھی چند شخصیات شامل کی جا سکتی ہیں۔ صحافی حضرات شامل کی گئی تعداد سے کہیں زیادہ ایسے ہیں' جن کا شہرہ شروع ہی سے رہا ہے۔ یہاں بھی نظریئے کے استثنائی پہلو نے شخصیات کو ایک مخصوص طریقے سے ابھرنے کا موقع دیا۔ ان شخصیات کے بارے میں ان اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر ایک بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ افراد طاقتور تھے یا ہیں۔ طاقتور افراد جمہوریت کے تحت قابو میں رہتے ہیں' لیکن نظریاتی ماحول میں انھیں اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کرنے کے

مواقع ملتے ہیں۔

پاکستانی شہری اس ماحول میں ایک خاص قسم کے کردار کا مالک بن چکا ہے۔ وہ مغرب کے ترقی یافتہ معاشروں کے شہریوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ اس میں انفرادیت کا احساس جمہوری نہیں ہوتا' بلکہ حیوانی ہوتا ہے۔ جبلت پر قابو پانا اور دوسرے کے حق میں مقابلے کے اصولوں کا تابع ہونا صرف جمہوری معاشرے کے تربیت یافتہ شہریوں کا خاصہ ہے۔ جنگل کے قانون کی طرح پاکستانی معاشرے کے ان کے قوانین بھی طاقت سے وابستہ ہیں۔ اگر حکمران طاقت کے سہارے اقتدار پر قائم ہے تو عام شہری جبلت کی سطح پر جینے پر مجبور ہے۔ ملک معراج خالد جب فرماتے ہیں کہ ساری قوم ہی کرپٹ ہے تو وہ اس فرق کا ادراک نہیں کرتے۔ جبلت مجبور کی صفت ہے کہ شعور تکلیف دہ ہو چکا ہے۔

پاکستانی ریاست نظریے کے جبر اور مہم جو طاقتور افراد کے ہاتھوں ختم ہوئی ہے۔ اس میں بسنے والوں نے اپنی انفرادی طاقت سے جمہوری اداروں کو تسخیر کر لیا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہ خاتمہ مختلف عطرات کے تحت ہوتا' لیکن آج کی دنیا میں بین الاقوامی قانون اس قدر مضبوط ہے کہ ریاست ختم ہو کر بھی قائم رہتی ہے۔ آج پاکستان میں ادارے مردہ ہو چکے ہیں۔ صرف سیاست دان زندہ ہیں۔ انھیں ریاست کی موت کا کافی حد تک اندازہ ہے' اس لیے انھوں نے اپنی کرپشن سے جمع کی ہوئی دولت بیرون ملک منتقل کر رکھی ہے۔ یہاں بھی الزام لگانے والے اور ملزم کے درمیان عمل اور کردار کی یکسانیت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قانون احتساب کے عدم توازن پر دنیا حیران ہے' وہاں پاکستانی معاشرے کو اس کا احساس بھی نہیں۔ دراصل پاکستان میں طاقتور فرد کا کردار تعمیر کی حد سے تجاوز کر چکا ہے۔

خالد احمد

آصف علی زرداری

آصف علی زرداری کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں اتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اب "زرداری" ایک فرد کا نام نہیں رہا بلکہ ایک "رویہ" اور "عمل" محسوس ہوتا ہے۔ لفظ زرداری اب تک ایک ضرب المثل بن چکا ہے۔ اسی طرح اگر معروضی طور پر سوچا جائے تو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہمارے مقتدر اور "دائمی مقتدر" حلقوں کو اس نوعیت کے ایک "کردار" کی ضرورت تھی۔ جس کے سر وہ تمام الزامات دھرے جا سکتے جو پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت کے خلاف جواز مہیا کرتے اور دوسرے عوامی سطح پر "کارگر" ثابت ہوتے۔ جیسے اب ہمارے اکثر سیاسی دانشور "زرداری ثانی" کے طور پر وزیراعظم میاں نواز شریف کے بھائی اور موجودہ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کا نام لیتے ہیں۔ ان دانشوروں کے پاس اس لقب کا جواز یہ ہے کہ میاں نواز شریف کی پہلی حکومت میں جو "کارہائے نمایاں" میاں شہباز شریف نے سرانجام دیئے' ان میں اور جناب آصف علی زرداری کے کارناموں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ فرق تو اصل میں ذرائع ابلاغ کے رویے اور رجحان کا ہے جس نے ایک زرداری کو تو اتنا رسوا کیا کہ ضرب المثال بنا دیا اور دوسرے "زرداری" کے لیے نرم گوشہ رکھا۔

۹۶ء میں صدر فاروق لغاری کے ہاتھوں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد قائم ہونے والی نگران حکومت نے اپنے کام کی شروعات احتسابی نعروں

سے کی۔ نگران وزیراعظم جو ذرائع ابلاغ کی بنائی ہوئی "شرافت" کی بناء پر جیتے آ رہے تھے بے نظیر کی سابقہ حکومت کے خلاف لگائے جانے والے احتسابی نعروں کی غذا استعمال کرتے رہے۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ خواہ وہ نعت خوانی کی محفل میں بیٹھے ہوتے یا اپنے آبائی علاقے بری کے کسی چودھری کی حویلی میں چند درجن دیہاتیوں کے خطاب کر رہے ہوتے' احتساب کی جان نہ چھوڑتے۔ مثال کے طور پر اگر ملک معراج خالد کے "احتسابی بیانات" کو جو قومی اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے' مرتب کیا جائے تو "فیروز اللغات" جتنی ضخامت کی ایک کتاب وجود میں آ سکتی ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نگران وزیراعظم نے ان بیانات میں جو زبان اور محاورے استعمال کیے' ان میں گرائمر کے لحاظ سے اتنا تنوع ہے کہ یہ کتاب برصغیر میں شائع ہونے والی کتب کی تاریخ میں ایک بلند مرتبہ حاصل کرے گی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نگرانوں کی فوج بے نظیر حکومت اور بے نظیر حکومت کی بدعنوانیوں کی "علامت" آصف علی زرداری کے بارے میں ابھی تک کچھ بھی ثابت نہ کر سکی۔

فروری ۹۷ء میں قائم ہونے والی پیپلز پارٹی مخالف نواز شریف حکومت ابھی تک صرف اس حد تک "کامیابی" حاصل کر سکی ہے کہ آصف علی زرداری اور اس کے "کاروباری دوستوں" کی بدعنوانیوں کے بارے میں ٹیلی ویژن پر دستاویزی فلمیں دکھانے لگی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسا کہ سابق صدر غلام اسحاق کے زرداری مخالف ریفرنسوں کے ساتھ ہوا تھا نواز شریف حکومت کے بلا وقت خاتمے یا پھر خوش قسمتی سے مدت پوری کرنے کے بعد آصف زرداری آزاد ہوگا اور دوبارہ اپنی "روایتی زندگی" گزارنا شروع کر دے گا۔

اگر بے نظیر کے آخری دور حکومت (۹۳ـ۹۶ء) کا معروضی جائزہ لیا جائے تو مسٹر آصف علی زرداری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو شاید نہیں کہا جا سکتا کہ آصف علی زرداری تمام حکومتی سطح کی اور انفرادی سطح کی بدعنوانیوں کے پیچھے سرگرم رہا لیکن اس دور کی جن بدعنوانیوں کو متفقہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے' اگر ان کے اسناد کر ساتھ ہی ایمانداری کے ساتھ زرداری کے بارے میں تحقیقاتی عمل جاری

رہے تو زرداری کو مجرم ثابت کرنا قطعاً مشکل نظر نہیں آتا۔ لیکن ابھی تک ایسے کوئی شواہد نظر نہیں آتے۔

اگر ایک لمحے کے لیے پیپلز پارٹی مخالف قوتوں کے موقف کو مستعبلاً بھی تسلیم کر لیا جائے تو بے نظیر حکومت کے وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیراللہ بابر کے بیان کو ہم کس طرح متعصب ثابت کر سکیں گے جو انہوں نے بے نظیر حکومت توڑے جانے کے تقریباً تین ماہ بعد دیا تھا اور جس میں جنرل موصوف نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ بے نظیر حکومت کے لیے زرداری صاحب پریشانی کا باعث تھے۔ راقم الحروف نے جب بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد اسلام آباد میں جنرل (ر) نصیراللہ بابر کا ایک طویل انٹرویو کیا تو اس انٹرویو میں جنرل صاحب نے واضح طور پر تسلیم کیا تھا کہ آصف علی زرداری اور پنجاب کے سابق سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان نے وسیع پیمانے پر کرپشن کی ہے بلکہ ملک مشتاق اعوان کے بارے میں تو جنرل نصیراللہ بابر نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ ملک مشتاق اعوان ایک سو روپیہ رشوت بھی نہیں چھوڑتے تھے دوسری طرف بے نظیر بھٹو نے جس "خوبصورتی" کے ساتھ اپنے ہی سیاسی ساتھیوں کے سوالات پر آصف علی زرداری کا دفاع کیا' اور اس لمحے تک کر رہی ہیں اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔

آصف علی زرداری کی شخصیت میں بنیادی طور پر دھونس اور بدعنوانی کا رچاؤ اس "نفاست" کے ساتھ ہوا ہے کہ اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آصف علی زرداری ایک بار جو کچھ طے کر لیتے پھر اس کو پورا کر کے چھوڑتے۔ اسلام آباد میں پولو گراؤنڈ کا معاملہ ہو یا وسیع پیمانے پر ہاؤسنگ کے کسی پراجیکٹ کا معاملہ ہو یا پھر پاکستانی معیشت کی اہم ترین اکائی "پاکستان سٹیل ملز" کی زندگی کا سوال ہو زرداری صاحب بدعنوانیوں کے شانہ بشانہ ملتے ہیں۔ ان کی نظر بہت تیزی کے ساتھ اپنے "کاروباری ساتھی" تلاش کرتی ہوئی بہت دور تک جا نکلتی ہے۔ اگر ان کی "نظر کرم" پڑ جائے تو پھر کوئی بھی چیز انہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ چاہے فوج جیسے نظم و ضبط والے ادارے کا کوئی اہم ترین رکن کیوں نہ ہو زرداری کا "شریک کار" ہو جاتا ہے اور بیرون ملک اپنے اثاثوں کو تیزی کے ساتھ بڑھانے لگتا ہے۔

نواز شریف حکومت کا قائم کردہ "احتساب سیل" ابھی تک اپنا سارا زور آصف علی زرداری اور اس کے دوستوں پر صرف کیے ہوئے ہے۔ احتساب سیل کے سربراہ سینیٹر سیف الرحمن جو کہ خود بھی بدعنوانیوں کے الزامات کی زد میں ہیں، آصف علی زرداری کا محاسبہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ آصف علی زرداری کا طریقہ کار یہ رہا کہ وہ مقدور بھر کوشش کرتے کہ کسی کرپشن میں ان کی ذات واضح طور پر سامنے نہ آئے اور وہ اپنے آپ کو زیادہ تر کمیشن وصول کرنے تک محدود رکھتے لیکن بدقسمتی سے وہ اتنی زیادہ شرح کے ساتھ کمیشن وصول کرتے کہ یہ بات ہضم نہ ہوتی اور طشت از بام ہو جاتی۔ اگرچہ بے نظیر کی پہلی حکومت کے دوران بھی مسٹر آصف علی زرداری کا نام بہت بدنام ہوا اور انہیں مسٹر ٹین پرسنٹ (جناب دس فیصد) کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جب بے نظیر کی دوسری حکومت آئی اور ذرائع ابلاغ میں "کرپشن کرپشن" کا غوغا بلند ہوا تو پاکستان میں ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ آصف علی زرداری ایک بار پھر "سرگرم" ہو گئے ہیں۔

۱۹۹۳ء کے بعد بننے والی حکومت میں بے نظیر بھٹو کو فوجی حلقوں اور صدر فاروق احمد لغاری کی طرف سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے شوہر آصف علی زرداری کو کوئی اہم ذمہ داری نہ سونپیں کیونکہ ان کا سابقہ ریکارڈ بہت خراب ہے اور اس صورت میں اگر انہیں وزیر بنایا گیا یا کوئی اہم کام سونپا گیا تو پھر اپوزیشن اور ذرائع ابلاغ شروع دن سے ہی حکومت پر زرداری کے حوالے سے تنقید شروع کر دیں گے اور حکومت خصوصاً وزیراعظم کو اس مہم کا دفاع کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ذرائع کے مطابق بے نظیر نے مجبوراً حامی بھر لی کہ وہ آصف علی زرداری کو کوئی اہم عہدہ نہیں دیں گی۔

شروع کے دنوں میں آصف علی زرداری کو اگرچہ وزارت وغیرہ سے باز رکھا گیا لیکن بے نظیر نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ پیپلز پارٹی اور اس کی اتحادی جماعتوں کے ناراض ارکان اسمبلی کی شکایات کا ازالہ کریں اور حتی المقدور کوشش کریں کہ اسمبلی طور پر حکومتی ارکان اسمبلی کی تعداد کم نہ ہونے پائے۔ اسی مقصد کے تحت وزیراعظم نے مرکز میں لوکل گورنمنٹ کی باقاعدہ ذمہ داری کسی بھی رکن اسمبلی

کو نہ سوجھی اور غیر اعلانیہ طور پر آصف علی زرداری کو کہا گیا کہ وہ "پیپلز ورکس پروگرام" کے تحت حکومتی ارکان اسمبلی کو ترقیاتی فنڈز مہیا کریں اور کوشش کریں کہ کسی حکومتی رکن یا حکومت کے اتحادی رکن اسمبلی کے ساتھ "زیادتی" نہ ہونے پائے۔ آصف علی زرداری مس ناہید خان کے ساتھ مل کر ترقیاتی فنڈز کے اربوں روپے سے ارکان اسمبلی کو "خوش" کرتے رہے اور خود بھی کروڑوں روپے کا کمیشن وصول کرتے۔ آصف علی زرداری پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد کے ایک حصے میں باقاعدہ اپنا الگ "سیکرٹریٹ" چلانے لگے اور ارکان اسمبلی ان کی ذات سے فیض یاب ہونے لگے۔

وزیراعظم نے آصف علی زرداری کو جس طرح لوکل گورنمنٹ کا غیر علانیہ چارج عطا کیا تھا' اسی طرح انہیں ریلوے کا بھی "انچارج" بنا دیا گیا۔ ریلوے کے معاملات جیسے ہی زرداری کے ہاتھ لگے انہوں نے مس ناہید خان کی "معاونت" سے کروڑوں روپے بنانے شروع کر دیئے۔ ریلوے اسٹیشنوں کی کینٹین سے لے کر ریلوے کے بڑے بڑے ٹھیکوں تک میں آصف علی زرداری کا "عمل دخل" شروع ہو گیا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آصف علی زرداری کی کسی ادارے کے معاملات میں "شمولیت" کے بعد جو اثرات ظاہر ہوتے انہیں بیان کرتے ہوئے صورت حال کو زیادہ واضح کرنے کے لیے لفظ "زرداری" کا استعمال کیا جانے لگا۔ مثال کے طور پر حکومت کسی نئے ٹیکس کا اعلان کرتی تو اسے "زرداری ٹیکس" کہا جاتا۔ رفتہ رفتہ صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ اشیائے صرف کی اشیاء میں منڈی کے اصول کے مطابق ہونے والا اضافہ بھی زرداری کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔

اس کے بعد آصف علی زرداری نے اپنا "دائرہ کار" دوسرے صوبوں میں بھی پھیلانا شروع کر دیا۔ بلوچستان' سرحد اور پنجاب میں زرداری براہ راست اثر انداز ہونے لگے۔ مرکزی سطح پر صوبوں میں جہاں بھی ارکان اسمبلی پر اپوزیشن جماعتوں کا دباؤ بڑھتا آصف علی زرداری وہاں پہنچ جاتے اور اپنے ارکان اسمبلی کو مراعات سے نواز دیتے۔ اس کی واضح مثال پنجاب میں وزیر اعلیٰ منظور وٹو کی وزارت اعلیٰ سے

برطرفی کے موقع پر زرداری نے اپنی ساری توجہ پنجاب پر مرکوز کر دی اور پیپلز پارٹی' مسلم لیگ (ج) اور آزاد ارکان اسمبلی کو سردار عارف نکئی کی طرف مائل کرنے کے لیے زرداری نے بے تحاشہ دولت بانٹ دی۔ زرداری ایک بار پھر اس وقت متحرک ہوگئے جب سردار عارف نکئی کی کابینہ کی تشکیل کا مرحلہ آیا۔ زرداری مشتاق اعوان اور ناہید خان باقاعدہ گورنر ہاؤس میں ڈیرے لگا لیے اور ناراض ارکان اسمبلی کو منانے کے لیے سرکاری خزانے سے بھاری رقوم ادا کی گئیں۔ زرداری پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے بعض ارکان اسمبلی سے کروڑوں روپے وصول کر کے انھیں وزارتیں دیں۔

آصف علی زرداری نے باقاعدہ اپنے مزاج کے لوگوں کا ایک گروپ تشکیل دیا۔ اس گروپ کے ممبران وفاقی کابینہ کے اکثر ممبران سے زیادہ بااثر اور طاقتور تصور کیے جاتے تھے۔ واضح رہے کہ سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمیٰ سنبھالتے ہی علیٰ عہدوں پر فائز افسران کو حکم دیا تھا کہ ان کے شوہر نامدار آصف زرداری اور بعدازیں سے رکن قومی اسمبلی ذوالفقار اے مرزا کی جانب سے جاری ہونے والے "زبانی احکامات" کو تمام معاملات پر ترجیح دی جائے اور انھیں بغیر کسی تاخیر کے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

آصف علی زرداری جب حکومت کے تمام معاملات میں دخیل ہوگئے تو انھوں نے سب سے پہلے بڑے بڑے اداروں میں اپنے "ہم خیال" دوستوں کی تقرریوں کا سلسلہ شروع کیا۔ زرداری نے اس کی ابتداء ترقیاتی مالیاتی اداروں سے کی۔ اس دوران وزارت خزانہ محض ایک بے بس اور خاموش تماشائی کا سا کردار ادا کرتی رہی۔ سابق وزیر خزانہ مخدوم شہاب الدین اکثر نجی محفلوں میں اس بات کا واشگاف الفاظ میں ذکر کرتے رہے کہ وہ اگرچہ وفاقی وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں لیکن انھیں یونس ڈالیا کی تقرری بطور صدر حبیب بینک' ایم بی عباسی کی تعیناتی بطور صدر نیشنل بینک آف پاکستان' اسداللہ شیخ کی نامزدگی بطور نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ' منور چودھری کا چناؤ بطور چیئرمین این ڈی ایف سی (NDFC) خالد اقبال کی تعیناتی بی ای ایل اور بعد ازاں چیئرمین این ڈی ایف سی (NDFC) سے متعلق انھیں مطلع

کرنا بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔

مخدوم شہاب الدین اور سابق مشیر برائے وزیراعظم وی اے جعفری' نے علیحدہ علیحدہ اس امر کی تصدیق کی کہ مذکورہ بالا اعلیٰ ترین عہدوں پر تعیناتیاں صرف آصف علی زرداری کی طرف سے کی گئیں اور یہ تمام تقرریاں سیکرٹری / اسسٹنٹ نے آصف علی زرداری کے "زبانی احکامات" کے تحت کیں۔ اس کے علاوہ آصف علی زرداری نے عثمان فاروقی کی تعیناتی بطور چیئرمین پاکستان اسٹیل ملز' ایڈمرل (ر) اکبر ایچ خان کی تعیناتی بطور کراچی پورٹ ٹرسٹ (KPT) منیر باری کی بطور سربراہ ٹیکسٹائل کوٹہ مینجمنٹ و ڈویلپمنٹ اور ظہیر خان بطور چیئرمین سٹیٹ لائف کے احکامات بھی دیئے تھے۔ اس کے علاوہ سابق وزیراعظم کے شوہر آصف علی زرداری نے مسعود شریف کو انٹیلی جنس بیورو (IB) کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا۔ اس فیصلے نے ایوان صدر اور دوسرے طاقتور حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی کیونکہ مسعود شریف براہ راست آصف علی زرداری کو رپورٹ پیش کرتا تھا۔

ان ادوار میں کہ جہاں زرداری کے چہیتوں نے چارج سنبھالے' بہت جلد ناقص نظم و ضبط اور بے مہار کرپشن کے قصے زبان زد عام ہو گئے۔ پاکستان سٹیل' کے پی ٹی' آر ای سی پی' بینکوں اور ڈی ایف آئی جیسے اداروں میں کرپشن کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے تحت لاکھوں کروڑوں روپے کے جعلی سودے دنوں میں ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ لیکن یہ بدنصیب ادارے وزیراعظم ہاؤس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔

بدین سے منتخب ہونے والا رکن قومی اسمبلی ذوالفقار مرزا' آصف زرداری کے بعد حکومتی معاملات میں سب سے زیادہ موثر اور طاقتور تصور ہوتے تھے۔ یہ موصوف پینگرو اور مرزا شوگر ملز کے معاملات کی جانچ پڑتال پر متعین تھے۔ جہاں ان کے اپنے خاندانی حصص تو کم تعداد میں تھے لیکن زیادہ تر حصص ان کے آقا اور دوست آصف زرداری کے تھے۔ آر ای سی پی اور ٹی سی پی میں بعض سرکاری ذرائع کے مطابق روزمرہ کی استعمال کی اشیاء کی خرید و فروخت کے ضمن میں ذوالفقار مرزا کے کہے کے سامنے بے معنی تصور کیا جاتا تھا۔ اس امر کے شواہد بھی موجود ہیں کہ

اس نے آر سی پی اور ٹی سی پی کے سودوں کے ضمن میں غیر ملکی پارٹیوں سے مذاکرات بھی کیے۔ مرزا کو کے پی ٹی کے معاملات میں خصوصاً زمین کے لین دین کے سودوں میں انتہائی موثر خیال کیا جاتا تھا۔ یہ حضرات آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے معاملات میں بھی خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہے۔

جب کراچی میں دو اسٹیٹ ڈویلپرز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی کمرشل لینڈ جس کی کل مالیت کم و بیش ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ تھی سولہ کروڑ میں فروخت کردیں تو اس دوران کراچی کے ایک اور کامیاب اسٹیٹ ڈیلر اقبال میمن کا نام منظر عام پر آیا۔ ان دو مجبور فروخت کنندگان کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے اعلیٰ حکام کو اس امر سے بھی آگاہ کیا کہ کس طرح اسلام آباد کی ایک وی آئی پی شخصیت نے جو اقبال میمن کو اپنے فرنٹ مین کے طور پر استعمال کر رہی تھی انہیں زمین فروخت کرنے پر مجبور کیا۔ اقبال میمن کا نام اسلام آباد میں بھی ترقیاتی منصوبوں کے سودوں کے پس منظر میں سامنے آیا جہاں سی ڈی اے کے اعلیٰ حکام' اقبال میمن کی "دلچسپی" سے خوب اچھی طرح آگاہ تھے۔

بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں وزیر مواصلات کی عدم موجودگی کے سبب جاوید پاشا' آصف زرداری کا دوست' اس وزارت میں واحد کرتا دھرتا تھا۔ پی پی پی کے پورے دور اقتدار میں وزارت مواصلات کا اسلام آباد میں واقع وی آئی پی گیسٹ ہاؤس جاوید پاشا کی آماجگاہ بنا رہا۔ وزارت مواصلات جس نے بے نظیر کے سابقہ دور حکومت میں اسے پیجر سروس کا اجازت نامہ فراہم کر رکھا تھا' اس بار ایم ڈی ایس سروس کا لائسنس "بخشا" پیش کیا۔ اس سروس کے تحت اسے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن ایک پرائیویٹ کیبل ٹی وی چینل اور سیلولر فون سروس کے لائسنس جاری کیے گئے۔

ستار کیریو' جو نواب شاہ کے قریب سکرنڈ شوگر ملز کے معاملات کا نگران تھا' اندرون سندھ میں غیر کاشت شدہ زمین کے کئی حصے اپنے نام الاٹ کروا چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ تھی انصاف کی انصار شوگر ملز کے مالیاتی معاملات میں بھی ملوث تھا۔ مختلف بینکوں اور نج کاری کمیشن نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ستار کیریو ان معاملات میں دخل اندازی کرتا تھا۔ کرپٹ افسران کی اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی

کے حوالے سے بھی ستار کیریو کا نام بہت اثر و رسوخ کا حامل جانا جاتا تھا۔

زرداری گروپ میں کراچی کی آغا سپر مارکیٹ کا فرید دیرینی بھی شامل تھا جس نے سول ایوی ایشن اتھارٹی اور سندھ پولیس کی طرف سے آرمرڈ سائل گاڑیوں کی خرید و فروخت کے معاملے میں غیر ضروری حد تک دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ نوید ملک بھی ایوی ایشن کے معاملات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ پی آئی اے کی جانب سے سنگاپور ایئرلائن سے پرانے بوئنگ طیاروں کی خریداری کی خواہش کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ نوید ملک لاہور ایئرپورٹ پر ایک ٹرمیل کی تعمیر میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

شون گروپ کے ناصر حسین بھی آصف زرداری کے ذاتی دوستوں میں سے تھا۔ برسر اقتدار آتے ہی بے نظیر حکومت نے شون گروپ کو ایک بینک کے قیام کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ شون گروپ نے دوسرے ایکسپورٹروں کے مقابلہ میں گارمنٹس کی فروخت پر بھی ایک محفوظ گرفت قائم کرلی تھی۔

ایم سی بی کا صدر حسین لوائی بھی ان دونوں میاں بیوی کا ایک اہم مشیر رہا۔ جب دوبئی میں مقیم اس کے ایک پاکستانی دوست عبدالرزاق کو پاکستان میں سونا درآمد کرنے کی اجازت دی گئی تو بہت کم لوگوں کو اعتراض کا موقع مل سکا۔ میاں محمد منشاء جو ایم سی بی کے مفاد کو نقصان پہنچاتا رہا' متضاد سودے بازیوں کے سبب برلن کی ایک تنظیم ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے بے نظیر انتظامیہ کے دوسرے تین سالہ اقتدار کے دوران پاکستان کو دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر کرپٹ ملک گردانا۔ اس برس ستمبر میں ورلڈ بینک سے ملحق واشنگٹن میں ایک تنظیم نے پاکستان کو کرپشن کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر قرار دیا۔

کراچی میں ایک شوگر مل کا فنانس منیجر مختلف کارپوریشنوں اور تنظیموں جو کہ حکومت کے تحت سرگرم عمل تھیں' سے آصف زرداری کے لیے ہر ماہ لاکھوں روپے اکٹھے کرتا تھا۔ اس طرح پاکستان سٹیل مل کے دو افسران نے خفیہ طور پر جو گفتگو ریکارڈ کی' اس کے مطابق جعلی سودوں کی آڑ میں مرد اول کے نام پر عثمان فاروقی کروڑوں اکٹھے کرکے دوبئی کے ایک بینک میں منتقل کرنے میں مشغول تھے۔ ۲ جولائی

کو سابق وزیراعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ نے ایک صفحے پر مشتمل ایک درخواست کو قبول کرتے ہوئے کراچی کی ایک خاتون گلنار بانو کو ۲۱ لاکھ ۳۶ ہزار مربع گز زمین ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں ایک کروڑ ۰۷ لاکھ کے عوض منتقل کر دی۔ جب کہ کھلی مارکیٹ میں اس کی قیمت ۸۰ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ سابق وزیراعلیٰ سندھ کے ایک ذاتی دوست نے بتایا کہ "شاہ صاحب کو اس الاٹمنٹ کے احکامات براہ راست آصف علی زرداری سے موصول ہوئے تھے۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۴ء بروز جمعرات کو احمد خان اور پانچ دیگر حضرات کو سیکرٹری لینڈ یوٹیلائزیشن حکومت سندھ' رمیش ایم پرلیش کا ایک حکم نامہ موصول ہوا جس کے تحت انہیں ڈسٹرکٹ ملیر میں ۱۰ لاکھ گز زمین ایک کروڑ روپے کے عوض الاٹ کی جا رہی تھی۔ جب کہ اس کی اصل قیمت ۴۵ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس قسم کی ایک اور الاٹمنٹ میں چار لاکھ مربع گز پر مشتمل کورنگی کے صنعتی علاقے میں واقع زمین محض ۲۰۰۰۰ روپے کے عوض الاٹ کی گئی حالانکہ کھلی نیلامی میں یہی زمین ۲۰ کروڑ روپے سے زائد مالیت میں نکل سکتی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن کی سفارش پر صائمہ بلڈرز کو آئی آئی چندریگر روڈ پر ۱۸ منزلہ ایک کمرشل ٹاور کی تعمیر کی اجازت مثالی معجزہ تصور کیا جاتا ہے۔ شہر کے پائے کے سٹیٹ بروکرز کے مطابق اس پراجیکٹ کی تعمیر کے لیے کم از کم ۱۰ کروڑ روپے کا خرچ ضروری تھا۔ اس قسم کی چھوٹ کلیکس بلڈرز اور چند دیگر کنسٹرکشن کمپنیوں کو بھی عنایت کی گئی تھی۔ جن دنوں سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو ملک سے کلاشنکوف کلچر کے خاتمے کا زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں' ان کے شوہر آصف علی زرداری نے ۴۰۰ مہلک ہتھیاروں کے لائسنس حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں وزیر داخلہ نصیراللہ بابر کی جانب سے ایک ہی وقت میں ۳ قسمیں اسلحہ کے جاری ہونے والے لائسنسوں میں جی تھری رائفل بھی موجود تھی۔ جو افواج پاکستان میں سٹینڈرڈ ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس کے علاوہ ایم پی فائیو' تو پنک رائفل' سولہ اے ٹو اور پی پی رنفلز وغیرہ بھی شامل تھیں۔

ادھر آصف زرداری درجنوں میں اسلحہ کے لائسنس اپنے نام پر حاصل کرنے میں مشغول تھے تو ادھر ان کی اہلیہ نے حکم نامہ جاری فرمایا کہ ایک عدد ڈیوٹی فری

مرسڈیز ۶۰۰ I فوری طور پر درآمد کی جائے۔ اگرچہ اس میں ڈیوٹی فری کاڑی پر بھی محترمہ کم از کم ۲ فیصد سیلز ٹیکس اور ایک فیصد فلڈ ریلیف سرچارج ادا کرنے کی پھر بھی پابند تھی مگر سی بی آر کو احکامات صادر کیے گئے ان چارجز کو بھی ختم کر دیا جائے۔ یہ ڈیوٹی فری مرسڈیز محترمہ کو ۱۰۰۰۰۰ امریکی ڈالر میں پڑی تھی جو کہ ایک برس میں صرف ۳۲۲۸۰ روپے انکم ٹیکس ادا کرتی ہیں۔

کرپشن کے ریکارڈ اس وقت ایک مرتبہ پھر انتہا کو پہنچ گئے جب بے نظیر نے ایک فرانسیسی کمپنی میں مبلغ ۹۵۰ ملین ڈالر کے عوض تین آگوشاتان بی آبدوزیں خریدیں۔ عوام اور اپوزیشن کے پرزور مطالبے کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس معاملے کو پارلیمنٹ میں بحث کی لیے پیش نہ کیا۔ ان تین آبدوزوں کے لیے پاکستان کو جو دنیا بھر میں غریب ممالک کی فہرست میں ایک سو اٹھائیسویں نمبر پر ہے' چھ ارب روپے فرانسیسی کمپنی کو ادا کرنے پڑے۔ اس سمجھوتے پر دستخط کرنے کی جلد میں بے نظیر بھٹو نے ممتاز ماہرین اقتصادیات کی اس تجویز کو بھی پس پشت ڈال دیا جس کے مطابق اس مجموعی رقم سے حکومت پاکستان ایک برس میں ۲۰۰۰ سکول تعمیر کر سکتی تھی' ۲۰۰۰۰۰ اساتذہ کو روزگار مہیا کیا جا سکتا تھا اور ۲ ملین بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا سکتا تھا اور اگر حکومت پاکستان اس رقم کو صحت کے شعبے میں خرچ کرتی تو ۱۰۰۰۰ بستروں پر مشتمل ۱۰۰ ہسپتالوں کو تعمیر کیا جا سکتا تھا جو تمام ضروری سامان سے لیس ہوتے اور جہاں لاکھوں غریب انسانوں کو مفت علاج معالجے کی سہولیات فراہم کی جا سکتی تھیں۔ ان تین آبدوزوں کی خریداری کے ضمن میں پاکستان اور فرنچ حکام میں معاہدے پر دستخط کے بعد ہی اندرون اور بیرون ملک اخبارات میں پاکستان کے شاہی جوڑے کی جانب سے فرانس میں جائیداد کی خریداری سے متعلق خبریں شائع ہوئی تھیں۔ کمیشن کی وصولی نے اس وقت ایک بار پھر سر اٹھایا جب جلدی سے تبدیل کی جانے والی سنٹرل بورڈ آف ریونیو کی ایک ٹیم نے اپنے سے پہلے تعینات افراد کے مدلل اعتراضات کو رد کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والی ایس جی ایس اور کو ٹیکنالوجی نامی کمپنیوں کو پری شپ منٹ انسپکشن کے حقوق تفویض کر دیے۔ ان حقوق کے تفویض کیے جانے کے دو سال کے اندر انتہائی مشکوک حالات میں حکومت پاکستان

نے ان کمپنیوں کو ان کی خدمات کے عوض ۳۵۰ کروڑ روپے ادا کیے حالانکہ ان کی تمام تر کارکردگی کے باوجود پاکستان کے ریونیو میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ ایک اعلیٰ کسٹم آفیسر نے بتایا کہ ان کمپنیوں کو حقوق تفویض کیے جانے کے ضمن میں اجلاس وزیراعظم ہاؤس میں منعقد ہوا جس کی صدارت آصف زرداری نے کی۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں ایک غیر شفاف سودے نے کرپشن کے الزامات کو مزید تقویت بخشی جب مملکت کے تحت چلنے والی رائس ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان نے ۵۰۰۰۰۰ ٹن چاول جو کل ملکی پیداوار کا نصف بنتا ہے' کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر لالہ جی کے ذریعے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا جو اس سے قبل اسی کارپوریشن کی جانب سے بلیک لسٹ قرار دیا جا چکا تھا۔ آر ای سی پی نے نہ تو کوئی ٹینڈر طلب کیا اور نہ ہی آدھا ملین ٹن چاولوں کی فروخت کی عوام کو ہوا تک لگنے دی۔ گفت و شنید کے نتیجے میں آر ای سی پی ۲۱۸ امریکی ڈالر فی ٹن کے عوض فروخت پر راضی ہوگئی جبکہ عالمی منڈی میں یہ قیمت ۲۶۵ امریکی ڈالر تھی۔ آر ای سی پی کے ایک ذمہ دار افسر کے مطابق اس تمامتر منصوبے کا کرتا دھرتا حکومت کی جانب سے ایک طویل مدت سے ریٹائرڈ شخص چیئرمین آر ای سی پی تھا۔ اگرچہ پی پی پی گورنمنٹ نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کا مہران بینک لمیٹڈ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس بینک کے اہم عہدوں پر فائز افراد کو پی پی پی حکومت کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ صفدر عباس زیدی جو حبیب بینک لمیٹڈ میں یونس حبیب کا سرپرست تھا اور اس کے ساتھ گہرے کاروباری مراسم رکھے ہوئے تھا' کو ایک وزیر کے برابر مقام دیتے ہوئے انوسٹمنٹ بورڈ کا سربراہ مقرر کیا۔ آصف جمشید شاہ' حبیب بینک اور مہران بینک دونوں میں یونس کا قریبی دوست تھا' کو بینک آف پنجاب کا صدر مقرر کیا گیا۔ چودھری احسان' مہران بینک میں یونس حبیب کے مشیر کو پاکستان بینکنگ کونسل کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ حکومت نے مختلف رپورٹوں کے باوجود کہ اسد اللہ شیخ این آئی ٹی میں کئی قابل اعتراض معاملات میں ملوث تھے' سے صرف نظر کیا۔ تاہم اخباری اطلاعات یہ ہے کہ ادارے کے چھ ملین حصص کو ان کی بریک اپ ویلیو سے بھی ایک تہائی کم قیمت پر فروخت کیا اور سوئی سادورن گیس کے ۲۵ لاکھ کے حصص کو بھی انتہائی کم قیمت پر

فروخت کیا تو اکنامک کو آرڈی نیشن کمیٹی نے تحقیقات کا حکم دیا مگر بعد ازاں اسے بھی دبا لیا گیا۔

عین اس وقت جب مقتول وزیراعظم بے نظیر بھٹو بینکوں کے نادہندگان کے خلاف سخت کارروائی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں' ایف آئی اے کو خصوصی طور پر ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ کراچی کے توکل گروپ کے خلاف ایف آئی آر درج نہ کرے حالانکہ یہ گروپ مبینہ طور پر ملک کے بڑے بینکوں سے ۲۵۰ کروڑ روپے کا فراڈ کر چکا تھا۔ توکل گروپ نے جاوید پاشا (آصف زرداری کے خاص دوست) کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ ایف آئی اے اس کے خلاف نیشنل بینک آف پاکستان اور فیڈرل اینٹی کرپشن کی جانب سے موصول ہونے والی شکایات پر کسی قسم کی کارروائی عمل میں نہ لائے گی لیکن اس کے باوجود اگر قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے بھرپور دباؤ پر ستمبر میں توکلوں کو گرفتار کرنا ہی پڑا تو بھی اسلام آباد کی ایک وی آئی پی شخصیت نے ہوم سیکرٹری پنجاب کو ہدایات جاری کیں کہ انہیں جیل میں "اے" کلاس کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

کنٹریکٹ کی بنیاد پر انٹیلی جنس بیورو اور سپیشل برانچ کے سربراہان کے طور پر تعینات میجر (ر) مسعود شریف اور ونگ کمانڈر طارق لودھی نے سال ۹۴۔۱۹۹۵ کے دوران انتہائی اہم مشنوں کی تکمیل کے لیے ایک بلین روپے کی خطیر رقم خرچ کر ڈالی۔ مسعود شریف آصف زرداری کا ایک پرانا دوست تھا جبکہ طارق لودھی کے لیے سابق چیف آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی نے بے نظیر بھٹو سے بھرپور سفارش کی تھی۔ ان دونوں افراد کو پاکستان کے شاہی جوڑے کا بھرپور اعتماد حاصل تھا اور ملکی و سیاسی معاملات کے حوالے سے ہر قسم کی معلومات شاہی جوڑے کو فراہم کیا کرتے تھے تاآنکہ ۵ نومبر ۱۹۹۶ کو بے نظیر حکومت برطرف کر دی گئی۔

آصف علی زرداری کے حکم سے کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں واقع انٹیلی جنس بیورو کے دفاتر سے ہاتھ لگنے والے تکنیکی اور دستاویزی مواد کے مطابق چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس سید سجاد علی شاہ' سپریم کورٹ کے جج صاحبان ناصر اسلم زاہد' چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ جسٹس خلیل الرحمان' جسٹس ملک عبدالقیوم اور

جسٹس منیر اے شیخ مسلسل آئی بی کی نگرانی میں رہے اور ان کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے۔ اس امر کی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ آئی بی میں ایسی رپورٹیں مسلسل فائل ہوتی ہیں۔ ان کے سربراہان کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر ہوتا تھا۔ آئی بی نے صدر لغاری کے بیٹوں اور چچا زاد بھائی جعفر لغاری کے فون بھی ٹیپ کیے۔ بیگم لغاری کے نہ صرف ٹیلی فون ٹیپ کیے گئے بلکہ طبی وجوہات کی بنا پر ان کے دورۂ امریکہ سے متعلق "ٹاپ سیکرٹ رپورٹ" بھی مرتب کی۔ صدر کے پرسنل سٹاف کے ممبران بشمول سیکرٹری شمشیر خان اور پریس کنسلٹنٹ خواجہ اعجاز سرور کے فون بھی ٹیپ ہوئے اور ان کی حرکات و سکنات پر بھی آئی بی نے کڑی نگاہ رکھی۔ ان کے علاوہ امریکی سفارت کاروں کی گفتگو بھی ٹیپ کی جاتی رہی۔ نیشنل بینک آف پاکستان مولا بخش عباسی صدر الائیڈ بینک لیمیٹڈ شوکت کاظمی' سابق او جی ڈی سی چیئرمین رفعت عسکری' سابق ڈی جی اے پی پی اظہر سہیل' سابق پرنسپل سیکرٹری بے نظیر بھٹو احمد صادق' آصف زرداری پرسنل سیکرٹری رائے سکندر' سابق چیئرمین سی ڈی اے شفیع سہوانی' بے نظیر بھٹو کی پولٹیکل سیکرٹری ناہید خان' صدر حبیب بینک لیمٹڈ مخدوم یونس ڈالیا کو گرفتار کیا گیا جبکہ ۷۷-۲ کے عنوان سے ایسے بیورو کریٹس کی چھان پھٹک شروع کر دی گئی جو کسی نہ کسی طریقے سے کرپشن کے معاملات میں آصف زرداری کے معاون تھے اور جن کی گرفتاری کسی بھی وقت متوقع ہے۔ ان میں زرداری کے قریبی معاونوں کے نام درج ذیل ہیں:

فرید دیدانی' فوزی علی کاظمی' جاوید پاشا' اقبال میمن' ستار کیریو' مسلم لاکھانی' ناصر وسیم' ڈاکٹر بادشاہ' منیر عطاءاللہ' شیری نقوی' علی جعفری' باری میاں' شیریں رحمان' تصویر جمانی' نالی زرداری' سلیم عمر (فرزند بلو اور علی محمود) عامر لودھی' کرنل محمود' کرنل ظفر' جنرل بابر کے دوست بابر تجمل) اقبال حیدر کا بہنوئی) عباس سرفراز' سلمان تاثیر' مصطفیٰ محفوظ خان' طارق اسلام' حسین لوائی' ظاہر خان نیازی' نوید حبیب ملک' ماجد بشیر' انور مجید' خلیل شیخ اور حاجی عبدالرزاق شامل ہیں جبکہ ۷۷-ج میں شامل سرکاری ملازمین میں احمد صادق' سلمان فاروقی' شیر خان' اے آر صدیقی' بریگیڈیئر اسلم قریشی' منصور شیخ' جاوید طلعت' زبیر قدوائی' جنرل خالد (سافرونا) علی محمد شیخ' کیپٹن

نصیر' مجیب اللہ شاہ' محمد احسان' ایم بی عباسی' ڈاکٹر وقار مسعود' خالد اقبال' شوکت علی کاظمی' اسد اللہ شیخ' منور' یونس ڈالیا' سعید اے قاضی' عزیز اللہ میمن' چودھری سجاد علی' ظہیر خان قاضی' عارف خان قاضی' ایڈمرل اکبر (کے پی ٹی) جسٹس احسان' رفعت عسکری' ظفر اقبال' شفیع سوانی' صادق علی خان' سلیمان خان (سی بی آر) اقبال فرید (سی بی آر) جہانگیر خان (سی بی آر) خالد خان (سول ایوی ایشن) فیاض الہی (پاور بورڈ) میاں انور (ریلویز) ضیاء اللہ (ریلویز) جموٹ (پی آئی اے) اور سراج شمس الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جنرل آصف نواز جنجوعہ

پاکستانی افواج کے سربراہ جنرل آصف نواز جنجوعہ کی شخصیت اس وقت بہت زیادہ زیر بحث آگئی جب ۱۹ جون ۱۹۹۲ء کو فوج نے سندھ میں آپریشن کلین اپ شروع کر دیا۔ مرکز میں وزیراعظم کے طور پر بیٹھے میاں نواز شریف اور ایم کیو ایم کا سیاسی اتحاد چل رہا تھا اور اسی دوران سندھ میں آپریشن کلین اپ شروع کر دیا گیا۔ ایم کیو ایم اور اس کے حامی جماعتوں نے فوج کے اس آپریشن کو "مہاجروں کی قتل گشی" قرار دیا جبکہ ایم کیو ایم مخالف سیاسی جماعتوں نے فوج کے اس عمل کو سراہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ جنرل آصف نواز جنجوعہ کی شخصیت متنازعہ پن اختیار کرتی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آگیا جب آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیئر امتیاز نے ان کی وردی اتار دینے کی دھمکی دے دی۔ نواز شریف حکومت کے خلاف پیپلز پارٹی کے "لانگ مارچ" کو جنرل آصف نواز کا "حمایت یافتہ" قرار دیا گیا اور ساتھ ہی اس تاثر نے بھی زور پکڑا کہ جنرل آصف نواز نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور وہ نواز شریف حکومت کو ختم کر کے بے نظیر کو اقتدار میں لانا چاہتے ہیں۔

جنرل آصف نواز اور بے نظیر گٹھ جوڑ کے تناظر میں ملک کے سیاسی دانشوروں نے پیشین گوئیاں شروع کر دی تھیں کہ آصف نواز نے فوج کی طرف سے بے نظیر کو

دسمبر ۱۹۸۸ء میں ہی "تبدیلی" کا اشارہ دے دیا تھا۔ اگرچہ ملکی سیاسی تاریخ میں جنرل
ایوب خان سے اب تک کسی بھی فوجی سربراہ کا دامن سیاست میں آلودہ ہونے سے
نہیں بچ سکا تاہم مذکورہ بالا حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو جنرل آصف
نواز کی شخصیت متنازعہ نظر آتی ہے۔ فوج جو ایک مقدس اور قومی سالمیت کا ادارہ
خیال کی جاتی ہے اور جس کی بڑی ذمہ داری سرحدوں کی نگہبانی ہے' جب وہ ملک کے
سیاسی اور دیگر امور میں بے جا مداخلت کرتی ہے تو اس کے اور سیاست دانوں کے
درمیان فرق سمٹ جاتا ہے جن کی بڑی شناخت ہی کرپشن اور بددیانتی بن چکی ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد فوج اور بھٹو خاندان میں شدت پکڑ جانے والی کشیدگی
میں آصف نواز اور بے نظیر بھٹو کی ملاقاتوں اور بہت سے معاملات میں ہم آہنگی پیدا
ہونے کی وجہ سے بہت حد تک کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی فوج
کی ایک واضح اکثریت بھٹو خاندان سے نالاں تھی اور یہ وہ اکثریت تھی جو یا تو فوج
کے خفیہ اداروں میں "نظریاتی" کردار ادا کر رہی تھی یا پھر وہ لوگ تھے جو براہ راست
پیپلز پارٹی مخالف قوتوں سے منسلک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۸۸ء میں قائم ہونے والی بے
نظیر حکومت کے ساتھ فوج نے دفاعی نوعیت کے معاملات کے حوالے سے بہت محتاط
رویہ اپنائے رکھا تھا۔

بے نظیر جب برسراقتدار تھیں تو انہوں نے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور ایٹمی
پلانٹ کی کارکردگی کے حوالے سے ایک بریفنگ کی خواہش کا اظہار کیا۔ جواب میں
اعلیٰ فوجی حکام نے صدر اسحاق خان سے مشورہ کے بعد بے نظیر کو ایک فرضی کہانی سنا
کر ٹرخا دیا۔ کیونکہ فوجی حکام کو شبہ تھا کہ بھٹو خاندان پاکستان کے ساتھ مخلص نہیں
اور ان کا ہندوستانی ایجنسیوں اور حکمرانوں کے ساتھ قدیمی تعلق ہے۔ یہ بھی تاثر فوجی
حلقوں میں عام تھا کہ بے نظیر بھٹو اور بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کے درمیان
ہونے والی ملاقات میں جو گفتگو فوج کے خفیہ اداروں نے ٹیپ کی' اس کے مطابق بے
نظیر نے راجیو گاندھی سے فوج میں کمی سمیت دیگر حساس معاملات پر بات چیت کی جو
فوج اور صدر غلام اسحاق خان دونوں کو بہت ناگوار گزری تھی۔

جب ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کا اقتدار ختم کر کے اقتدار خود حاصل کر

لیا تھا تو پی پی پی کے کچھ رہنماؤں نے اپنی احتجاجی تقریروں میں فوجی جرنیلوں کو ختم کرنے کے بارے میں تقریریں کی تھیں۔ ضیاء الحق نے ان تقریروں کی آڈیو اور ویڈیو کیسیں فوج کے اعلیٰ حکام کو دکھا دیں اور سنا دی تھیں اور اس موقع پر کہا تھا کہ آپ خود فیصلہ کریں کہ ملک اور ملک کے مقدس ادارے کے بارے میں پیپلز پارٹی کا کیا ارادہ ہے۔

اس کے علاوہ سقوط ڈھاکہ کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں سانحہ بنگلہ دیش کے متعلق حقائق جاننے کے لیے سوالات اٹھتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سانحہ کا ذمہ دار ذوالفقار علی بھٹو تھا جبکہ کچھ کا خیال تھا کہ اس کی ذمہ دار فوج ہے۔ اس کی تحقیق کے لیے بھٹو نے جسٹس حمود الرحمٰن کی سرپرستی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ اس رپورٹ میں کچھ جرنیلوں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کی سفارش کی گئی تھی۔ بھٹو اس رپورٹ کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے جبکہ فوج اس رپورٹ کی کھلے عام اشاعت کے خلاف تھی۔ اس لحاظ سے بھی فوج نے اپنی سبکی محسوس کی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تذلیل کا ذمہ دار بھٹو کو ٹھہرایا۔

فوج اور خفیہ اداروں کے وہ عناصر جو سول حکمرانوں اور حکومت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے' ان میں آئی بی کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر امتیاز اور میجر عامر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنرل آصف نواز اور بے نظیر گٹھ جوڑ کی ابتدائی اطلاعات بریگیڈیئر امتیاز ہی نے اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کو پہنچائیں۔ فوج کے سربراہ جنرل آصف نواز کو بریگیڈیئر امتیاز سے سخت نفرت تھی اور نواز شریف کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔

جب اس دوران سندھ کے حالات بہت خراب ہوگئے تو فوج کی خفیہ ایجنسیوں نے جنرل آصف نواز کی اجازت سے وزیراعظم نواز شریف کو ۷۰ افراد کی ایک لسٹ دی جس میں پی پی پی اور ایم کیو ایم کے سرکردہ افراد کے نام شامل تھے۔ ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ یہ لوگ سندھ میں دہشت گردوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ جنرل آصف نواز نے بڑے منظم اور بھرپور طریقے سے سندھ میں فوج کا آپریشن کلین اپ شروع کر دیا۔ جنرل آصف نواز کی "خصوصی توجہ" کے باعث سندھ تہہ وبالا ہو

تخریب کاروں اور دہشت گردوں سے زیادہ ایم کیو ایم کی طرف توجہ دی گئی اور جنرل آصف نواز نے ایم کیو ایم کو دو حصوں حق پرست (الطاف) اور ایم کیو ایم حقیقی (آفاق اور عامر) میں تقسیم کر دیا۔

جنرل آصف نواز نے حکومت وقت کو مجبور کیا کہ وہ ایم کیو ایم کے عقوبت خانوں کی تشہیر کرے۔ الطاف حسین کے پتلے جلائے گئے اور اسے غدار اور تخریب کاروں کا سرغنہ پیش کیا گیا۔ آپریشن کا اصل مقصد سندھ بشمول کراچی کو تخریب کاروں سے پاک کرنا تھا جو کہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ آصف نواز پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے دل جمی کے ساتھ محض ایم کیو ایم کو کرش کرنے کے لیے کارروائی جاری رکھی اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ بعض سیاست دان یہ الزام بھی لگاتے رہے کہ آصف نواز نے ایسا خالصتاً" بے نظیر کی خواہش پر کیا جو اپنے سیاسی گڑھ سندھ میں ایم کیو ایم سے خوفزدہ تھیں اور نواز شریف اور ایم کیو ایم میں دراڑیں ڈالنا چاہتی تھیں۔

آصف نواز کے بارے میں یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ جن دنوں پی پی پی اور مسلم لیگ کے معتدل مزاج سیاست دان آپس کی اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کے لیے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ انہی دنوں جنرل آصف نواز اور گوہر ایوب کی وساطت سے جنرل آصف نواز اور بے نظیر کی ملاقاتیں بھی جاری تھیں۔ کیونکہ گوہر ایوب نواز شریف حکومت ٹوٹنے کی صورت میں نگران وزیر اعظم بننا چاہتے تھے۔ دوسرا ان کو یہ لالچ بھی دیا گیا تھا کہ صدر اسحاق کی چھٹی ہونے کی صورت میں گوہر ایوب پاکستان کے صدر بھی بن سکتے ہیں۔

گوہر ایوب کو پیپلز پارٹی کی طرف سے یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ صدارتی انتخابات میں پی پی پی ان کے خلاف اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ اسی دوران جنرل آصف نواز جب امریکہ جانے لگے تو بی ایچ کیو کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ محترمہ بے نظیر اپنے اثر و رسوخ سے امریکی حکام تک یہ بات پہنچا دے کہ فوجی امداد کی بندش پاک امریکہ تعلقات کو مزید کشیدہ کرے گی۔ چنانچہ بے نظیر نے واشنگٹن سے اقتصادی اور فوجی امداد کی بحالی کے لیے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ

پاکستان ایٹمی قوت نہیں ہے اور بھارت امریکہ تعلقات علاقے میں فساد کا باعث ہوں گے۔ جنرل آصف نواز امریکہ سے فوجی امداد تو نہ لا سکے البتہ بے نظیر کے اس اقدام سے فوج اور بھٹو خاندان میں کشیدگی تقریباً ختم ہو گئی اور ایک خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہو گیا۔

جنرل آصف نواز اور نواز شریف کے اختلافات کا سب سے زیادہ فائدہ اسحاق خان اور بے نظیر نے اٹھایا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۹۲ء کی رات اسلام آباد میں جنرل آصف نواز اور بے نظیر بھٹو کے درمیان "بڑی اہم" ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں بے نظیر اور آصف نواز کے درمیان مستقبل کے حوالے سے بہت سے "اہم امور" طے پا گئے۔ ملاقات کے اختتام پر خصوصی طور پر یہ عہد کیا گیا کہ دونوں شخصیات کا رابطہ مستقل رہے گا۔

بریگیڈیئر امتیاز کے ذریعے وزیراعظم نواز شریف تک اس ملاقات اور اس کے چیدہ چیدہ مندرجات کی اطلاع پہنچی تو وہ بہت سیخ پا ہوئے۔ بریگیڈیئر امتیاز نے اسی وقت نواز شریف کو طلاع دے دی اور خبردار کر دیا کہ اس ملاقات کا منطقی نتیجہ ان کی حکومت کے خلاف اپوزیشن کے ایک موثر احتجاج کی صورت میں رونما ہو گا اور اس احتجاج کو آصف نواز کی مکمل حمایت حاصل ہو گی۔

اس ملاقات کے ذریعے آصف نواز کی طرف سے بے نظیر کو "تبدیلی" کا پیغام مل چکا تھا اور وہ ۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء کو اہم فیصلہ کرنے والے تھے کہ ۸ جنوری ۱۹۹۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے آصف کی موت واقع ہو گئی۔ سیاسی حلقے جنرل آصف نواز پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ بے نظیر کے لانگ مارچ کو ان کی مکمل حمایت حاصل تھی اور خالصتاً ان کی رضامندی سے لانگ مارچ پلان کیا گیا۔

اپریل ۱۹۹۳ء میں جنرل آصف نواز کی بیوہ نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ ان کے خاوند کو ایک سازش کے تحت ہلاک کیا گیا۔ جنرل آصف نواز کی بیوہ نے یہ الزام بریگیڈیئر امتیاز اور وفاقی وزیر چودھری نثار علی پر لگایا۔ اس انکشاف نے ملکی و غیر ملکی پریس کو حیران کر دیا۔ دوسری طرف بریگیڈیئر امتیاز نے اس الزام کی تصدیق یا تردید کرنا بھی مناسب نہ سمجھا

بیگم آصف نواز کے اس بیان نے جی ایچ کیو کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس الزام نے فوجی حلقوں میں بریگیڈیئر امتیاز اور چودھری نثار علی کے بارے میں شکوک و شبہات کو جنم دیا اور فوج میں ایک بے چینی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس نازک صورت حال کو بھانپتے ہوئے نئے چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید کاکڑ نے صدر غلام اسحاق خان اور وزیراعظم میاں نواز شریف سے ملاقات کی۔ اس کے فوراً بعد عبدالحمید نے بیگم آصف نواز کے عائد کردہ الزامات کی تحقیقات کے لیے ایک جوڈیشل کمیشن مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ کمیشن نے تحقیقات کیں اور آصف نواز کی موت کو طبعی قرار دیا۔ تاہم آصف نواز کے جنازے کے حاضرین جانتے ہیں کہ بیگم آصف نواز نے اس موقع پر بین کرتے ہوئے اور جنازے کے ساتھ اعلیٰ فوجی حکام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "تم لوگ دیکھتے ہی رہ گئے اور دشمنوں نے میرا سہاگ اجاڑ دیا"۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بریگیڈیئر امتیاز کو کیا ضرورت تھی کہ وہ فوج کے سربراہ کو خاص قسم کا زہر دے کر ہلاک کرتے۔ ایک بات تو طے ہے کہ آصف نواز مرحوم بریگیڈیئر امتیاز سے شدید نفرت کرتے تھے اور اس بات کا وہ متعدد بار اظہار بھی کر چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ بے نظیر کے نواز شریف حکومت کے خلاف لانگ مارچ میں ان کی کامل منشاء شامل تھی۔ اس وقت آصف نواز کو بے نظیر کے ساتھ بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت کی ہائی کمان نے آصف نواز کو راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی ایسا اقدام کیا ہو جو ان کی موت کا سبب بنا۔ کیونکہ جنرل آصف نواز آئی ایس آئی کو غیر ضروری سیاسی کردار سے دور رکھنا چاہتے تھے اور خاص طور پر وہ بریگیڈیئر امتیاز کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے جبکہ نواز شریف حکومت میں بریگیڈیئر امتیاز ایک طاقتور ترین فرد قرار دیئے جاتے تھے اور ان کے رابطے ذرائع ابلاغ سمیت ملک کے دوسرے شعبوں میں کلیدی اسامیوں پر بیٹھے ایسے افراد کے ساتھ بہت مضبوط تھے جو بے نظیر بھٹو کے شدید ترین مخالف تھے۔

بعد میں آصف نواز کے خاندان نے کئی اہم افراد نے پی پی پی جوائن کی بلکہ انتخابات میں حصہ بھی لیا لیکن سیاست میں کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ آصف نواز کی موت سے ان کی شخصیت اور زیادہ متنازعہ ہو کر سامنے آ گئی اور آج بھی جب آصف نواز کا

بطور سابقہ چیف آف آرمی سٹاف تذکرہ ہوتا ہے تو ان کی شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے ایسی لاتعداد باتیں سامنے آتی ہیں جو ان کی شخصیت کو بہت پراسرار اور متنازعہ ثابت کرتی ہیں۔

جنرل مرزا اسلم بیگ

پاکستانی فوج کے سابق سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کئی حوالوں سے ایک متنازعہ شخصیت قرار پاتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء سے لے کر آج تک مرحوم صدر ضیاء الحق کے لواحقین اور پیروکار جنرل اسلم بیگ کو ضیاء الحق کی موت کی سازش میں شامل قرار دیتے آ رہے ہیں۔ صدر ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق نے کئی بار واشگاف الفاظ میں ضیاء الحق کی موت کا ذمہ دار اسلم بیگ کو ٹھہرایا ہے اور پھر ۱۷ اگست کو ضیاء کی برسی کے موقع پر حکومت وقت اور اعلیٰ فوجی حکام سے مطالبہ کرتے ہے کہ جنرل اسلم بیگ اور ان کے ساتھیوں کو اس جرم میں گرفتار کیا جائے۔ جنرل اسلم بیگ کی متنازعہ شخصیت کا دوسرا حوالہ ان کا وہ اعترافی بیان ہے جو انہوں نے ایک موقع پر داغ دیا تھا کہ انہوں نے سپریم کورٹ آف پاکستان کو کہا تھا کہ وہ محمد خان جونیجو کی اسمبلی بحال نہ کرے۔ جنرل بیگ کی شخصیت کا تیسرا اور اہم ترین متنازعہ پہلو ان پر لگایا جانے والا وہ الزام ہے جس کے مطابق انہوں نے مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب سے ۱۴ کروڑ روپے وصول کیے اور ان کو ذاتی استعمال میں لے آئے اور اسی یونس حبیب سے کراچی کے ایک پوش علاقے میں قیمتی بنگلہ بھی تحفے میں حاصل کر لیا۔ واضح رہے کہ ان پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی پاکستانی فوج کے دیگر جرنیلوں کی طرح افغان جنگ میں وسیع پیمانے پر مال بنایا۔ اسی طرح اسلم بیگ نے بھی اس موقع پر خوب فوائد کشید کیے جبکہ اسلم بیگ پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے عراق

کویت جنگ کے موقع پر عراق کی حمایت کر کے بہت زیادہ مالی فوائد حاصل کیے۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں کی حادثاتی ہلاکت کے بعد ہر پاکستانی جنرل اسلم بیگ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ ملکی سیاسی صورت حال ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں ایک طرف یہ اعلان ہو چکا تھا کہ انتخابات کب ہوں گے لیکن دوسری طرف جنرل ضیاء کی ہلاکت نے سیاسی حالات کو مشکوک بنا دیا تھا۔ جنرل اسلم بیگ نے فوج کی کمانڈ سنبھالی اور ساتھ ہی الیکشن کے انعقاد کا کیا گیا وعدہ نبھانے کا بھی اعلان کیا۔ اس طرح ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کی شام جنرل اسلم بیگ فوجی کی زندگی ملکی سیاست اور حصول اقتدار میں پیوست ہو گئی۔

غلام اسحاق خان جو ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کے حادثے کے وقت سینٹ کے چیئرمین تھے' انہوں نے حادثے کے بعد صدر مملکت کا عہدہ سنبھال لیا۔ یوں جنرل مرزا اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان کی مشترکہ کوششوں سے انتخابات کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ اسلم بیگ پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ۸۸ء کے انتخابات میں اپنی بھرپور کوشش کی کہ پیپلز پارٹی کی محترمہ بے نظیر بھٹو کامیابی حاصل نہ کر سکیں لیکن اسلم بیگ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ پنجاب سے آنے والے نتائج نے اسلم بیگ کو قدرے مطمئن کر دیا۔ بظاہر اسلم بیگ نے قوم کے ساتھ اپنا قد بڑھانے کی کوشش کی اور اپنے اخباری بیانات میں یہ تاثر دیا کہ وہ ضیاء الحق اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام کی حادثاتی موت کے بعد ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء نافذ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ملک و قوم کے مفاد کی خاطر ایسا نہیں کیا اور اس کے علاوہ وہ پاکستان میں جمہوریت کو پروان چڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ شاید اسلم بیگ کا گمان ہے کہ وہ مارشل لاء کا راستہ روکنے والے ہیں لیکن اس کے پس پردہ دیگر حقائق اصل میں اسلم بیگ کی قوت سے کئی گناہ طاقتور تھے ورنہ اسلم بیگ کی طبیعت شاید اس "خوشحالی" کا راستہ منتخب کرتی جو اس سے پہلے فوجی جرنیل کرتے آئے تھے۔

۸۸ء میں بے نظیر بھٹو نے مرکز میں اپنی حکومت بنا لی۔ ملک میں پہلی بار خاتون وزیراعظم بننے پر فوج کے اندر احساس ندامت پیدا ہونا شروع ہوا جس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ تھی کہ فوج کے اعلیٰ حکام کو بار بار ایک عورت وزیراعظم کو سیلوٹ

کرنا پڑتا تھا۔ بعض ذرائع یہ انکشاف بھی کرتے ہیں کہ فوجی جرنیلوں نے اسلم بیگ و اس "تذلیل" سے آگاہ کیا کہ وہ ایک "ناپسندیدہ" عورت کو کبھی سیلوٹ نہیں کر سکتے۔ جرنیلوں کی ایک میٹنگ کے دوران اس کا یہ حل تلاش کیا گیا کہ بے نظیر کے سامنے اعلیٰ افسران اپنی ٹوپیاں اتار کر رکھا کریں گے۔

اس کے فوری بعد جنرل اسلم بیگ نے وزیراعظم محترمہ بے نظیر کو جی ایچ کیو طلب کر لیا اور انہیں سمجھانے کے انداز میں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو "مکمل وزیراعظم" نہ خیال کریں اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ فوجی اور خارجہ تعلقات کے معاملے میں جی ایچ کیو سے آنے والی ہدایات پر پوری طرح عمل کریں اور اس کے علاوہ دفاع کے سلسلے میں کوئی نئی پالیسی بنانے سے پہلے جی ایچ کیو سے منظوری حاصل کریں۔

ملک میں صدارتی انتخابات کا انعقاد قریب آیا تو ایک بار پھر جنرل اسلم بیگ نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو جی ایچ کیو طلب کر لیا اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ "ملکی مفاد" کو مدنظر رکھتے ہوئے صدارتی انتخابات میں امیدوار غلام اسحاق خان کو پیپلز پارٹی کا امیدوار نامزد کریں اور اس کے علاوہ فوج کے اندرونی معاملات اور تبدیلیوں کے متعلق کوئی رائے دینے سے حتی المقدور گریز کریں۔ چونکہ یہ معاملات خالصتاً ملکی دفاع سے منسلک ہیں اس لیے کوئی بھی ایسی پالیسی یا رائے قابل قبول نہیں ہوگی جس کا براہ راست تعلق فوجی معاملات سے ہو۔ اسلم بیگ نے غلام اسحاق خان سے گٹھ جوڑ کر کے بے نظیر کو باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ صرف نام کی وزیراعظم ہیں اور ان کو ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہوگا کیونکہ ہم ان کو جب چاہیں گے گھر بھیج سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے نظیر نے اسلم بیگ کو اور غلام اسحاق خان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مرضی کے فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔ بے نظیر نے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل کو جبری ریٹائر کر دیا اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل کلو کو آئی ایس آئی کا سربراہ بنا کر اسلم بیگ کو چیلنج کر دیا کہ وہ ان کو کسی اقدام سے نہیں روک سکتے۔

اسلم بیگ نے صدر غلام اسحاق خان کو بے نظیر کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی اسلم بیگ نے پیپلز پارٹی مخالف لوگوں سے رابطے بڑھانا

شروع کر دیئے۔ جنرل اسلم بیگ اور فوج کے دیگر اعلیٰ حکام خوفزدہ ہو گئے کیونکہ بے نظیر برائے راست فوج میں ترقیوں کے معاملات میں دخل دینا شروع ہو گئی تھیں۔ جب بے نظیر نے جی ایچ کیو کو اپنی لسٹ ارسال کی تو فوجی حلقے اور بھی شدت کے ساتھ بے نظیر حکومت کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ ان معاملات نے خطرناک موڑ اس وقت اختیار کر لیا جب بے نظیر بھٹو نے ایڈمرل سروہی کو جبراً ریٹائر کرنے کی کوشش کی۔

اس اقدام کے بعد جنرل اسلم بیگ نے تمام کور کمانڈروں کے ساتھ ملاقات کیں اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی۔ اسلم بیگ نے فوجی کور کمانڈروں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ بے نظیر فوج کا نظام ختم کرنا چاہتی ہیں اور حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر اس وقت بے نظیر کا مقابلہ نہ کیا گیا تو پھر ملک کو سنگین صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس طرح جنرل اسلم بیگ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان اختلافات کی خلیج واضح ہونے لگی اور ان اختلافات میں بہت زیادہ شدت اس وقت آ گئی جب کراچی کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے باعث جنرل اسلم بیگ نے مطالبہ کر دیا کہ فوج کو دفعہ ۲۴۵ کے تحت اختیارات دیے جائیں مگر بے نظیر نے یہ اختیارات دینے سے انکار کر دیا کیونکہ بے نظیر کو مکمل یقین تھا کہ جنرل اسلم بیگ اختیارات کا ناجائز استعمال کریں گے۔ اسلم بیگ کا یہی موقف تھا کہ فوج بہتر طریقے سے سندھ میں برسرپیکار ڈاکوؤں کا قلع قمع کر سکتی ہے جبکہ پولیس کے پاس اتنی طاقت اور مہارت نہیں کہ وہ منظم پیمانے پر ہونے والی دہشت گردی پر قابو پا سکے۔

اسلم بیگ کو اختیارات نہ دیے گئے جس کی وجہ سے انہوں نے حکومت کو جلد از جلد ختم کرانے کا عزم کر لیا۔ اسلم بیگ نے بے نظیر حکومت پر پہلا وار اس طرح کیا کہ کراچی میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے معاہدے کو غلام اسحاق خان کے مشورے سے ختم کرا دیا۔ اس طرح صدر اسحاق خان کو اسلم بیگ کی مدد سے بے نظیر حکومت کے خلاف الزامات کی فہرست مرتب کرنے میں آسانی ہو گئی۔

اسلم بیگ نے غلام مصطفیٰ جتوئی، نواز شریف اور قاضی حسین احمد کے ساتھ

رابطے کرنا شروع کر دیئے اور غلام مصطفیٰ جتوئی کو باقاعدہ سرکاری طور پر ہدایات شروع کر دیں۔ اسلم بیگ کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور صدر غلام اسحاق خان نے ۶ اگست ۹۰ء کو بے نظیر حکومت ختم کر دی۔ بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد اسلم بیگ اور زیادہ متحرک ہوگئے اور انھوں نے مسلم لیگ کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اسلم بیگ پر کراچی میں ایم کیو ایم کی سرپرستی کا بھی الزام لگایا جانے لگا۔ کیونکہ کراچی سے پیپلز پارٹی کا حلقہ اثر ختم کرنے کے لیے سرکاری سطح پر الطاف حسین کی ہر طرح کی مدد کی گئی بلکہ بعض حلقے تو یہاں تک بھی کہتے تھے کہ اسلم بیگ کا براہ راست تعلق ایم کیو ایم سے تھا۔

خلیج کی جنگ کے دوران اسلم بیگ کے کردار کا ایک اور رخ سامنے آیا۔ اسلم بیگ نے کھلے عام حکومتی فیصلوں کی خلاف ورزی کی اور اخبارات کو متنازعہ بیانات جاری کرتے رہے۔ وہ بے نظیر کی پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ اسلم بیگ پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انھوں نے صدام کی امداد کے لیے مختلف ملکوں کو پیغام بھیجے حتیٰ کہ صدام کی خود بھی مدد کرتے رہے۔ دوسری طرف حکومت اتحادی فوجوں کا ساتھ دے رہی تھی اور اس مقصد کے لیے حکومت پاکستان نے فوج کا ایک دستہ سعودی عرب بھی روانہ کیا۔

اسلم بیگ پر امریکہ نواز ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ یہ الزام لگانے والوں کا دعویٰ تھا کہ ۱۹۸۹ء میں جب امریکہ سے پاکستانی نیوکلیئر پروگرام کو کیپ کرنے کی ہدایات وصول ہوئیں تو جنرل اسلم بیگ نے نیوکلیئر پروگرام کو کیپ کرنے کا حکم صادر فرما دیا تھا۔

اسی طرح مرزا اسلم بیگ پر سردار قیوم نے الزام لگایا کہ انھوں نے ۲۷ اگست ۱۹۹۰ء میں ہونے والے کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں مداخلت کر کے انہیں شکست دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سردار قیوم کے بقول ان انتخابات میں ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور خفیہ اداروں نے انھیں کامیابی کی خوشخبری بھی سنا دی تھی لیکن اسلم بیگ نے بے جا مداخلت کر کے انتخابی نتائج میں تبدیلیاں کرا دیں۔

اسلم بیگ کی شخصیت اس وقت ایک بار پھر موضوع بحث بن گئی جب مہران

بینک کا فراڈ سکینڈل سامنے آیا۔ مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب نے انکشاف کیا کہ انہوں نے جنرل اسلم بیگ کو بینک اکاؤنٹ سے ۱۴ کروڑ روپے دیئے۔ اس کے علاوہ یونس حبیب نے یہ بھی انکشاف کیا کہ انہوں نے اسلم بیگ کو کراچی میں ایک بہت قیمتی بنگلہ بھی تحفے میں دیا۔ جب اسلم بیگ سے اس خطیر رقم کے استعمال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں بعض اہم وجوہات کے باعث ۱۴ کروڑ روپے کا استعمال کی تفصیلات بتانے سے قاصر ہوں۔

اسی طرح سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی اسلم بیگ کے ہاتھوں ہتک کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلم بیگ نے ایک دن اچانک اخبارات کو بیان دے دیا کہ سپریم کورٹ نے ان کے کہنے پر محمد خان جونیجو کی اسمبلی بحال نہیں کی تھی کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ اگر جونیجو حکومت بحال کی گئی تو وہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیں گے۔ سپریم کورٹ نے توہین عدالت کے زمرے میں اسلم بیگ کو عدالت میں طلب کر لیا لیکن اسلم بیگ اپنے بیان سے نہ ہٹے اور مجبوراً سپریم کورٹ کو اپنی ہتک تسلیم کرنا پڑی اور اس کا تاثر بہت متاثر ہوا۔

فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد اسلم بیگ نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور اخبارات کے ذریعے اپنے آپ کو دانشور اور دردِ دل رکھنے والے پاکستانی کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے "فرینڈز" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور ملک کے دور دراز حصوں میں بھی اس تنظیم کے ذیلی دفاتر قائم کیے۔ اسلم بیگ اس تنظیم کی سرپرستی میں ملک کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں تقریبات منعقد کرنے لگے اور اپنی خواہش اقتدار کا برملا اظہار کرنے لگے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسلم بیگ نے مسلم لیگ (ج) جوائن کر لی اور ملکی سیاست میں نام بنانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی "فرینڈز" کی طرف دوبارہ مائل ہو گئے۔ اسلم بیگ کی فرینڈز توقع کے مطابق کامیابیاں حاصل نہ کر سکی تو انہوں نے اپنی سیاسی جماعت "عوامی قیادت پارٹی" تشکیل دے دی اور جو خواب اسلم بیگ نے ۷ اگست ۱۹۸۸ سے دیکھنا شروع کیا تھا' اس کی تعبیر کا انتظار کرنے لگے۔

اسلم بیگ کے پاس دولت کی فراوانی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے وہ اپنی سیاسی

جماعت کی ضلعی کمیٹی کو ۳۵۰۰۰ روپے ماہانہ خرچ دیتے ہیں جبکہ صرف لاہور آفس کو ۶۵۰۰۰ ہزار روپے ماہانہ خرچ دیا جاتا ہے۔ یہ ساری کوششیں اس وقت رائیگاں گئیں جب فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں "عوامی قیادت پارٹی" چند ہزار ووٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ ۱۹۹۷ء کے آغاز میں یک امریکی جریدے نے اپنی اشاعت میں انکشاف کیا تھا کہ اسلم بیگ کے اربوں روپے امریکی بینکوں میں پڑے ہیں جس کی کبھی بھی اسلم بیگ نے تردید نہیں کی ہے۔

الطاف حسین

۸۵ کے بعد پاکستان کے سیاسی منظر پر ابھرنے والی تین بڑی شخصیات میں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے بعد ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین کا نام آتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں شخصیات پاکستان کی وزارت اعظمیٰ کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ اگرچہ تین بار ان دونوں کی حکومت کو ختم کیا گیا لیکن الطاف حسین سندھ' اور خصوصاً کراچی اور حیدر آباد کی سیاست سے نہیں نکل سکے اور نہ ہی ابھی تک کوئی مضبوط اور مستقل سیاسی اتحاد بنانے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ ۸۴ء میں کراچی میں پھوٹ پڑنے والے فسادات نے آہستہ آہستہ الطاف حسین کی شخصیت کو ملک اور بیرون ملک متعارف کرانا شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فسادات زیادہ شدت اور نت نیا انداز اختیار کرتے گئے اور اسی تیزی کے ساتھ الطاف حسین کی شخصیت متنازعہ بنتی گئی۔

الطاف حسین پر اپنے مخالفین کو قتل کرانے کے لاتعداد الزامات لگائے گئے۔ دوسری طرف الطاف حسین کی شخصیت ایم کیو ایم میں اس قدر مقبولیت حاصل کر گئی۔ ان کی جماعت کے کارکنوں کی بڑی تعداد الطاف حسین کو ایک روحانی شخصیت سمجھنے لگی۔ اگر الطاف حسین لندن یا امریکہ سے فون پر بھی خطاب کرتے تو لاکھوں لوگ یہ خطاب سننے کے لیے اڈے چلے آتے۔ الطاف حسین کی شخصیت کے بارے میں حیران کن انکشافات اس وقت بڑی تیزی کے ساتھ سامنے آنے لگے جب سابقہ وزیراعظم

بے نظیر بھٹو کے وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیراللہ بابر نے کراچی آپریشن کی ذمہ داری سنبھالی۔ ایم کیو ایم کے درجنوں ٹارچر سیل برآمد کیے گئے۔ لاتعداد ایسی شہادتیں حکومت کے ہاتھ لگیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ کراچی کی اکثر قتل و غارت الطاف حسین کے حکم پر یا منظوری کے ساتھ ہوتی ہے۔ غرض الطاف حسین سے متعلق اس نوعیت کے حیران کن انکشافات حکومت اور ذرائع کے ذریعے سامنے آئے کہ ان کی شخصیت نہ صرف پراسرار ہوتی گئی بلکہ اس کا متنازعہ پن بھی انتہا کو پہنچ گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے بعد ایم کیو ایم واحد سیاسی جماعت تھی' جس نے اپنے قیام کے چند برسوں میں ہی ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ ایم کیو ایم کا قیام ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو عمل میں آیا اور اگلے تین برس اس جماعت نے کراچی اور حیدر آباد میں اتنی سخت محنت کی کہ کراچی اور حیدر آباد کے شہری علاقوں کی سب سے مقبول سیاسی جماعت بن گئی۔ الطاف حسین نے ایم کیو ایم کے قیام اور اسے عوامی سطح پر متعارف کرانے کے لیے دن رات محنت کی۔ انہوں نے سائیکل پر سفر کیا اور لوگوں کی منت سماجت کر کے چندہ حاصل کیا۔ الطاف حسین کی ان کوششوں نے ایم کیو ایم کو ایک بہت بڑی اور باا ثر سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا۔

الطاف حسین کو ملنے والی بے تحاشہ پذیرائی نے الطاف میں شخصی تغیر و تبدل کا کام شروع کیا اور الطاف حسین ایم کیو ایم کے مزاج کو غیر جمہوری رنگ دینے لگے۔ چونکہ ایم کیو ایم مکمل طور پر الطاف حسین اور اس کے احکامات کے تابع تھی اس لیے جماعت سے کسی فرد کو جرات نہ ہوتی کہ وہ اختلاف رائے کا اظہار کر سکے۔ الطاف حسین نے ایم کیو ایم سے اپنی محنت کا صلہ ڈکٹیٹر بن کر وصول کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایم کیو ایم کا مزاج سیاسی جماعت کے بجائے ایک متعصب لسانی جماعت کا سا ہو گیا۔ ایم کیو ایم نے الطاف حسین کے حکم پر اپنی "عسکری قوت" بڑھانا شروع کی اور اپنے مخالفین کے ساتھ جنگ پر اتر آئی۔ اس جنگ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ فسادات اور تخریبی کارروائیوں نے روشنیوں کے شہر کراچی کو اندھیروں میں دھکیل دیا اور ہر روز درجنوں افراد بے دردی کے ساتھ قتل کیے جانے لگے۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ الطاف حسین کے حکم پر فوجی حکام کو بھی شدید

نوعیت کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی واضح مثال میجر کلیم کیس تھا جس میں الطاف حسین بنفس نفیس شامل تھے۔ اس کے علاوہ درجنوں ایسے واقعات کراچی میں رونما ہوئے جن میں فوج' رینجرز اور پولیس کے اہلکاروں کو الطاف حسین کے حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایم کیو ایم سے علیحدہ ہو کر ایم کیو ایم کا حقیقی گروپ تشکیل دینے والوں کے خلاف بھی الطاف حسین نے اعلان جنگ کر دیا اور اس جنگ میں سینکڑوں لوگ قتل کر دیے گئے۔ الزام لگایا کہ وزیر سندھ عبداللہ شاہ کے بھائی کو الطاف حسین کے حکم پر قتل کیا گیا۔ ایم کیو ایم کے مرکزی رہنما اور الطاف حسین کے جانشین عظیم احمد طارق کو بھی انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا جس کا الزام بھی الطاف حسین پر لگایا گیا۔ حتیٰ کہ کراچی کے معروف اردو ہفت روزہ "تکبیر" کے ایڈیٹر صلاح الدین کو بھی ان کے دفتر کے باہر نامعلوم افراد نے بے دردی سے قتل کر دیا تو صلاح الدین کے قتل کا الزام بھی الطاف حسین پر لگایا گیا۔

فوج کے سربراہ جنرل آصف نواز نے الطاف حسین کی قوت توڑنے کے لیے آفاق احمد اور عامر احمد وغیرہ کے ذریعے ایم کیو ایم کو دو حصوں میں تقسیم کروا دیا۔ اس طرح ایم کیو ایم حق پرست (الطاف) اور ایم کیو ایم حقیقی (آفاق۔ عامر) کے نام سے دو متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس تقسیم کے بعد الطاف حسین کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آئی' اس کا تجزیہ کراچی کی ہلاکتوں سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

جنرل آصف نواز کی خصوصی ہدایت پر حکومت کو مجبوراً ایم کیو ایم کے عقوبت خانوں اور جرائم کی تشہیر کرنا پڑی۔ اخبارات میں الطاف حسین کے قائم کردہ ٹارچر سلوں کی تصاویر شائع ہوئیں۔ فوجی حکام نے لاتعداد ایسے لوگوں کو ذرائع ابلاغ کے سامنے پیش کیا جنھوں نے کراچی کی ہلاکتوں کا براہ راست الزام الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں پر لگایا۔ الطاف حسین کی نجی زندگی کے بارے میں بعض افراد سے ایسے ایسے انکشافات کرائے گئے کہ الطاف حسین کی شخصیت بہت زیادہ تنقید کی زد میں آئی۔ ذرائع ابلاغ میں الطاف حسین کے بارے میں متعدد بار دعوے کیے گئے کہ ان کا براہ راست تعلق بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ساتھ ہے اور "را" کراچی میں خون ریزی اور بدامنی کے عوض براہ راست الطاف حسین کو بھاری رقوم اور اسلحہ

سمیت دیگر امداد فراہم کرتی ہے۔

الطاف حسین کے قد آدم پورٹریٹ کراچی کی بڑی بڑی سڑکوں پر جلائے گئے۔ الطاف حسین کے پتلے نذر آتش کیے گئے۔ واضح رہے کہ اس دوران سینکڑوں ایسے لوگوں کو بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں نے گرفتار کیا جنھوں نے الطاف حسین کی ہدایات پر سنگین جرائم کرنے کا اعتراف کیا۔ لیکن یہ تمام اقدامات' انکشافات اور دعوے اس وقت بے اثر ہوگئے جب حکومتی اداروں کو یہ یقین ہوگیا کہ مہاجر الطاف حسین کی محبت میں بڑی شدت سے گرفتار تھے۔ مہاجروں کی اکثریت کے دلوں میں الطاف حسین کی محبت موجود رہی کیونکہ مہاجر الطاف حسین کو مسیحا سمجھتے تھے۔ ان کا مجموعی طور پر خیال یہ تھا کہ الطاف حسین ان کی زندگیوں میں خوشیاں اور کامرانیاں لائے گا۔ اور اس طرح الطاف حسین کی وساطت سے ان کے گھروں سے غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

الطاف حسین نے مہاجروں کی نبض پہچان لی اور ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ ڈال دیا۔ الطاف حسین کی پر امید تقریریں مہاجروں کی توقعات کو بڑھاوا دیتی رہیں اور مہاجر الطاف حسین کے فدائی بنتے گئے۔ اس طرح الطاف حسین اور ایم کیو ایم کی قوت میں اضافہ ہونے لگا۔ الطاف حسین اپنی جماعت کے ہمدردوں سے چندہ لینے لگے اور جب اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور عوام چندہ دے دے کر تنگ آ گئے تو پھر ان بے چاروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔ الطاف حسین کی ایماء پر ایم کیو ایم کے مسلح افراد کراچی کے تاجروں اور صنعت کاروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرنے لگے اور ایک وقت آیا کہ کراچی کی ساری معیشت محض اس ضمانت پر چلنے لگی کہ اس میں سے قابل قدر حصہ ایم کیو ایم کو بھتہ کے طور پر دیا جائے گا۔ دوسری طرف الطاف حسین کی چھیڑی ہوئی مہاجر اور مقامی کی جنگ رفتہ رفتہ شدت پکڑتی گئی۔ اس شدت کے باعث ایم کیو ایم کا قومی سطح پر جو سیاسی مزاج ابھرا اس کی بدولت ایم کیو ایم سے اقتدار کے لیے اتحاد کرنے والی جماعتیں الطاف حسین کے ہاتھوں بلیک میل ہونے لگیں جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ایم کیو ایم کے اتحاد بہت زیادہ عارضی تصور کیے جانے لگے۔

الطاف حسین نے ایم کیو ایم کے مزاج میں سفاکی اور موقع پرستی کو بڑھانا شروع کیا۔ جب ایم کیو ایم کا "دائرہ عمل" بہت زیادہ وسیع ہو گیا تو اس میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو گئی جو باقاعدہ طور پر جرائم پیشہ لوگ تھے۔ الطاف حسین پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھارتی ایجنسی "را" سے بھرپور مدد حاصل کی اور "را" کے ایجنٹوں کو الطاف حسین نے ایم کیو ایم میں باقاعدہ شامل کیا۔ رفتہ رفتہ ایم کیو ایم کراچی اور حیدر آباد جیسے شہروں پر قابض ہو گئی اور اسلام آباد میں اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ایم کیو ایم کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ الطاف حسین نے ایم کیو ایم میں باقاعدہ طور پر ایک ایسا ونگ قائم کیا جس کے ارکان کو جدید ترین اسلحہ کے استعمال اور گوریلا کارروائیوں کی تربیت دی گئی۔ جب الطاف حسین نے اپنے آپ کو اور اپنی تنظیم کو "مکلوط" بنا لیا تو وزیراعظم اور وزیراعلیٰ الطاف حسین کے در پر حاضری دینے لگے۔ الطاف حسین پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ ہمیشہ مہاجروں کے مفادات کو سامنے رکھتے اور اقتدار کے لیے کسی بھی قسم کے سودے بازی سے گریز نہ کرتے۔ الطاف حسین حکومتوں کو دیے جانے والے تعاون کے بدلے میں ایم کیو ایم کی طاقت میں اضافہ کا مطالبہ کرتے۔ صرف وزیراعظم نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں الطاف حسین کی وزیراعظم ہاؤس اور وزیراعلیٰ ہاؤس (سندھ) میں پذیرائی کا یہ عالم تھا کہ الطاف حسین اگر کسی پاگل شخص کو بھی حکومت کے پاس نوکری یا دیگر مراعات کے لیے بھیجتے تو اس کو فوراً اس کی من پسند نوکری دے دی جاتی۔ الطاف حسین نے مہاجروں کو ملازمتیں دلوائیں' مہاجروں کو صنعت و تجارت کے شعبوں میں نمایاں مقام دلوایا۔ الطاف حسین کو باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس طرف مائل کیا گیا کہ وہ "جناح پور" کے حوالے سے بات کریں۔ الطاف حسین کو ایشیاء کی مستقبل کی چھوٹی مگر امیر ترین ریاست جناح پور کا خواب دکھایا گیا۔

الطاف حسین کی ذات بھی سنگین نوعیت کے الزامات کی زد میں آئی۔ ایم کیو ایم کے ایک مرکزی رکن اور خصوصی معاون خالد ندیم نے انکشاف کیا کہ الطاف حسین نہ صرف ایک سفاک اور خطرناک انسان ہے بلکہ الطاف حسین نے لاتعداد عورتوں کو بھی جنسی تشدد کا نشانہ بنایا لیکن تشدد کا شکار ہونے والی عورت اور اس کا

خاندان اس خوف کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لیتا کہ زبان کھولنے کی صورت میں شاید الطاف حسین کو نقصان تو نہ پہنچایا جا سکے لیکن ان تمام کو الطاف حسین کے جانثار ختم کر دیں گے۔ خالد ندیم نے الطاف حسین پر الزام لگایا کہ جو مہاجر لڑکیاں ایم کیو ایم کے لیے کام کرنے آتیں الطاف حسین ان میں سے چند کا انتخاب کر لیتے اور جب وہ کسی ایک لڑکی کے لیے اپنے مسلح ساتھیوں کو اشارہ کرتے تو اسی وقت اس بدنصیب لڑکی کو الطاف حسین کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا۔

خالد ندیم نے دعویٰ کیا کہ وہ الطاف حسین کے ذاتی ملازم کی حیثیت سے بھی ان کے قریب رہا۔ الطاف حسین اس کے ذریعے لڑکیوں کو بلایا بلکہ کراچی کی معروف پیشہ ور عورتوں ناہید فاطمہ، شہناز، سلطانہ اور ثریا وغیرہ کو وہ خود الطاف حسین کے لیے لے کر آتا تھا۔ جبکہ ان عورتوں کے گھروں میں بھی الطاف حسین کا آنا جانا تھا۔ خالد ندیم کے مطابق اسلام نبی کے گھر میں کراچی کی حسین و جمیل لڑکیاں الطاف حسین کے سامنے پیش کی جاتی رہیں۔ خالد ندیم نے شعیب عرف شعبی کے قتل کا ذمہ دار بھی الطاف حسین کو ٹھہرایا۔ خالد ندیم کے بقول شعیب عرف شعبی کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے الطاف حسین کو ایک معروف پاپ گلوکارہ کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا اور جب اس سے یہ "گناہ" سرزد ہو گیا تو اس کو محسوس ہو چکا تھا کہ اب اس کی زندگی صرف چند لمحے ہے اس لیے وہ اپنی جان بچانے کے لیے چھپنے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کو اتنی بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا کہ ایسے لوگوں کو عبرت حاصل ہو جو "قائد" کی نجی زندگی میں جھانکنے کی جسارت کرنے کا سوچتے ہیں۔

کراچی میں آپریشن کے دوران جب الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں کے بے شمار جرائم سامنے آنے لگے تو الطاف حسین کو شک گزرا کہ مہاجروں میں سے کچھ لوگ اس کے خلاف ثبوت آپریشن کرنے والی فورسز کو مہیا کر رہے ہیں۔ الطاف حسین نے فوراً ان "غدار مہاجروں" کو سبق سکھانے کے لیے اور آپریشن کرنے والی فورسز کا مقابلہ کرنے کے لیے ایم کیو ایم کے تربیت یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ڈیتھ سکواڈ اور گوریلا گروپ بنا دیئے۔ لاتعداد ایسے افراد نے اس بات کی تصدیق کی کہ الطاف حسین کی براہ راست رہنمائی میں یہ گروپ تیار کیے گئے۔ بعد میں ان گروپوں کے

افراد جب گرفتار ہوئے یا مقابلوں کے دوران مارے گئے تو ان کے بارے میں جو انکشافات سامنے آئے' ان سے مذکورہ بالا انکشافات کی توثیق ہو گئی۔

الطاف حسین نے اتنی مہارت کے ساتھ ایم کیو ایم کے مسلح اور تربیت یافتہ نوجوانوں کو گروپوں کی شکل میں منظم کیا اور ان کے باہمی نیٹ ورک کو اتنا مضبوط کیا کہ صرف ان کا ایک اشارہ ہوتا اور یہ لوگ کراچی میں قیامت برپا کر دیتے۔ جب ان گروپس کو قائد کی طرف سے گرین سگنل موصول ہوتا تو یہ قائد کے بتائے ہوئے ٹارگٹ کو فوراً جا لیتے اور جو بھی سامنے آتا اس کو "آناً فاناً" ختم کر دیتے اور زیادہ تر واقعات میں ایسا بھی ہوتا کہ "غدار" کا گھر بھی جلا دیا جاتا۔ اس کے گھر کا سارا سامان لوٹ لیا جاتا اور اگر اس دوران "غدار" کا کوئی عزیز یا رشتہ دار حتیٰ کہ قریبی دوست بھی سامنے آتا تو اس کو بھی ختم کر دیا جاتا۔ الطاف حسین پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اقتدار کے دور میں خصوصی توجہ دے کر کراچی پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں میں اپنے وفاداروں کی ایک بڑی تعداد کو بھرتی کرایا تھا اور الطاف حسین کے یہ بھرتی کنندہ آپریشن کے دوران الطاف گروپ کی ہر ممکن مدد کرتے رہے۔

بعض اوقات ایسے واقعات بھی سامنے آتے جن میں ایسے لوگ گرفتار ہوئے جو براہ راست الطاف حسین اور ایم کیو ایم کی ہائی کمان سے ہدایات لیتے اور اس پر پوری "ایمانداری" کے ساتھ عمل کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت بھی کرتے رہتے۔ الطاف حسین کے حکم پر ہلاک ہونے والے کی صحیح تعداد کا ابھی تک اندازہ نہیں لگایا جا سکا کیونکہ یہ عمل آج بھی پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

الطاف حسین نے جو بڑے بڑے اور تربیت یافتہ گروپ تشکیل دیے ان میں کوبرا گروپ' ریحان کانا گروپ' فاروق دادا گروپ' نعیم شری گروپ وغیرہ نے بہت شہرت حاصل کی۔ الطاف حسین پر الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ ان گروپوں کے سرکردہ افراد کو براہ راست ہدایات دیتے اور پھر ان کے ذریعے حقیقی گروپ اور کراچی میں آپریشن کرنے والی فورسز کے علاوہ الطاف گروپ کے غداروں کو قتل کراتے۔ یہ گروپ قائد

کی ہدایت پر اپنے مخالفین کو بھون کر رکھ دیتے اور بڑے پیمانے پر لوٹ مار کرتے۔ ذرائع یہ الزام بھی لگاتے رہے کہ ان قاتل گروپوں کو حاصل ہونے والی بھتہ کی رقم میں سے ایک بڑا حصہ الطاف حسین کو بھی پہنچتا رہا۔ ایم کیو ایم (الطاف گروپ) کے ان دہشت گردوں کو جدید ترین اسلحہ اور مواصلات کے بہترین آلات میسر ہوتے جس کی مدد سے یہ فوج' رینجرز اور پولیس وغیرہ کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کرتے۔

چودھری نثار علی اور جام صادق علی کی صورت میں الطاف حسین کو ایسے دو طاقتور افراد کی پوری مدد حاصل رہی جو الطاف حسین کو کسی بھی متوقع خطرے کی بروقت اطلاع کر دیا کرتے۔ چودھری نثار علی اور جام صادق حسین پر الزام لگایا جاتا رہا کہ ان دونوں نے الطاف حسین کو فوجی آپریشن کی قبل از وقت اطلاع دے دی تھی اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ چپکے سے علاج کے بہانے لندن روانہ ہو جائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں جب تک حالات بالکل "پرسکون" نہیں ہو جاتے۔ ایک مرتبہ جب الطاف حسین پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ عباسی شہید ہسپتال میں زیر علاج تھے' چودھری نثار علی اور جام صادق علی نے ان کی بہت زیادہ مدد کی اور ملک سے چلے جانے کا مشورہ دیا جس پر الطاف حسین نے فوری عمل کیا اور لندن جا کر بیٹھ گئے۔

اس طرح الطاف حسین کی ذات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ کس طرح انہوں نے محض ذاتی اختلافات اور ذاتی مفادات کی خاطر ہنستے بستے شہر کراچی اور حیدر آباد میں زندگی اجیرن کر کے رکھ دی اور لاتعداد ایسے بے گناہ لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جن کے بارے میں الطاف کو شک تھا کہ وہ ان کے خلاف سرگرم ہیں اور وہ ایم کیو ایم سے غداری کر رہے ہیں۔ ایم کیو ایم (الطاف گروپ) اور ایم کیو ایم (حقیقی گروپ) کی باہمی لڑائی میں بھی سینکڑوں لوگ مارے گئے جو محض الطاف حسین اور آفاق احمد وغیرہ کی دشمنی کی بھینٹ چڑھے۔

الطاف حسین پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے کراچی میں قتل و غارت اور بدامنی کا پودا لگایا اور پھر اس "پابندی" کے ساتھ اس پودے کو پانی اور خوراک مہیا کی کہ کراچی خون میں نہا گیا۔ خود الطاف حسین کے قریبی عزیز بھی اس جنگ میں

مارے گئے۔ الطاف حسین کی سرپرستی میں ایسے جرائم پیشہ لوگ متعارف ہوئے جنہوں نے اپنے مخالفین کا قلع قمع کر دیا۔ فوج اور رینجرز کے آپریشن کے دوران درجنوں سرکاری اہل کاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک طویل عرصے تک کراچی میں بوری بند لاشیں دریافت ہوتی رہیں۔ "پیر صاحب" لندن میں بیٹھے اپنی "قوم" سے خطاب کرتے رہے اور انہیں ذرا بھر بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کس سمت جا رہے ہیں اور ان کی شروع کردہ اس لڑائی میں کتنے بے گناہ اور غریب لوگوں کی زندگیاں جاتی رہیں۔

بے نظیر بھٹو کے دوسری بار اقتدار میں آنے کے بعد کراچی میں جتنا خون خرابا ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ الطاف حسین آئے روز ہڑتال کی کال دے دیتے اور پورا شہر ویران ہو جاتا۔ بوری بند لاشیں بڑی تعداد میں ملنے لگیں اور جب یہ نعرہ کراچی کے در و دیوار پر لکھ دیا گیا کہ "جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے"۔ الطاف حسین کی شخصیت اور کراچی کی ابتری کے بارے میں اگر ریسرچ کی جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ درجن کے قریب کتب تیار ہو جائیں۔ ۹۷ء میں قائم ہونے والی نواز شریف حکومت کو بھی جو ایم کیو ایم کی اتحادی ہے' جتنا خوف کراچی اور الطاف حسین سے آ رہا ہے' اس کا محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وزیراعظم نواز شریف ابھی تک کراچی میں امن قائم کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کر سکے اور وہ سلسلہ جو بے نظیر حکومت کے خاتمے پر رک گیا تھا' ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا ہے۔

امیر محمد خان

ملک امیر محمد نواب محمد اجار کے صاحبزادے تھے اور اپنے چچا ملک عطا محمد کی وفات کے بعد نواب آف کالا باغ بنے۔ ان کے خاندان نے ۱۸۵۷ء میں دوسرے جاگیرداروں کی طرح کردار ادا کیا۔ مظفر خان نے ہزاروں جانثاروں پر مشتمل ایک دستہ انگریز کمانڈر ایڈورڈ کی کمان میں دیا۔ اس کے ساتھ جنگ افغانستان میں گھوڑے اور اونٹ مہیا کیے۔ ان خدمات کے صلے میں کالا باغ کو کانوں کے ٹھیکے اور عیسیٰ خیل اور میانوالی کی جاگیریں بخشی گئیں۔ ملک عطا محمد نے عالمی جنگ میں انگریز سرکار کو ایک لاکھ روپے اور ہزاروں سپاہیوں کا تحفہ پیش کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ملک عطا محمد کی وفات پر ملک امیر محمد رئیس آف کالا باغ بنائے گئے۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار عبدالستار نیازی کی حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد امیر محمد سیاست میں باقاعدہ دلچسپی لینے لگے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ کر پنجاب اسمبلی کے ممبر بنے۔

جب ایوب خان نے ملک امیر محمد کو گورنر بنایا تو انہوں نے بڑے روایتی شاہانہ انداز میں حکومتی معاملات چلائے' جس سے ان کے جابر اور ظالم ہونے کا تاثر ابھرا۔ ان کے اپنے علاقے میں قتل و غارت گری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ گورنر بننے کے بعد روحتی امور ان کے بیٹوں کے سپرد ہو گئے' جنہوں نے اپنے باپ کی گورنری سے انتہائی ناجائز فائدہ اٹھایا۔

نواب امیر محمد خان جب گورنر نامزد ہوئے تو انہوں نے اپنے علاقے کی تمام

زمینیں اور مکان اپنے نام کروا لیے۔ علاقے کے تمام دکانداروں سے وہ کرایہ وصول کرتے تھے۔ کسی شخص کو اپنا ذاتی مکان بنانے کا حق نہ تھا اور نہ ہی کوئی زمین خرید سکتا تھا۔ نواب صاحب کے ظلم کی انتہا یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص کو گھر میں مہمان رکھنے کے لیے اجازت لینا پڑتی تھی اور اجازت نہ ملنے کی صورت میں مہمان کو واپس بھیجنا پڑتا تھا۔ لوگوں کو اپنے بچوں کی شادی کرنے کے لیے بھی نواب صاحب سے پیشگی اجازت لینا پڑتی تھی۔ اگر کوئی نواب صاحب کی اجازت کے بغیر یا ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتا تھا تو نواب صاحب ان کو سزا دیتے تھے۔ نواب صاحب کا اپنی ریاست میں رکھ رکھاؤ پسماندہ بادشاہوں کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ جب بھی ان کی بیگمات کی سواریاں سڑکوں سے گزرتی تھیں تو سڑکیں خالی کروا دی جاتی تھیں۔ ان کی بیگمات کی سواریوں کے آگے مسلح نوجوانوں کا دستہ ہوتا جو راستہ چلتے ہوئے اور رکے ہوئے لوگوں پر لاٹھیوں کی بارش کر دیتے۔ ان کے علاقے میں لوگوں کو بال بنا کر چلنے کی اجازت نہ تھی۔

نواب کالاباغ ملک امیر محمد اتنے ظالم اور خودسر انسان تھے کہ جب وہ برطانیہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس اپنی ریاست آئے تو اپنے ساتھ خاص اور اعلیٰ نسل کے کتے بھی لائے۔ ان کے دروازے پر آئے ہوئے ایک فقیر کو کتے پڑ گئے اور کتوں نے فقیر کو گرا دیا۔ چند لوگوں نے بھاگ کر کتوں کو ڈرایا اور فقیر کو چھڑوایا۔ نواب صاحب یہ سب دیکھ کر غضب میں آ گئے اور انھوں نے لوگوں کو ڈانٹا کہ کتوں کو منع نہیں کرتے' اس سے کتوں میں جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کتوں نے فقیر کو چیر پھاڑ ڈالا۔ ان کی ریاست میں ایک شیعہ گھرانہ رہتا تھا جن کی اپنی ذاتی زمین تھی۔ نواب امیر محمد ان کو مجبور کرتے رہے کہ وہ اپنی زمین فروخت کر دیں۔ ان کے انکار پر اس خاندان کے سربراہ کو میانوالی میں بھرے بازار میں قتل کر دیا گیا اور دن بھر لوگوں میں ایسا خوف طاری رہا کہ کوئی بھی لاش کے قریب نہ گیا اور لاش بازار میں ہی پڑی رہی۔ مان اللہ نیازی کے مطابق انھوں نے ہمت کر کے لاش اٹھائی اور گھر پہنچائی مگر بعد میں کوئی بھی جنازہ پڑھانے پر تیار نہ ہوا جس پر یوسف نامی ایک مولوی کو پستول کی نوک پر جنازہ پڑھانے کے لیے لایا گیا۔

نواب امیر محمد نے اپنی ریاست کے لوگوں کا ہر طرح سے استحصال کیا۔ جب فصلیں پک جاتیں تو سب سے پہلے ان کی فصل بازار پہنچائی جاتی اور ان کی اجناس کی فروخت تک کسی کو اپنی فصل منڈی میں لانے کی اجازت نہ تھی اور یوں لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا کہ کب نواب صاحب کی فصل مارکیٹ میں آئے اور کب لوگ اپنی فصلیں بیچیں۔ نواب صاحب کی حکم عدولی کرنے والوں کو سرعام سزا دی جاتی تھی تاکہ لوگ اس سزا سے خوف کھائیں اور سبق سیکھیں۔ ان کی اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی تھی اور عام آدمی ان کی بسوں کے علاوہ کسی اور کی ٹرانسپورٹ میں سفر نہ کر سکتا تھا۔ لوگ اس علاقے میں اپنی بس یا ٹرک نہیں رکھ سکتے تھے۔ گویا نواب صاحب کو لوگوں کے روزگار پر بھی دسترس تھی۔ وہ جس کام کے کرنے کی اجازت دیتے وہ کاروبار جائز سمجھا جاتا تھا۔ وہ جس کو چاہتے عزت دیتے اور جس کو چاہتے ذلیل کروا دیتے تھے۔ ان کے علاقے کے لوگ انکی دہشت سے ڈرے ڈرے رہتے تھے اور نواب صاحب کو ناراض کرنے والی کوئی بات نہ کرتے تھے۔ عام آدمی کے لیے سیاست میں حصہ لینا اور سیاسی گفتگو کرنا گناہ کا درجہ رکھتا تھا' جس کی عبرتناک سزائیں تھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے میں اپنے جیتے جیتے کسی کو سیاست میں قدم نہ جمانے دیے۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کو سخت انتقام کا نشانہ بناتے تھے۔ اس رویے کا اظہار وہ گورنر بننے کے بعد بھی ملکی سیاست میں کرتے رہے' جہاں وہ اپنے اور ایوب خان کے مخالفین کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیتے تھے۔ اپنے سیاسی مخالفین پیدا ہونے کے خوف سے وہ شعور اور آگہی کے راستے بھی روکتے تھے۔ اپنے علاقے میں انہوں نے کبھی کوئی سکول نہ بننے دیا۔ جب بھی کبھی حکومت علاقے کی پسماندگی کے پیش نظر سکول منظور کرتی تھی تو نواب صاحب کو اس وقت نیند آتی تھی جب وہ سکول کینسل کروا لیتے تھے۔ اگر ان کو پتہ چل جاتا کہ کوئی شخص اپنے بچوں کو تعلیم دلوا رہا ہے تو اس شخص کی شامت آ جاتی۔ علاقے میں نواب صاحب کے مخبروں کا انتہائی مضبوط اور مربوط جال تھا جس کے ذریعے نواب صاحب کو علاقے کی پل پل کی خبر ملتی رہتی تھی۔

نواب صاحب اپنی ولایتی تعلیم کے باوجود پسماندہ جاگیردار تھے۔ انہوں نے ہمیشہ جاگیرداری نظام کو تحفظ دینے کا کام کیا۔ انہوں نے جاگیرداروں کو اکٹھا رکھنے کا

اہتمام کیا۔ ان کے بیٹوں کی شادی بڑے بڑے جاگیرداروں میں ہوئی۔ ان کے ایک بیٹے کی شادی صدر سردار فاروق لغاری کی بہن سے ہوئی۔ جب ان کی گورنری میں صدر ایوب خان نے نام نہاد زرعی اصلاحات کیں تو انہوں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی جاگیروں کو محفوظ کر لیا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے زرعی اصلاحات نافذ کیں تو نواب صاحب نے مزارعوں کے ۱۲۰ خاندانوں کو اپنی جاگیروں سے نکال باہر پھینکا اور راتوں رات سارے مکانات مسمار کر دیئے تھے اور ہزاروں افراد کو بے گھر کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔

جب وہ گورنر بنے تو ان کی مالی بدعنوانیاں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔ ان کے عہد اقتدار میں ان کے کارندوں نے لوٹ مار مچا دی۔ انہوں نے اپنے حواریوں میں تجارتی لائسنس اور ڈپوؤں کے پرمٹ جاری کیے' جس سے نہ صرف مال پانی بنایا گیا بلکہ ایوب خان کی غیر نمائندہ حکومت کو سیاسی بنیاد بھی فراہم کی گئی۔ خود امیر محمد خان کا اپنا کاروبار یٰسین نامی شخص چلاتا تھا اور نواب صاحب نے جب کوکا کولا کی فیکٹری سیالکوٹ میں قائم کی' اس کا لائسنس بھی یٰسین ہی کے نام جاری کروایا گیا۔ اس فیکٹری کے لیے سٹنرل کوآپریٹو بنک سے قرضہ لیا گیا۔ اس قرضے کے لیے نہ تو سیکورٹی دی گئی اور نہ ہی کوئی اور ضمانت۔ اس بینک کا سیکرٹری چوہدری ظہور الٰہی تھا جس نے نواب آف کالا باغ کے کہنے پر قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر قرضے جاری کیے۔ نواب امیر محمد نے روڈ کمپنیوں کو انشورنس کمپنی بھی دی۔

نواب امیر محمد کا سیاسی مزاج بھی ان کی جاگیردارانہ مزاج کی عکاسی کرتا تھا۔ اگر کوئی ملکی سیاست دان ان کے مزاج کے خلاف بات کرتا تو وہ آگ بگولا ہو جاتے۔ سیاستدان تو سیاستدان وہ قابل احترام استادوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے۔ جب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل نے ان کی کسی غیر قانونی بات کو ماننے سے انکار کیا' تو ان کو گورنر ہاؤس طلب کیا گیا اور نواب امیر محمد نے اپنے عہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ڈاکٹر کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ڈاکٹر اس قدر نفیس اور مہذب طبیعت کے آدمی تھے کہ وہ اس طمانچے کی تاب نہ لا سکے اور چند دن بعد وفات پا گئے۔ یہی حال وہ سیاسی راہنماؤں کا کرتے تھے۔ تو چونکہ ایوب خان کے گورنر تھے' اس لیے محترمہ

فاطمہ جناح نے جب ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑا تو نواب صاحب نے فاطمہ جناح کے حامیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور جبر و دھاندلی سے مغربی پاکستان میں محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دی۔ وہ ایوب خان کے بہت قریبی آدمی تھے اور ایوب خان ان پر اندھا دھند اعتماد کرتے تھے۔ اپنی اس حیثیت کو بچا رکھنے کے لیے ملک امیر محمد کسی اور سیاسی راہنما کو ایوب خان کے قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ خاص طور پر وہ میاں ممتاز دولتانہ سے بہت زیادہ خائف تھے۔

نواب "کالا باغ" جاگیرداری روایت نبھاتے ہوئے دوستوں کی بہت خاطر مدارت کرتے تھے اور اگر دوست ناراض ہو جائے یا خود نواب صاحب اس سے ناراض ہو جاتے تو انتقام کی تمام حدیں پار کر جاتے۔ ان کے عہد میں پولیس مقابلے بہت ہوتے تھے جس میں اکثر و بیشتر نواب صاحب کے مخالفین مار دیئے جاتے تھے۔ چوہدری ظہور الٰہی گورنر صاحب کے قریبی اور گہرے دوستوں میں سے تھے اور نواب صاحب اکثر بیشتر ان سے صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔ جب ظہور الٰہی سے وہ ناراض ہوگئے تو انہوں نے چوہدری صاحب کا گھر تک بیچ دیا اور انھیں سیاسی طور پر اپاہج بنا دیا۔ وہ اپنے مخالفین کو چھوٹا کرنے کے لیے مدمقابل شخص کی حمایت شروع کر دیتے تھے۔ جو لوگ نواب صاحب کی گورنری میں زیر عتاب رہے' ان میں ایبڈو کے تمام سیاستدانوں کے علاوہ سردار شوکت حیات' مولانا محمد اکبر خان' عبدالستار نیازی' چوہدری محمد حسین چٹھہ' میاں عبدالباری' سید شاہنواز کرمانی' چوہدری جلال دین' ملک سرفراز آف خوشاب اور چوہدری محمد احسن علیگ شامل ہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ کے دوست خاص طور پر نواب صاحب کے انتقام کا شکار ہوتے رہے۔

نواب صاحب نے سیاسی مخالفین کو انتہائی پراسرار انداز میں قتل کروایا اور جب موصوف خود گورنری سے الگ ہو کر اپنے علاقے میں گئے تو اتنے پراسرار انداز میں قتل کر دیئے گئے کہ ان کے قتل کا الزام ان کے بیٹے ملک اسد پر لگایا گیا۔ ان کے مرنے پر ان کی عدم مقبولیت کھل گئی۔ موصوف کے جنازے میں چند گنے چنے لوگوں نے شرکت کی۔

اظہر سہیل

ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروز والہ کے قصبہ "نارنگ منڈی" کے رہائشی عبدالستار کھوکھر نے اظہر سہیل تک کا سفر کیسے طے کیا اور مقتدر افراد کی کاسہ لیسی سے کروڑوں روپیہ کیسے کمایا' یہ ایک دلچسپ اور حیران کن داستان ہے۔ اس داستان میں اظہر سہیل کی زندگی اور مزاج کا ہر وہ پہلو شامل ہے جو اسے اقتدار کے قریب لے جاتا ہے اور پھر اظہر سہیل اپنی فطرتی چالاکی اور مزاج میں رچی بدعنوانیوں کو بروئے کار لا کر فوائد حاصل کرتا رہا۔

عبدالستار کھوکھر المعروف اظہر سہیل نے مذکورہ بالا "فنی مہارت" کو استعمال کرتے ہوئے گزشتہ تقریباً دو دہائیوں میں ہر حکمران جماعت کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کیے اور اس طرح بے پناہ مالی فوائد کشید کیے کہ پاکستان کی تاریخ میں اس نوعیت کی مثال تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

اظہر سہیل نے میاں نواز شریف' پیر پگاڑا' فاروق لغاری' خفیہ ایجنسیوں اور محترمہ بے نظیر سمیت ان کے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ اپنے تعلقات اس پختگی کے ساتھ استوار کیے کہ ان مذکورہ بالا افراد کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اظہر سہیل کو کھل کھیلنے کا مواقع فراہم نہ کریں۔ برسر اقتدار لوگوں سے قائم تعلقات کے سہارے' خفیہ ایجنسیوں کے پے رول پر کام کر کے اور آخر میں سرکاری خبر رساں ایجنسی اے پی پی (APP) کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے اظہر سہیل نے اتنی

دولت جمع کرلی کہ اس سے خاندانی رئیس اور جاگیردار بھی پیچھے رہ گئے۔ اظہر سہیل کی دولت مندی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ اس نے ڈائریکٹر جنرل (APP) کی حیثیت سے اسلام آباد کے مہنگے ترین رہائشی علاقے آئی ایٹ تھری میں جو گھر تعمیر کرایا صرف اس گھر کی تعمیر پر ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

عبدالستار المعروف اظہر سہیل ۲ جون ۱۹۴۹ء کو شیخوپورہ کی تحصیل فیروزوالہ کے ایک گاؤں نارنگ منڈی کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم نارنگ منڈی سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد اظہر سہیل لاہور چلا آیا اور اپنے تعلیمی اخراجات چلانے کے لیے اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوگیا۔ اظہر سہیل جمعیت کے عہدے داروں کی نظروں سے بچ کر جمعیت کے نام پر ایسے کام کرنے لگا جس سے اس کو معقول آمدنی ہو جاتی۔ اظہر سہیل بیرون لاہور سے آئے طالب علموں سے پیسے وصول کر کے ان کی رہائش کا بندوبست کرتا اور جمعیت کے نام پر مجبور لوگوں سے پیسے وصول کرتا رہا۔ اسی دوران اظہر سہیل کو طالب علموں سے پیسے وصول کرنے کی پاداش میں جمعیت سے نکال دیا گیا۔ جمعیت کے اس وقت کے رہنما مخدوم جاوید ہاشمی نے خصوصی طور پر کارروائی کرتے ہوئے اظہر سہیل کو جمعیت سے برخاست کیا کیونکہ جاوید ہاشمی کو لاتعداد ایسی شکایات موصول ہوئی تھیں جن میں اظہر سہیل کے "کارناموں" کا ذکر تھا۔

جمعیت سے نکالے جانے کے بعد اظہر سہیل نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسی دوران اس نے اس زمانے کے معتبر جریدے "چٹان" میں نوکری کے لیے بھی کوشش کی اور "چٹان" کے ایڈیٹر آغا شورش (مرحوم) نے اظہر سہیل کو اپنے پرچے میں پروف ریڈر کے طور پر رکھ لیا۔ اظہر سہیل کچھ عرصہ "چٹان" میں ملازمت کرتا رہا۔ اس دوران اس نے صوبائی حکومت میں اپنے تعلقات بنانا شروع کیے۔ اظہر سہیل کی کوششیں رنگ لائیں اور اسے صوبائی محکمہ خوراک وزارت میں پبلک ریلیشنگ آفیسر (PRO) کی نوکری مل گئی اور اس نے "چٹان" کی ملازمت چھوڑ دی۔ پی آر او کی ملازمت کے دوران اظہر سہیل نے سرکاری سطح پر بدعنوانیاں شروع کیں اور محکمہ کے بدعنوان افسران کے ساتھ مل کر بے قاعدگیاں کرنے لگا۔ اظہر

سہیل کی بدعنوانیوں کی شکایات اس قدر زیادہ ہو گئیں کہ بالآخر ۱۹۸۸ء میں اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔

اس نوکری کے خاتمے کے بعد اظہر سہیل نے لمبا ہاتھ مارنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی اور لاہور کو چھوڑ کر اسلام آباد چلا آیا۔ اسلام آباد میں اظہر سہیل نے ایک بار پھر کسی وفاقی محکمے میں پی آر او (PRO) کی ملازمت تلاش کی اور ہاؤسنگ کے وزیر ناصر رضوی کے ساتھ بطور (PRO) منسلک ہو گیا۔ اظہر سہیل نے ہاؤسنگ کے پی آر او کی حیثیت سے اپنی بدعنوانیوں کا آغاز کیا اور ہاؤسنگ کے محکمہ میں زیر التوا معاملات کو حل کرانے کے لیے سائلوں سے رشوت وصول کرنے لگا۔ اظہر سہیل پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے پی آر او ہاؤسنگ کی حیثیت سے درجن کے قریب لوگوں کو محکمہ میں بھرتی کرایا اور ان سے ۱۰ ہزار روپے فی کس کے حساب سے رشوت وصول کی۔ جب محکمہ سے کنٹریکٹ والے ملازمین کو فارغ کیا گیا تو اظہر سہیل کی بھی چھٹی ہو گئی اور اس طرح ایک بار پھر اظہر سہیل "بے روزگار" ہو گیا۔ اس کے بعد انور عزیز چودھری لائیو سٹاک بورڈ کے چیئرمین بنے۔ اظہر سہیل نے ایک بار پھر پی آر او بننے کے لیے سفارشیں تلاش کرنا شروع کر دیں اور بالآخر یہ نوکری بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہاں بھی موصوف نے وہی وطیرہ اختیار کیا جو اس سے پہلے ہاؤسنگ میں کر چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس جگہ سے بھی انہیں "جواب" مل گیا۔

اب نوکری حاصل کرنے کے لیے اظہر سہیل نے "جسارت" کے راولپنڈی میں بیورو چیف مختار حسن کی منت سماجت کی۔ مختار حسن نے بہت کوشش کی لیکن اظہر سہیل کے لیے نوکری پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ انہی دنوں اظہر سہیل نے ایک اور صحافی سعود ساحر سے درخواست کی کہ وہ ان کی نوکری کے لیے کوشش کریں۔ لہٰذا مختار حسن اور سعود ساحر کی کوششوں سے ہاؤسنگ کے وزیر فدا محمد خان نے اظہر سہیل کو کنٹریکٹ پر اپنا پی آر او PRO بھرتی کر لیا۔ اظہر سہیل کو F-6/1 میں ایک سرکاری رہائش گاہ بھی مل گئی اور یوں اس نے دوبارہ پر پرزے نکالنے شروع کیے اور فدا محمد خان کا نام استعمال کر کے رشوت وصول کرنے لگا۔ تقریباً ۹ ماہ بعد جب یہ کابینہ

ختم ہوئی تو ساتھ ہی اظہر سہیل کو بھی نوکری سے نکال دیا گیا اور سرکاری رہائش گاہ بھی چھن گئی۔

ایک بار پھر اظہر سہیل بے روزگار ہو گیا ور ساتھ ہی بے گھر بھی۔ اظہر سہیل کی اس کسمپرسی کو دیکھتے ہوئے وفاقی محکمہ خوراک و زراعت میں تعینات اس وقت کے ایک ڈپٹی سیکرٹری حاجی یوسف نے اسے اپنے سرکاری گھر میں رکھ لیا۔ چونکہ حاجی یوسف ایک بہت بڑے گھر میں اکیلے رہتے تھے اس لیے انہوں نے اظہر سہیل کو پیشکش کی کہ وہ اپنے خاندان کو بھی س گھر میں لے آئے اور جتنی دیر ان کی اس محکمہ میں نوکری ہے وہ بغیر کرایہ ادا کیے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہ سکتا ہے۔

انہی دنوں روزنامہ جنگ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر شورش ملک کے ساتھ اظہر سہیل نے اپنے تعلقات استوار کر لیے اور ان کی سفارش سے جنگ کے میگزین میں نوکری حاصل کر لی۔ یہاں سے اظہر سہیل کا اقتدار کی ایوانوں میں داخلہ شروع ہوتا ہے۔ انہی دنوں سعودی عرب کے شہر طائف میں ایک کانفرنس ہو رہی تھی جس میں اس وقت کے حکمران جنرل ضیاء الحق بھی شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے شورش ملک کو دعوت ملی کہ وہ جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ طائف جانے والے صحافیوں میں شامل ہوں لیکن شورش ملک اپنی معروفیات کے باعث خود تو طائف نہ جا سکے لیکن انہوں نے اظہر سہیل کا نام بھیج دیا۔ لہٰذا اظہر سہیل کو طائف جانے والوں میں شامل کر لیا گیا۔

طائف کانفرنس کی کوریج کے دوران اظہر سہیل نے جو رپورٹیں جنگ کو ارسال کیں، انہیں اخبار میں "فلیش" کیا گیا اور اخبار کے مالکان نے اظہر سہیل کی اس کارکردگی کو بہت سراہا۔ طائف سے واپسی پر اظہر سہیل کراچی رک گیا جہاں جنگ کے چیف ایڈیٹر میر خلیل الرحمٰن (مرحوم) نے اس کی رپورٹنگ کی تعریف کی۔ جب اظہر سہیل واپس راولپنڈی پہنچا تو اس نے آتے ہی شورش ملک کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ "شورش ملک کیا چیز ہے اور کس باغ کی مولی ہے، میرے تو براہ راست تعلقات میر خلیل الرحمٰن کے ساتھ ہیں"۔ اظہر سہیل کی

اس واردات سے شورش ملک کو بہت صدمہ ہوا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

اس دوران اظہر سہیل کے تعلقات اسلام آباد کی سرکاری ہستا کے ساتھ بھی بننے لگے اور اظہر سہیل بیورو کریسی کے قریب ہوتے چلے گئے۔ اظہر سہیل نے جناح مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور "سرکاری تعلق داروں" سے گھر کا ضروری سامان طلب کرنے لگا۔ اظہر سہیل پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے کسی سرکاری آفیسر سے صوفہ وصول کیا' کسی سے قالین مانگا اور اس طرح اپنے فلیٹ کی حالت بدل دی۔

اپنی چرب زبانی کے باعث اظہر سہیل دو تین برسوں میں ضیاء الحق کے قریب آ گیا اور ضیاء الحق کی قربت سے اپنی دنیا سنوارنے لگا۔ بیرون ملک دوروں اور لوگوں کی درخواستوں پر اعلیٰ حکام کے دستخط حاصل کرنے کے ذریعے موصوف نے بے شمار دولت اکٹھی کی۔ پیسے وصول کر کے لوگوں کو ملازمتیں دلوانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۶ء میں اظہر سہیل نے ضیاء الحق سے درخواست کی کہ انھیں لاہور میں ایک پلاٹ دیا جائے۔ ضیاء الحق نے اسے اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب کے پاس بھیجا جنہوں نے اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواست پر سبزہ زار سکیم میں ایک پلاٹ الاٹ کر دیا۔ بعد میں یہ پلاٹ اس نے کوشش کر کے مزید قیمتی جگہ تبدیل کرا لیا۔

اظہر سہیل کے لیے اس پلاٹ کی الاٹ منٹ میں اس کے بھائی اطہر مسعود نے بھی اہم کردار ادا کیا جو کہ اس وقت روزنامہ جنگ لاہور کے چیف نیوز ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کا رعب بھی خوب استعمال کیا اور لاہور کی انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر یہ پلاٹ جلد از جلد الاٹ کروا لیا۔

انہی دنوں اظہر سہیل نے وزارت داخلہ کے اعلیٰ افسران سے دوستی قائم کی اور اپنے آبائی ضلع شیخوپورہ کے رہائشی لوگوں کو بھاری رشوت وصول کر کے پولیس میں بھرتی کرانا شروع کیا۔ ان کے قصبہ نارنگ منڈی کے رہائشیوں کے بقول اظہر سہیل ہر ماہ نارنگ منڈی آتا اور میٹرک اور ایف۔ اے پاس لڑکوں کو اکٹھا کر لیتا۔ انہیں بتاتا کہ پولیس کی ملازمت کتنی نفع بخش چیز ہے اور اگر وہ کہیں سے قرض لے

کر بھی چالیس پچاس ہزار روپیہ اکٹھا کر کے اسے دے دیں تو وہ انھیں چند ہفتوں میں پولیس کی ملازمت دلوا دے گا اور پھر وہ لوگ پہلے ہی برس اپنی بھرتی کے لیے ادا کردہ رقم واپس کما لیں گے۔ اظہر سہیل پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے لاتعداد ایسے لوگوں سے بھی پیسے وصول کر لیے جو بعد میں بعض اعتراضات کے باعث بھرتی نہ کیے جا سکے اور ان لوگوں کی رقوم انھیں واپس نہ کی گئیں۔

اظہر سہیل کے لیے پہلی "سودمند شخصیت" جنرل ضیاء الحق کی ذات ثابت ہوئی۔ اظہر سہیل نے مختلف حیلے بہانوں سے ضیاء الحق سے مراعات حاصل کرنا شروع کیں۔ اس دوران اس کا کردار ایک ٹاؤٹ کا سا بھی رہا جو گاہے بگاہے ضیاء الحق سے ناراض سیاست دانوں کو قائل کر کے ضیاء الحق کی خدمت میں پیش کر دیتا اور ضیاء الحق کو یقین دلاتا کہ یہ شخص کبھی بھی آپ سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ ان حرکتوں کے بعد وہ جنرل ضیاء الحق سے مختلف قسم کے فوائد حاصل کرتا رہا۔

اظہر سہیل کے لیے دوسری فائدہ بخش شخصیت سندھ کے پیر پگاڑا کی تھی۔ اظہر سہیل پیر صاحب کی قربت سے طویل عرصے تک فیض یاب ہوتا رہا اور پیر صاحب پگاڑا کو تقریباً دس سال تک "فروخت" کرتا رہا۔ اظہر سہیل پیر پگاڑا پر ظاہر کرتا رہا کہ وہ ان کا خاص چاہنے والا ہے لیکن اصل میں وہ پیر صاحب پگاڑا کی جاسوسی کرتا رہا۔ آئی بی کے بریگیڈیئر امتیاز اور میجر عامر کے لیے اظہر سہیل نے کام کیا۔ اس دوران اس "مخبر گیری" کے عوض میں اظہر سہیل مذکورہ خفیہ ایجنسی سے بھاری "ماہانہ" وصول کرتا رہا۔

میاں نواز شریف جب وزیر اعلیٰ بنے تو ان میں اور پیر صاحب پگاڑا میں کچھ غلط فہمیاں اور اختلافات پیدا ہو گئے۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے اظہر سہیل وزیر اعلیٰ کے بھی قریب تھا۔ نواز شریف نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ پیر صاحب پگاڑا کی سرگرمیوں کی اطلاع انھیں دیتا رہے۔ اس خدمت کے صلے میں اظہر سہیل نے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف سے بھی ایک قیمتی پلاٹ طلب کیا جو اسے بخوشی عطا کر دیا گیا۔ پیر پگاڑا کے ساتھ مل کر اظہر سہیل نے نواز شریف کو ڈبل کراس کیا اور جب پنجاب میں چودھری پرویز الٰہی اور نواز شریف میں اختلافات پیدا ہو گئے تو اظہر سہیل پیر

پگاڑا کے ساتھ مل کر چودھری پرویز الٰہی کے حمایت پر کمربستہ ہو گیا اور نواز شریف کے خلاف لکھنے لگا۔ اظہر سہیل پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے مذکورہ بالا خدمت کے عوض چودھری خاندان سے ۵ لاکھ روپیہ وصول کیا اور چودھری خاندان کو یقین دلا دیا تھا کہ نواز شریف کے مقابلے میں اسٹیبلشمنٹ ان کے ساتھ ہے اور جلد ہی چودھری پرویز الٰہی میاں نواز شریف کو ناک آوٹ کر دیں گے۔

اسی زمانے میں اظہر سہیل نے ضیاء الحق پر ایک کتاب "جنرل ضیاء کے ۱۱ سال" لکھی۔ اس کتاب میں اظہر سہیل نے صدر ضیاء الحق کے بارے میں جو کچھ لکھا' اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اظہر سہیل کی طبیعت میں ابن الوقتی کو کس قدر دخل حاصل تھا۔ یہ کتاب پڑھ کر ضیاء الحق کے بارے میں تو شاید کچھ فیصلہ کرنا مشکل ہو لیکن پہلے لفظ سے آخری لفظ تک اظہر سہیل کی جو شخصیت ابھرتی ہے' وہ بہت حیران کن اور عبرت ناک ہے۔

اس کے بعد اظہر سہیل کے کردار کا جو رخ شروع ہوتا ہے' وہ بہت حیران کن ہے۔ ۱۹۸۸ء میں بے نظیر حکومت قائم ہوئی تو اظہر سہیل نے دوغلی پالیسی اپنا لی۔ ایک طرف اسلام آباد میں ان کے رابطے حکومتی ایوانوں تک پھیلتے گئے تو دوسری طرف ان کا رابطہ پنجاب میں وزیر اعلیٰ نواز شریف سے بھی قائم تھا۔

بے نظیر سے مرکز میں مراعات حاصل کرتے رہے اور پنجاب میں میاں نواز شریف کو اپنی محبت کا یقین دلاتے رہے اور بے تحاشا فوائد کشید کرتے رہے۔ اظہر سہیل نے میاں نواز شریف کی وزارت اعلیٰ کے دور میں ایک بار پھر پیسے وصول کر کے لوگوں کو بھرتی کرانا شروع کیا اور محکمہ مال سے لے کر ہاوسنگ تک ایک بڑی تعداد کو لاکھوں روپیہ وصول کر کے بھرتی کروا لیا۔

اسی طرح آپریشن مڈ نائٹ جیکالز کے مبینہ کرداروں بریگیڈیئر امتیاز اور میجر عامر کے ساتھ ان کے روابط مستحکم ہوئے اور اظہر سہیل نے خواہش ظاہر کی کہ اگر اس کو آئی بی اپنے پے رول پر لے لے تو وہ ایسی مفید اور خفیہ معلومات آئی بی کو مہیا کر سکتا ہے جو شاید آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اظہر سہیل نے بے نظیر کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش ہونے سے قبل ارکان اسمبلی کی وفاداریوں کے حوالے

سے انٹیلی جنس بیورو (IB) کو بھاری معاوضے کے عوض بہت سے اطلاعات فراہم کیں۔ میجر عامر نے کئی بار اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اظہر سہیل نے جو معاوضہ وصول کیا اور جو معلومات فراہم کیں ان کی تصدیق ان ٹیپ ریکارڈز سے ہو سکتی ہے جو اس کی تحویل میں ہیں۔

اس دوران پیر پگاڑا صاحب ایک بار پھر اظہر سہیل کی کمائی کا ذریعہ بنے اور اس بار پیر پگاڑا کے بارے میں اطلاعات کی فروخت کا معاہدہ میجر عامر کے ساتھ طے پایا۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے اظہر سہیل پیر صاحب پگاڑا کے بارے میں معلومات میاں نواز شریف کو فراہم کرتے تھے اور بدلے میں بھاری فوائد حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں اظہر سہیل کا شمار ان صحافیوں میں ہوتے لگا جن کے پاس ایک سے زائد گاڑیاں تھیں۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ یہ گاڑیاں انٹیلی جنس بیورو کی تھیں جو انہیں ان کی "خدمات" کے صلہ میں عطا ہوئی تھیں اور جو اظہر سہیل کے اہل خانہ کے بھی استعمال میں تھیں۔

پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو اظہر سہیل ایک دم "بے روزگار" ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے سندھ کے وزیر اعلیٰ جام صادق علی سے تعلقات پیدا کر لیے۔ جام صادق علی سے ملنے والے مالی مفادات کے عوض "سازشوں کا دور" کے عنوان سے اظہر سہیل نے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں اظہر سہیل نے انکشاف کیا کہ بے نظیر بھٹو کی آصف علی زرداری کے ساتھ شادی کا بندوبست مرحوم صدر ضیاء الحق نے کروایا تھا تاکہ مستقبل میں بے نظیر بھٹو کو سیاسی طور پر نقصان پہنچایا جا سکے۔ یہ کتاب چونکہ جام صادق علی کی خصوصی فرمائش پر لکھی گئی تھی لہٰذا اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ اظہر سہیل نے جام صادق علی سے ایک ٹویوٹا گاڑی اور ۳۰ لاکھ روپیہ وصول کیا۔

ایک طرف اظہر سہیل مسلم لیگ کے دسترخوان پر پلتا رہا تو دوسری طرف اپنے ذاتی مفادات کے لیے اس نے پنجاب میں مسلم لیگی وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے ساتھ کشمکش جاری رکھی۔ غلام حیدر وائیں (مرحوم) کے ساتھ اظہر سہیل کا تنازعہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب اظہر سہیل اور اظہر مسعود نے اپنے چھوٹے بھائی

عبدالشکور سب انسپکٹر پولیس کی غلام حیدر وائیں سے سفارش کی کہ اسے انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی جائے۔ غلام حیدر وائیں مرحوم نے عبدالشکور کو انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دینے سے انکار کر دیا کیونکہ عبدالشکور کا قد پولیس کے معیار سے کم تھا۔ دوسری رنجش اس طرح ہوئی کہ سی ڈی اے (CDA) نے اظہر سہیل کا اسلام آباد میں "پیٹے" پر حاصل کردہ پلاٹ پر تعمیر شدہ ہوٹل گرا دیا۔ کہانی اس کی اس طرح ہے کہ اظہر سہیل نے سی ڈی اے کے چیئرمین (سابقہ) علی نواز گردیزی (مرحوم) سے اپنے تعلقات کی بناء پر گرین بیلٹ ایریا میں واقع ایک پلاٹ پٹے پر حاصل کر لیا تھا۔ پٹے پر پلاٹ کے حصول کے بعد اظہر سہیل نے سی ڈی اے سے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا کہ وہ اس جگہ پر ریسٹورنٹ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ قواعد کے مطابق سی ڈی اے مجاز نہ تھی کہ F/6 کے علاقہ میں گرین بیلٹ پر واقع جگہ پر کسی کو کچھ تعمیر کرنے کی اجازت دے لیکن اظہر سہیل کو چونکہ خلاف ضابطہ کام کروانے اور اپنا مطلب نکالنے کا ہنر آتا تھا اس سے اس نے علی نواز گردیزی (مرحوم) کو مجبور کر کے یہ اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔

وائیں حکومت کے دوران جب سی ڈی اے نے اس پلاٹ پر تعمیر شدہ ریسٹورنٹ گرا دیا تو اظہر سہیل کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے جام صادق علی کی گود میں بیٹھ کر نواز شریف حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ محاذ کھول دیا اور جب نواز شریف کی حکومت کا چل چلاؤ نظر آنے لگا تو اظہر سہیل نے فاروق لغاری کی حمایت شروع کر دی اور وزارت عظمیٰ کے لیے فاروق لغاری کو بے نظیر بھٹو سے زیادہ موزوں اور اہل قرار دیا۔ لیکن نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد جب یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب بے نظیر بھٹو دوبارہ وزیراعظم بن جائیں گی تو اظہر سہیل نے بھی پینترہ بدلا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے حق میں روزنامہ "پاکستان" میں کالم نویسی شروع کر دی۔ اپنے کالموں کے ذریعے اظہر سہیل نے "کاسہ لیسی" کی وہ مثال قائم کی کہ جو اس سے پہلے اردو صحافت میں کہیں نظر نہیں آتی۔

اس سے پہلے اظہر سہیل غلام اسحاق خان نواز شریف جھگڑے میں غلام اسحاق خان کے کیمپ میں چلا گیا تھا اور معتبر ذرائع کے مطابق اس نے غلام اسحاق خان سے

بھاری رقم وصول کی اور نواز شریف حکومت کے متعلق گمراہ کن معلومات غلام اسحاق خان اور دیگر مقتدر لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی جھگڑے کے دوران اظہر سہیل کا تعلق بدنام زمانہ عثمان فاروقی اور سلیمان فاروقی سے قائم ہوا جنہوں نے اظہر سہیل کو گاڑی اور موبائل فون خرید کر دیا۔ اسی رابطے سے اظہر سہیل کا تعلق عثمان فاروقی کے ذریعے بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ بھی قائم ہوا اور اس نے آصف علی زرداری کے ساتھ مل کر نواز شریف کے خلاف کام شروع کیا۔ اظہر سہیل کو تعلقات قائم کرنے میں جو مہارت حاصل ہے' اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر وقت اپنے ذاتی مفادات کے لیے کسی بھی مقتدر شخصیت سے تعلقات قائم کرنے کے جتن کرتا رہتا۔ اس دوران اس نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل حمید گل کے ساتھ بھی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی لیکن جنرل حمید گل نے اسے گھاس نہ ڈالی۔

نواز شریف حکومت کو صدر اسحاق نے برطرف کر کے بلخ شیر مزاری کی نگران حکومت بنائی تو اظہر سہیل بلخ شیر مزاری کے قدموں میں جا بیٹھا اور اپنے ہمراہ تین انگریزی صحافیوں کو بھی لے گیا۔ بلخ شیر مزاری نے اس کی مقدور بھر مدد کی اور مستقل تعاون کا یقین دلایا۔ بعض ذرائع یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ بلخ شیر مزاری نے اظہر سہیل کو کروڑوں روپے کا فائدہ پہنچایا۔

۱۹۹۳ء کے انتخابات کے بعد جب ملک میں بے نظیر حکومت قائم ہوئی تو پی پی پی کے خواجہ طارق رحیم (سابق گورنر) نے اظہر سہیل کی ملاقات بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے ساتھ کروائی۔ حکومت میں آنے کے بعد بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری نے ملک بھر کے صحافیوں میں اپنی لابی بنانے کے لیے ایک "ڈس انفرمیشن سیل" بنانے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے پورے ملک کے نامور صحافیوں سے رابطے کیے گئے۔ نوجوان صحافی حامد میر' نصرت جاوید اور شاہین صہبائی کو بھی اس سیل میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ لیکن تینوں صحافیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ واضح رہے کہ اس ڈس انفرمیشن سیل کا سربراہ اظہر سہیل کو بنایا گیا تھا۔ اظہر سہیل نے مذکورہ بالا صحافیوں کو روپے پیسے کا لالچ دیا لیکن اس کو کامیابی حاصل نہ ہو

سکی۔ نتیجتاً اس نے ان صحافیوں سے انتقام لینے کا ارادہ کیا اور ایف آئی اے کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر ممتاز ملک کے ذریعے ایک پریس کانفرنس کرائی جس میں ممتاز ملک نے ملک کے نامور صحافیوں پر نواز شریف دور میں مراعات حاصل کرنے اور انٹیلی جنس بیورو سے گاڑیاں لینے جیسے الزامات لگائے گئے تھے۔ جب ان صحافیوں نے' جن پر ممتاز ملک نے الزامات عائد کیے تھے' وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے احتجاج کیا اور اس کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا تو محترمہ بے نظیر نے جواب دیا کہ یہ پریس کانفرنس اظہر سہیل نے کروائی ہے اور اس کا حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

ممتاز ملک ایم۔ ای ایس کا بھگوڑا انجینئر تھا جو بے نظیر کی پہلی حکومت کے خاتمے کے بعد پاکستان سے ہندوستان اور پھر وہاں سے لندن بھاگا تھا۔ ممتاز ملک کو بھارتی خفیہ ایجنسی "را" نے پاکستان سے بھاگنے میں مدد دی اور اپنے پاس ہندوستان میں پناہ مہیا کی تھی جہاں سے وہ لندن چلا گیا۔ ممتاز ملک کے اظہر سہیل کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے۔ جب بے نظیر دوبارہ برسر اقتدار آئیں تو ممتاز ملک کو اظہر سہیل نے واپس پاکستان بلا لیا اور آصف علی زرداری سے سفارش کر کے اس کو ایف۔ آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر لگوا دیا۔ بعد میں اظہر سہیل نے ممتاز ملک کے ذریعے حکومت کے مخالف تصور کیے جانے والے صحافیوں کے خلاف پریس کانفرنس کروائی۔

اظہر سہیل پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ممتاز ملک کے ساتھ مل کر ایک پلان بنایا۔ پلان یہ تھا کہ بے نظیر بھٹو اور صدر فاروق لغاری کے درمیان اختلافات کو ہوا دی جائے۔ اس پلان کے مطابق اظہر سہیل نے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین سے بھی لندن میں رابطہ کیا اور ذرائع کے مطابق بھاری رقم وصول کی۔ ایم کیو ایم کے الطاف حسین سے رابطے کے بعد اظہر سہیل نے پنجاب میں وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو کے ساتھ رابطہ کیا اور وٹو کے ذریعے نواب زادہ نصراللہ خان اور پھر شہباز شریف تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اظہر سہیل اور ممتاز ملک کے اس پلان کا کھوج آئی بی کے سربراہ مسعود شریف نے لگا لیا اور ساری کہانی بے نظیر بھٹو تک پہنچا دی۔ بے نظیر نے اظہر سہیل اور ممتاز ملک کو طلب کیا اور جھاڑ پلا دی۔ دونوں نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور اس کہانی کو جھوٹ قرار دیا۔

صوبہ پنجاب میں اظہر سہیل نے وزیراعلی وٹو کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ اپنے بھائی اطہر مسعود کے ذریعے وٹو پر دباؤ ڈالا اور نارنگ منڈی کے رہائشی لوگوں کو صوبائی حکومت کے مختلف محکموں میں ملازمتیں دلوا دیں۔ ان ملازمتوں کے عوض اظہر سہیل نے لاکھوں روپیہ کما لیا۔ اظہر سہیل نے آصف زرداری کے ساتھ مل کر صدر مملکت فاروق لغاری اور مخدوم الطاف احمد کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔ اس مقصد کے لیے آئی بی کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ آصف علی زرداری نے اس مقصد کے لیے اظہر سہیل کو ۲ کروڑ روپیہ عنایت کیا گیا اور ایک جدید ترین گاڑی تحفہ میں دی۔ اس دوران اظہر سہیل نے مسعود شریف سے رابطہ کیا اور آصف علی زرداری کے ساتھ مل کر صدر مملکت کے اہل خانہ اور ملک کے معروف اخبار نویسوں کے فون ٹیپ کروائے۔

اظہر سہیل کی لوٹ مار اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب آصف علی زرداری نے خصوصی توجہ کے ساتھ اظہر سہیل کو صدارتی تمغہ حسن کارکردگی دلوا دیا۔ اس تمغے کا ملنا تھا کہ اظہر سہیل نے دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس نے پولیس سے لے کر اخبار نویسوں تک کو بلیک میل کیا۔ اخبار نویسوں کو اتنا زیادہ تنگ کر دیا کہ بالآخر اظہر سہیل کو اسلام آباد کے تین صحافیوں کے ہاتھوں باقاعدہ پٹائی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اسی دوران اظہر سہیل نے اسلام آباد کے قیمتی ترین سیکٹروں میں ایک رہائشی اور ایک کمرشل پلاٹ حاصل کر لیا اور ساتھ ہی اے پی پی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے سرکاری ملازمت بھی اختیار کر لی۔

اے پی پی کی ملازمت اظہر سہیل کو اس طرح راس آئی کہ اس نے اس خبر رساں ایجنسی میں اتنی زیادہ مالی بدعنوانیاں کیں کہ تمام بجٹ ختم ہو گیا۔ اظہر سہیل نے مجموعی طور پر ۲۳ کروڑ روپیہ کمایا۔ اظہر سہیل نے اے پی پی کا سارا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا اور چوکیداروں کی بھرتی و تبادلے سے لے کر ڈائریکٹروں کے تبادلوں کے ریٹ مقرر کر دیئے۔ اسی دوران اظہر سہیل کو پی ٹی وی پر ایک پروگرام "مقابل ہے آئینہ" ملا۔ اس پروگرام کے ذریعے اظہر سہیل نے ذاتی دشمنیوں کے بدلے چکائے اور مخالف اخبارات پر روزانہ گرجنے لگا۔ "مقابل ہے آئینہ" پی ٹی وی

کی تاریخ کا واحد پروگرام تھا جس کا فی پروگرام معاوضہ ۱۰ ہزار روپے تھا۔ اس طرح لاکھوں روپیہ صرف اظہر سہیل کے لیے مختص کیا گیا۔ حتیٰ کہ رعنا شیخ جو کہ پی ٹی وی کی ایم ڈی تھیں انہوں نے اظہر سہیل کو ایک لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر کا چیک بھی پیش کر دیا جو اظہر سہیل نے اپنے بینک کے فکس ڈیپارٹ اکاؤنٹ (512۔ 1100 61346) میں جمع کرا دیا۔ رعنا شیخ آج تک اس بہت بڑی رقم کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکیں کہ انہوں نے اتنی بڑی رقم کس کے کہنے پر اظہر سہیل کو دی۔

اظہر سہیل نے اے پی پی میں بھرتیوں کے لیے اپنے بھائیوں کو مقرر کر دیا۔ نارنگ منڈی میں مقیم اظہر سہیل کا ایک بھائی جو ایک مقامی اخبار کا نارنگ منڈی میں نمائندہ بھی تھا' اس نے باقاعدہ ایک دفتر بنا لیا اور لاکھوں روپے وصول کر کے اظہر سہیل کے نام سفارشی خطوط جاری کرنے لگا۔ تقریباً ۵۰ کے قریب نوجوانوں کو اظہر سہیل کے اس بھائی نے اے پی پی میں بھرتی کرایا اور تقریباً ایک کروڑ روپیہ وصول کیا۔ خود اظہر سہیل نے بھی درجنوں لوگوں کو براہ راست پیسے وصول کر کے اے پی پی میں ملازم کروایا۔

اظہر سہیل نے اے پی پی کے ذریعے آصف علی زرداری کا "ڈس انفارمیشن سیل" بھی جاری رکھا اور ہر قومی مسئلے پر انہوں نے گمراہ کن خبروں کی ترسیل جاری رکھی جس کی وجہ سے متعدد غیر جانبدارانہ اخبارات نے اے پی پی کی سروس بند کروا دی۔ ۹۵ء میں جب بری فوج کے سربراہ کی تقرری کا وقت آیا تو اظہر سہیل نے آصف زرداری کے امیدوار جنرل نصیر اختر کے حق میں اخبارات میں پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اظہر سہیل پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے مہران بینک سکینڈل میں صدر فاروق لغاری کے ملوث ہونے کے کاغذات آصف زرداری سے لے کر نواز کھوکھر کے ذریعے نواز شریف تک پہنچائے تھے۔

اپریل ۹۶ء میں "سروسز ٹریول" کے منیجر کی طرف سے وزیر داخلہ کو ایک خط لکھا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ اظہر سہیل نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے عمرے کے ٹکٹ خریدے جن کی مالیت ایک لاکھ ۳۲ ہزار روپے بنتی ہے لیکن ۳ ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود اظہر سہیل نے ادائیگی نہیں کی۔ رقم مانگنے پر اظہر سہیل دھمکیاں

رہتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس نے حال ہی میں اسلام آباد میں چند پلاٹ لیے ہیں جس کے باعث اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔ اظہر سہیل نے اے پی پی میں جو گھپلے کیے' ان سے حاصل ہونے والی رقم کو اس نے غیر ملکی بینکوں میں جمع کرا دیا۔ اسلام آباد کے مہنگے ترین علاقے آئی ایٹ تھری میں ایک عالیشان گھر تعمیر کرایا جس کی صرف تعمیر پر ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ اس مکان میں ۱۰ ایئر کنڈیشنر لگائے گئے جن کی گنجائش اڑھائی ٹن تک ہے۔ پانچ لائنوں والی جدید ترین ٹیلی فون ایکسچینج بھی لگائی گئی جبکہ بیرون ملک سے ٹائلیں منگوا کر لگائی گئیں۔

اپنے اقتدار کے دوران اپنے بیٹے کو مائع گیس کا ٹھیکہ لے کر دیا اور کروڑوں روپے کمائے۔ اظہر سہیل کے بیٹوں نے بھی باپ کی راہ اختیار کی اور ایک دن اس وقت کے وزیر قانون سید اقبال حیدر کے ڈرائیور کو کسی بات پر خفا ہو کر اغواء کر لیا اور اپنے گھر لے گئے۔ اظہر سہیل کو سید اقبال حیدر نے فون کر کے اس واردات کا بتایا تو اظہر سہیل نے غصے میں فون بند کر دیا اور بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اظہر سہیل اس وقت کتنا طاقت ور اور بااثر تھا کہ وزیر قانون اس کے سامنے بے بس و لاچار تھا۔ آج کل اظہر سہیل لندن کے ایک ہسپتال میں زیر علاج ہے اور انگلستان میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس تاک میں ہے کہ کب اس کے ساتھی اقتدار کے قریب آئیں اور وہ دوبارہ اپنی لوٹ مار کی اگلی قسط شروع کر سکے۔

✿

جنرل رانی (اقلیم اختر رانی)

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں دو ایسے کردار گزرے ہیں جن کی نہ تو پہلے کوئی مثال ملتی ہے اور نہ ان کے بعد آنے والے سیاسی کرداروں میں کوئی ان جیسا آیا ہے۔ یہ دونوں کردار صدر یحییٰ خان اور ان کی داشتہ اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے ہیں۔ یحییٰ خان کے دور اقتدار میں اگر کوئی ہستی یحییٰ خان سے بھی طاقتور تھی تو وہ اقلیم اختر رانی عرف جنرل رانی کی تھی۔ اقلیم اختر عرف جنرل رانی یحییٰ خان کی "مزاج شناس" عورت واقع ہوئی اور اس نے یحییٰ خان کے پورے دور اقتدار میں جو "کارہائے نمایاں" سرانجام دیے اور جس طرح اس وقت کی فوجی و سیاسی شخصیات کے ساتھ وقت گزرا اور جس طرح حکومتی معاملات میں اقلیم اختر رانی کا سکہ چلتا رہا' یہ ایک حیران کن اور عجیب و غریب داستان ہے۔ اقلیم اختر رانی نے کئی بار دعویٰ کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو' غلام مصطفیٰ کھر اور دیگر سیاستدان یحییٰ خان اور فوجی حکام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اور ان کی کمزوریوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کے گھر پر باقاعدہ حاضری دیتے رہے اور حتیٰ کہ اس کی منت سماجت بھی کرتے رہے۔ جنرل رانی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ نہ صرف یحییٰ خان کی "خدمت" کیا کرتی تھیں بلکہ اس نے کئی بار ذوالفقار علی بھٹو کے لیے بھی "رنگین شامیں" ترتیب دیں۔

آغا جنرل محمد یحییٰ خان قزلباش اور اقلیم اختر عرف جنرل رانی دو ایسے کردار

ہیں' جنہوں نے پاکستان کی سیاست پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے' یحییٰ خان نے ۱۹۶۹ء میں اقتدار سنبھالا' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کرنے کے بعد رخصت ہوئے' یحییٰ خان دور اقتدار کے تقریباً ۳ برس ایک امر مطلق اور رنگیلے بادشاہ کا دور کہلاتے ہیں' ان کے دور سیاہ میں پاکستان پر بدکار اور بری شہرت کی حامل عورتوں کی حکومت رہی' جن کی رسائی نہ صرف ایوان صدر بلکہ نجی طور پر یحییٰ خان تک تھی' اس دور میں شباب و کباب کی محفلیں سجتی رہیں' طاؤس و رباب اول رہا' ہر سرکاری تقریب میں عورتوں کا اثر و نفوذ رہا' یہاں تک کہ مخصوص اور اہم نوعیت کے قومی اداروں میں عورتوں کی رسائی اس حد تک رہی کہ بعض اہم اور قومی نوعیت کے فیصلوں اور اقدام کا انہیں سب سے پہلے علم ہوا۔ اس صورت حال کی بازگشت بین الاقوامی طور پر بھی سنائی دیتی رہی۔ جس سے پاکستان کی انتہائی بدنامی ہوئی۔

گجرات کے ایک تھانیدار کی بیوی اقلیم اختر عرف جنرل رانی نامی عورت ملک بن کر پاکستان میں دندناتی پھری۔ آغا یحییٰ خان سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے اسلام آباد کے حلقوں میں وہ جنرل رانی کے نام سے معروف تھی۔ یہ عورت ہر تقریب میں جنرل یحییٰ خان کے ساتھ نظر آتی بلکہ وہ ہر تقریب کی "جان محفل" تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بہت سی ساتھی عورتیں تھیں جو اعلیٰ فوجی اور سرکاری افسران کا دل بہلایا کرتی تھیں اور ان سے راہ و رسم پیدا کرتی تھیں۔ جنرل رانی کا یحییٰ خان کے ساتھ جو تعلق خاص تھا' اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے سرکاری افسران اور کروڑ پتی صنعت کار تک جنرل رانی کے اردلی کا کردار ادا کرتے رہے۔ یہ جنرل یحییٰ خان سے اس حد تک مانوس تھی اور یحییٰ خان کی مزاج آشنا تھی کہ ان سے ہر قسم کا جائز و ناجائز کام نکلوا لیتی تھی۔ یحییٰ خان کے دور میں اصل اقتدار کی طاقت دراصل جنرل رانی اور دیگر عورتوں کے ہاتھوں میں رہی۔

جنرل رانی نے یحییٰ خان سے وابستگی کی بنیاد پر جو گل کھلائے' یحییٰ خان نے جس انداز میں رنگیلے بادشاہ کا کردار ادا کیا' ملک و قوم اور معاشرے پر اس کے جو سنگین ترین اثرات مرتب کیے' اس کی رپورٹیں' کہانیاں' واقعات اور تفصیلات سن کر

ہر پاکستانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یحییٰ خان کی ان رنگیلی اور فحش راتوں اور شاموں کی تفصیلات سے ۱۹۷۰-۷۱ء کے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ جنرل رانی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک تیز طراز' نظرباز' موقعہ پرست اور بری شہرت کی حامل عورت تھی۔ اسے یحییٰ خان کی نفسانی خواہشات اور اپنی اہمیت کا بھرپور اندازہ تھا۔ وہ اپنی اور یحییٰ خان کے شب و روز کی تفصیلات اپنے بے تکلف دوستوں اور شراب و کباب کی محفلوں میں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے حکام' افسران اور اعیان مملکت جنرل یحییٰ خان کی اس چہیتی کی چوکھٹ پر سجدہ ریز تھے۔ اقلیم اختر عرف جنرل رانی کہتی تھی:

"یحییٰ خان میں خود غرضی اور منافقت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کی رگوں میں خون نہیں شراب دوڑتی ہے اور مجھے وہ تمام گر آتے ہیں جو اس کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں"۔

کہا جاتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان سے جنرل رانی کے تعلقات ۱۹۶۳ء سے قائم تھے۔ اس بات کا علم یحییٰ خان کے قریبی ساتھیوں' افسروں اور واقف کاروں کو تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یحییٰ خان کی سالگرہ کی ایک تقریب میں جنرل رانی نے ایک بہت بڑا کیک کاٹا۔ اس محفل میں وہ خود اور اپنی ساتھی نوجوان عورتوں کے ساتھ موجود تھی۔ جہاں ہر ایک کے ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ اس محفل میں جو کیک کاٹا گیا' اس پر ایک ٹینک کی تصویر تھی اور اس پر تحریر تھا:

"چھمب اور جوڑیاں مبارک ہو!"

اس محفل ناؤ و نوش میں رانی نے نیم عریاں لباس پہن رکھا تھا اور اس نے شراب کے نشے میں وحشت ہو کر رقص بھی کیا اور بلند آواز میں ایک پنجابی گانا گایا جس پر یحییٰ خان نے اسے ٹوکا اور کہا کہ آہستہ گاؤ! ابھی میں نے ایوب خان سے اقتدار بھی لینا ہے۔ اس وقت یحییٰ خان لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر تھے۔ اس دور میں رانی اور اس کی بیٹیاں سرکاری ٹرانسپورٹ استعمال کیا کرتی تھیں۔ اسی دور میں یحییٰ خان نے جنرل رانی کے کہنے پر ایک ڈاکٹر کو تھپڑ مار دیا تھا۔ جنرل رانی کی ایک بچی کو ہسپتال داخل کرایا گیا۔ جہاں موجود ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں صرف معمولی بخار ہے۔ مزید

تشخیص کی ضرورت نہیں۔ جس پر جنرل رانی ڈاکٹر سے جھگڑ پڑی۔ یحییٰ خان کو پتہ چلا تو وہ ہسپتال آئے اور انتہائی جذباتی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر کو تھپڑ رسید کر دیا اور بعد میں اس ڈاکٹر کا ایک گاؤں میں تبادلہ کر دیا گیا۔

جنرل رانی کا ایوان صدر میں اس حد تک اثر و نفوذ تھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران بڑے بڑے جرنیل جنرل رانی سے معلومات لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ اور محاذوں کی صورت حال کی وضاحت جنرل رانی سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بیشتر جرنیلوں کے ساتھ بھی جنرل رانی کے ذاتی تعلقات تھے اور وہ ٹیلی فون پر ان سے محاذ جنگ کی تفصیلات لیتی رہتی تھی۔

نیوز ویک کا انکشاف

یحییٰ خان کے دور میں بڑی شہرت کی حامل عورتوں کا ایوان صدر میں اثر و رسوخ ایسی شہرت کی حامل عورتوں کی آمد و رفت کی صدائے بازگشت بین الاقوامی سطح پر سنی گئی۔ امریکہ کے ایک رسالے "نیوز ویک" نے یحییٰ خان اور جنرل رانی کے قصوں، تعلقات اور رنگین راتوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی۔ جس کے ساتھ چند ایسی تصاویر بھی شائع کی گئیں جس میں یحییٰ خان جنرل رانی اور دیگر عورتوں کے ساتھ غیر مہذبانہ انداز میں ملوث تھے۔ یحییٰ خان نے اس میگزین کی انتظامیہ کو دھمکی دی کہ اس میگزین کی فروخت پر پاکستان میں پابندی لگا دی جائے گی۔ میگزین کی انتظامیہ نے اس کا قطعاً نوٹس نہ لیا اور چند ہفتوں بعد "بارہ حکمران عورتیں" کے بارے میں ایک مکمل فیچر شائع کر دیا جس میں ان بارہ عورتوں کے نام اور ان کی کرتوتوں کے واقعات دیئے گئے۔ اس فیچر میں کہا گیا کہ یہ بارہ عورتیں ہیں جن کے پاس اس وقت یحییٰ خان کے دل اور پاکستان کی قسمت کی کنجی ہے۔ ان عورتوں میں اقلیم اختر عرف جنرل رانی، اس کی ماں بلقیس خانم، جنرل رانی کی دو بیٹیاں، مسز کے حسین، پشاور کی بیگم سیف اللہ، ایک فلمی اداکارہ اور ایک مقبول مغنیہ وغیرہ کے نام شامل تھے۔ جنرل رانی کے بعض غیر ملکیوں کے ساتھ بھی تعلقات رہے۔ جن میں پاکستان میں تعین ایک بڑے ملک کے سفیر کے ساتھ بھی ذاتی مراسم رہے۔ اس فیچر

میں یہ کہا گیا کہ یہ خواتین فحاشی اور تعلقات کے پردہ میں جاسوسی کا کام بھی کرتی رہیں۔

ایک معروف عورت کو جنرل رانی کے کہنے پر یحییٰ خان نے بیرون ملک سفیر نامزد کر دیا۔ یہ ایک بڑی شہرت کی حامل عورت تھی اور اس کے سیاہ کارناموں سے اسلام آباد کے تمام تر حلقے واقف تھے۔ یہاں تک کہ متعلقہ ملک کے سفیر کو بھی اس عورت کے بارے میں معلوم تھا۔ انہوں نے اپنے ملک کو ایک رپورٹ کے ذریعے مطلع کیا کہ اس نامزد عورت کو قبول نہ کیا جائے۔ یحییٰ خان کو جب علم ہوا تو وہ بڑے سیخ پا ہوئے۔ لیکن کسی غیر ملک کے سفیر کے ساتھ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اس اوباش عورت کے بیٹوں کو پاکستان کے سفارت خانوں کے شعبہ سیاحت کا نگران بنا دیا۔

مسز کے حسین بھی یحییٰ خان کی بے حد منظور نظر تھی۔ یہ عورت بھی تقریباً تمام محفلوں کی جان رہی اور یحییٰ خان اس پر صدقے اور واری رہے۔ اس کے اور جنرل رانی کے مابین رقابت کا جذبہ تھا۔ اور یہ جنرل رانی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ کیونکہ مسز کے حسین جنرل رانی سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔ یحییٰ خان عام طور پر ان دونوں کی موجودگی میں ان کی نوک جھونک کا مزہ لیتے تھے۔ جس میں انتہائی فحش کلامی تک اتر آتی تھیں۔ یحییٰ خان محظوظ ہونے کی خاطر مسز کے حسین کی تعریف کرتے تو ان دونوں کے درمیان لڑائی ہو جاتی۔ ایک مرتبہ جب یہ دونوں عملی طور پر لڑ رہی تھیں اور آپس میں دست و گریباں تھیں تو اس کا علم یحییٰ خان کو ہوا۔ یحییٰ خان اس وقت ایک تقریب میں کسی ملک کے سفیر سے اسناد سفارت لے رہے تھے۔ انہوں نے یہ تقریب ملتوی کر دی اور اطلاع ملتے ہی چلے آئے اور دونوں کی جھڑپ کا مزہ لیتے رہے۔

جب ایسٹ پاکستان میں مکتی باہنی والے حالات بگاڑ رہے تھے' اس دوران یحییٰ خان ناؤ و نوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ یعنی روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ اسی دور میں یحییٰ خان کا پشاور میں بنگلہ تیار ہو رہا تھا۔ راؤ رشید کی کتاب "جو میں نے دیکھا" کے مطابق یہ بنگلہ یحییٰ خان کا تھا مگر اس کے تمام اخراجات سٹینڈرڈ بینک

برداشت کر رہا تھا اور اسے سٹینڈرڈ بینک کے منیجر بنوا رہے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ جب بنگلہ تیار ہو جائے گا تو بینک اسے کرائے پر لے لے گا۔ اس طرح سے جنرل صاحب کی نہ پینگ لگی نہ پھٹکڑی' بنگلہ تیار ہوگیا۔ جانے یحییٰ خان کو کیا سوجھی کہ انہوں نے اس کی ایک افتتاحی تقریب منعقد کر ڈالی۔ اور یہاں ایک پارٹی دی۔ میری رہائش گاہ بالکل اس بنگلے کے سامنے تھی۔ اس بنگلے کے لیے قیمتی فرنیچر' ایئر کنڈیشنر اور تزئین و آرائش کا تمام تر سامان بھی سٹینڈرڈ بینک ہی کے کھاتے سے خریدا گیا۔ اس افتتاحی تقریب کی تیاریاں شروع ہوئیں تو مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان کے جتنے کنجر اور دلے ہیں' وہ مع اہل و عیال یہاں پہنچ گئے ہیں۔ کسی نے کسی ریسٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا تو کسی نے کسی ریسٹ ہاؤس پر۔ اس کے علاوہ جنرل یحییٰ خان کے ذاتی دوست' عورتیں بھی آئیں۔ اور یہاں رات دو بجے تک شراب چلتی رہی اور ہڑ بونگ ہوتا رہا۔

۷۱۔۱۹۷۰ء کے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان اوباش عورتوں کے ذریعے پاکستان میں جاسوسی کا ایک جال پھیلایا گیا۔ یحییٰ خان چونکہ ابتداء ہی سے عورت اور شراب کے رسیا تھے' اس لیے ان کی اس کمزوری سے بھارت نے بھی فائدہ اٹھایا۔ ان دنوں اسلام آباد میں یہ خبریں بھی سنائی جاتی تھیں کہ یحییٰ خان اور اس کی حکومت کے بعض اہم معاملات وقت سے قبل ہی طشت از بام ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس دور میں ایوان صدر اور اس سے متعلق اداروں میں عورتوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد یحییٰ خان کا اقتدار ختم ہوگیا تو ساتھ ہی اقلیم اختر رانی کا "اقتدار" بھی ختم ہوگیا اور فوجی مارشل لاء میں بااثر جنرل رانی سول مارشل لاء میں قطعی بے اثر ہوگئی۔ جنرل رانی کو اس کی رہائش گاہ واقع گجرات میں نظربند کر دیا گیا۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون اے ملک غلام مصطفیٰ کھر جو کبھی "نیازمندی" حاصل کرنے کے لیے اقلیم اختر رانی کے در پر حاضری دیا کرتے تھے' نے یہ حکم جاری کر دیا کہ اقلیم اختر رانی کوئی ایسا بیان جاری نہیں کر سکتی جس سے ملکی سالمیت اور دفاع کو خطرہ لاحق ہو۔ مزید یہ کہ اقلیم اختر کی کوٹھی کے باہر اس وقت تک پولیس تعینات رہے جب تک ڈپٹی کمشنر گجرات اس کو ضروری خیال کریں۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اقلیم اختر

رانی کے گھر کے فون بھی کاٹ دیئے گئے۔ ذرائع ابلاغ نے جنرل رانی کو موضوع بحث بنائے رکھا۔ حتیٰ کہ ٹی وی پر اس کا اور اس کی قریبی سہیلوں کا بڑے بڑے القابات کے ساتھ نام لیا جاتا اور ان کی تصاویر دکھائی جاتیں۔

س دوران جنرل رانی نے بھٹو اور کھر کے لیے بہت فحش الفاظ استعمال کیے اور دعویٰ کیا کہ یہ لوگ میرے آگے پیچھے پھرتے تھے اور آج انہوں نے اس کے گھر پر پولیس بٹھا رکھی ہے۔ رانی جو یحییٰ دور کی طاقتور ترین عورت قرار دی جاتی تھی' اور جسے خوش کرنے کے سبب حکومت نے تربیلا ڈیم پر بھاری ٹھیکہ دیا تھا' متعدد اعلیٰ افسران کو برطرف کیا تھا' اسے فلم بنانے کے لیے لاکھوں روپے دیئے تھے اور سعودی عرب تک کاروبار پھیلانے میں اس کی بہت زیادہ مدد کی تھی' ایک دم بے وقعت قرار دے دی گئی۔

جنرل ایوب خان

محمد ایوب خان ریحانہ ضلع ہزارہ میں ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے جہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں فوج میں کیڈٹ آفیسر سلیکٹ ہوگئے ان کی ٹرانسفر ۱۴ پنجاب رجمنٹ میں ہوگئی۔ جنگ عظیم دوم کے دوران انہوں نے برما کے محاذ پر خدمات سرانجام دیں جنگ کے دوران وہ بٹالین کمانڈر تھے اور بعد میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

۱۹۴۷ء میں ایوب خان سروسز سلیکشن بورڈ کے صدر بنائے گئے مشرقی پاکستان میں فوج کی نگرانی انہوں نے کی۔ ۱۹۴۸ء میں ایوب خان کو جب میجر جنرل بنایا گیا تو وہ ایسٹ پاکستان ڈویژن کے کمانڈر مقرر ہوئے۔

ایوب خان ۱۹۵۰ء میں پاکستانی فوج کے ایڈ جوانٹ مقرر کیے گئے اور ۱۷ جون ۱۹۵۱ء میں پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف بنے۔ ۱۹۵۴ء میں وزارت دفاع کا قلمدان ان کے سپرد کیا گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کو سپریم کمانڈر پاکستان بنا دیا گیا اور ساتھ ہی وزارت دفاع اور امور کشمیر کے محکمے بھی ان کے سپرد کیے گئے۔ تین دن سپریم کمانڈر رہنے کے بعد ایوب خان نے صدر پاکستان کے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ پارلیمانی نظام کے ختم ہونے پر

ایوب خان نے صدارتی نظام کے حق میں ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا اور آئندہ پانچ سالوں کے لیے صدر منتخب ہو گئے۔

۸ جون ۱۹۶۲ء میں ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور سیاسی جماعتیں بحال ہو گئیں۔ ایوب خان نے ۱۹۶۴ء کے الیکشن میں کامیابی حاصل کی اور دوبارہ صدر پاکستان کے عہدے کا حلف ۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء میں اٹھایا۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ملک کے اندر سیاسی فضا میں تبدیلی رونما ہوئی اور ۱۹۶۸ء میں ملک بھر میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہوں نے عوام کو باور کرانے کی کوشش کی کہ میں آئندہ اس عہدے پر دوبارہ نہیں آؤں گا اور لوگوں کے احتجاج پر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ کو اقتدار جنرل محمد یحییٰ خان کے سپرد کر کے خود رخصت پر چلے گئے۔ ایوب خان نے ۲۰ اپریل ۱۹۷۴ء میں اسلام آباد میں وفات پائی اور ان کو آبائی گاؤں ریحانہ میں دفن کیا گیا۔

ایوب خان کے مارشل لاء کو پاکستانی عوام نے محض اس لیے قبول کر لیا کہ وہ نااہل اور بدعنوان سیاست دانوں کی نااہلیوں اور سازشوں سے تنگ آ چکے تھے۔ حالانکہ مارشل لاء کے بعد ان کے بنیادی حقوق بھی سلب کر لیے گئے تھے۔ عوامی سطح پر یہ تاثر مستحکم ہو گیا تھا کہ مارشل لاء کے تحت ملک ترقی کرے گا' عوامی مسائل کا خاتمہ ہو گا اور مجموعی معیار زندگی بلند ہو گا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کا آغاز بھی بہت موافق انداز میں ہوا۔ خصوصاً مغربی پاکستان میں رائے عامہ کی طرف سے مثبت ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ خود فوج میں بھی ایوب خان کی پوزیشن بہت زیادہ مستحکم تھی۔ ایوب خان نے فوری تاثر یہ دیا کہ پاکستان اپنے بیرون ملک تعلقات کے حوالے سے مکمل طور پر امریکہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور یہ امریکی ترقی و خوشحالی کے لیے باعث اطمینان ہے۔ اس طرح ایوب خان کے خیالات خصوصاً خارجہ پالیسی کے حوالے سے اقدامات اسکندر مرزا سے بہت مماثلت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایوب خان کو جلد ہی امریکہ کا اعتماد حاصل ہو گیا۔

اگر پاکستان میں قائم ہونے والی اور قابض ہونے والی حکومتوں کا تقابلی جائزہ

لیا جائے تو ایوب خان کے دور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایوب خان کا دور اقتدار مجموعی طور پر بہتر رہا اور خصوصاً صنعتی ترقی کے لیے بہت سے مفید اقدامات کیے گئے۔ امن و امان کے حوالے سے بھی ایوب خان کو بہت کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایوب خان دور کا المیہ اس وقت شروع ہوا جب ایوب خان کو سیاسی پہلوانوں نے گھیر لیا اور بیورو کریسی اس کے قصیدے پڑھنے لگی۔ ایوب خان کو حتیٰ کہ یہ وقت بھی دیکھنا پڑا کہ وہ خود اپنے بیٹوں کی کرپشن، ظلم اور من مانیوں کی پردہ پوشی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ایوب خان کو اپنے بیٹے گوہر ایوب کی حرکات سے اتنی زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ فوج کی نوکری چھوڑ دے اور صنعت کی طرف توجہ دے۔ لیکن ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء کا راستہ بالکل ہموار کر دیا اور ایسی فضا قائم کر دی کہ یحییٰ خان بھی اسی راستے پر گزر کر اقتدار پر قابض ہوا۔

ایوب خان نے ملکی سیاست دانوں کی طرف رخ کیا تو انہوں نے بالکل یک طرفہ عمل شروع کر دیا اور اپنے ناپسندیدہ سیاست دانوں کو سیاسی عمل سے نکال باہر کرنے کے عملی اقدامات شروع کر دیئے۔ ایوب خان نے سیاسی نااہلیوں کی صورت میں سیاست دانوں کو بے اثر کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ ایوب خان اصل میں اپنے سامنے ایک کھلا سیاسی میدان دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سیاست دانوں کو بدعنوان کہا لیکن جب خود اپنی سیاسی دکانداری چمکانے لگے اور کنونشن لیگ کی بنیاد رکھی تو پھر جاگیردار سیاست دانوں سے روابط بڑھانے شروع کر دیئے۔

اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام معاملات میں بیوروکریسی پوری شدت کے ساتھ شامل ہو گئی اور ایوب خان کو مشورے دینے لگی۔ ایوب خان اپنی سیاسی قوت بڑھانے کے چکر میں تھے۔ انہوں نے بیوروکریسی کے مشورے پر جاگیرداروں کو مراعات اور لامحدود فوائد دینا شروع کر دیئے۔ ایوب خان نے اس بے دردی کے ساتھ ملکی وسائل کو جاگیرداروں پر اور اپنے وفادار بیوروکریٹس پر نچھاور کیا کہ یہ تمام لوگ ایوب خان زندہ باد کے نعرے پیٹنے لگے اور پاکستانی تاریخ کے متنازعہ ترین

صدارتی انتخابات میں ان لوگوں نے ایوب خان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ چوہدری کرلیں کے مشورے پر ایوب خان نے "بنیادی جمہورتوں" کا ڈرامہ رچایا اور اپنی کامیابی کا ایک مضبوط جال بچھا دیا۔

صدارتی انتخابات میں ایوب خان کے لیے راستے ہموار کرنے والوں میں بہاولپور کے مخدوم حمید الدین' رضی شاہ گردیزی' مخدوم سجاد' سجاد حسین قریشی' میجر افضل ڈاہا' محمد امین کانجو' سرگودھا سے میاں خان کلیار' فتح خان ٹوانہ' میاں غلام محمد' میر بلخ شیر مزاری وغیرہ شامل تھے۔ بلخ شیر مزاری ۱۹۶۵ء میں صرف اس لیے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے ڈیرہ غازی خان کی بلدیاتی سیاست میں مزاریوں کو نمائندگی دی جائے۔ حتیٰ کہ پیر آف دیول شریف اس حد تک ایوب خان کی حمایت میں آگے چلے گئے کہ انھوں نے عوام کو خبردار کیا کہ صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ نہ دیں۔ جھنگ سے سردار زادہ ظفر عباس ایڈووکیٹ' مخدوم محمد غوث (فیصل صالح حیات کے والد) مرعلی شاہ کوٹ عیسیٰ' بہاولپور کے سید احمد نواز گردیزی کے علاوہ رائے منصب علی' قصور کے رانا پھول محمد' سردار رشید احمد' انور بھنڈر' سیف اللہ تارڑ' گل حمید روکڑی' لاہور کے چودھری عید محمد' ذوالفقار قزلباش' احمد سعید کرمانی اور معراج خالد وغیرہ ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے اور فوائد حاصل کرتے رہے۔

پنجاب کا کوئی جاگیردار ایسا نہ تھا جس نے ایوب خان کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ساتھ نہ دیا ہو اور بدلے میں اقتدار اور سیاسی رشوت اور مالی فوائد حاصل نہ کیے ہوں۔ ایوب خان نے انتخابات میں ساتھ دینے کے عوض ان لوگوں کو وہ زمینیں واپس کر دیں جو خود اس کی وضع کردہ زرعی اصلاحات کی زد میں آئی تھیں۔ چوہدرو کرلیں بھی ان زمینوں کا ایک بہت بڑا حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ حتیٰ کہ اصلاحات کے تحت جو زمینیں جاگیرداروں اور زمینداروں سے قیمتاً خریدی گئی تھیں' وہ بھی ایوب خان کے حامی بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں میں بانٹ دی گئیں۔

اس دوران کم از کم دو لاکھ سے زائد ایکڑ اراضی ایوب خان دور میں جن سیاست دانوں' جاگیرداروں اور زمینداروں کو دی گئیں' ان میں سلطان محمد چانڈیو' امیر بہاولپور' نواب آف کالا باغ نواب امیر محمد خان اور ان کے چار بیٹے' ملک خضر حیات ٹوانہ' میر صاحب خیرپور' حاجی غلام رسول جتوئی' ایس غلام محمد خان' نواب سر محمد فرید' ایس گل حسن شاہ' کرنل سید عابد حسین (عابدہ حسین کا والد) پیر صاحب رائی شریف' میاں جمال شاہ' میاں غلام محمد فتنگہانہ' نواب محمد مہر خان' کرنل محمد علی نون' میاں محمد سعید قریشی' محمد امین خان' غلام جیلانی خان' خان بہادر سردار دوست محمد' چودھری اصغر علی' ملک فیروز خان نون' سردار احمد نواز خان' ملک حبیب اللہ خان' لیفٹیننٹ کرنل محمد عطاللہ سنبل' چودھری ظفراللہ خان' چودھری اصغر علی خان' مسٹروزیر آغا' غلام دستگیر' میجر جنرل جمالدار' ملک فضل الٰہی ٹوانہ' غلام محی الدین نوازش علی' سردار غلام' سید محمد وارث' سید مبارک علی شاہ' ملک محمد نواز خان' نوابزادہ ملک امیر محمد خان' میاں خدا یار خان' سردار شیر جان خان' صوفی عطا محمد' ایس محمد نواز شاہ' ایس محمد نذر حسین' ایم ممتاز محمد خان دولتانہ' ایم مشتاق محمد خان' میراللہ بخش بیجائیو' میجر شمس الدین' خواجہ محمود خان اخوند' حاجی عبداللطیف' حاجی قلندر بخش' مساۃ بادشاہ زادی' میر غلام محمد اور حاجی علی حسن ماڈی شامل تھے۔

ایوب خان نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔ بارسوخ افراد کو مختلف فوائد بہم پہنچائے۔ انھیں ایوب خان نے درآمدی و برآمدی لائسنس جاری کیے اور صنعتوں کے لیے پرمٹوں سے نوازا گیا۔ ایوب خان نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے سیاست دانوں' سیاسی کارکنوں اور اعلیٰ سرکاری ملازمین سمیت عدلیہ کے عہدیداروں کو بھی بھرپور انداز میں فوائد دیئے۔ پرانی اور نئی کالونیوں کے آباد کاری کے نام پر بہترین زرعی اراضی بانٹ دی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایوب خان نے ۵۰ ہزار ایکڑ سے زائد اراضی الاٹ کر دی۔

جن نئی اور پرانی کالونیوں میں سے اراضی الاٹ کی گئی' ان میں پنجاب کے وسطی علاقے میں سے ۱۰ ہزار ۹ سو ایکڑ' ڈیرہ اسماعیل خان میں سے ۲ ہزار ۲ سو ۴۵

ایکڑ' غلام محمد بیراج میں سے ہزار ایکڑ' گدو بیراج میں سے ۲۸۰۰۰ ایکڑ سے زائد' پنجاب کے مختلف علاقوں میں سے ایک سو پچاس ایکڑ اراضی گورنروں' وزراء اور عدلیہ کے ارکان کو الاٹ کی گئی۔ جنرل ایوب خان کے اپنے اقتدار کی مضبوطی کے لیے جن افراد کو اراضی الاٹ کی' ان کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں:

سپریم کورٹ کے سابق جج مسٹر ایس اے رحمان' سابق گورنر مغربی پاکستان اختر حسین' سابق گورنر مغربی پاکستان میاں امین الدین' سابق جسٹس محمد منیر' سابق جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ مسٹر جسٹس عبدالعزیز سابق جج سپریم کورٹ مسٹر جسٹس بی زیڈ کیکاؤس' سابق مرکزی وزیر داخلہ چوہدری اکبر علی' سابق وزیر مغربی پاکستان خدا بخش بچہ' خان بہادر شیر زمان خان' ایڈیشنل کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان' عبدالرشید خان ایڈیشنل کمشنر ریونیو' کرنل اے ایس بی شاہ چیئرمین پبلک سروس کمیشن کراچی' ایس ایم سید ڈپٹی چیف انجینئر اری گیشن' میاں ناصر احمد سی ایس پی ممبر آف بورڈ آف ریونیو مغربی پاکستان' غلام صادق خان چیف بجلی' ایس اے رحیم پی سی ایس چیئرمین امپروومنٹ ٹرسٹ' ایس اعجاز حسین شاہ سی ایس پی آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی اینٹی کرپشن' ای کے ملک سی ایس پی' اے ایچ قریشی سی ایس پی چیف سیکرٹری' ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن مغربی پاکستان سید حسن' ایس غیاث الدین احمد ایڈیشنل چیف سیکرٹری مغربی پاکستان' آغا محمد علی ڈی آئی جی پولیس' ملک عطا محمد نون ڈی آئی جی پولیس۔

جنرل (ر) کے ایم شیخ' ایس ایف حسن سی ایس پی چیف سیکرٹری مغربی پاکستان' ایم ایم احمد سی ایس پی سیکرٹری وزارت خزانہ' ایم ایوب سی ایس پی' این اے قریشی چیئرمین ریلوے بورڈ' ٹی عبدالحمید سی ایس پی ڈائریکٹر پبلک سروس اکیڈمی' ایم اے مجید سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو' این اے فاروقی سی ایس پی پرسنل سیکرٹری صدر پاکستان' ڈاکٹر ایچ ایم طوسی' غلام فرید ایس پی ساہیوال۔

ایک سو اور بہتر ایکڑ اراضی حاصل کرنے والے خوش نصیبوں میں شیخ عبدالحمید پی سی ایس ایڈیشنل سیکرٹری محکمہ خوراک' میاں غلام صابری سی ایس پی' خان بہادر رشید احمد پی سی ایس' سابق سیکرٹری گورنر مغربی پاکستان' عبدالحمید سی ایس

پی سابق سیکرٹری خوراک' فرزند علی خان پی سی ایس ایڈیشنل کلیم کمشنر' ظہور الحسن سابق ایڈیشنل سیٹلمنٹ قاضی غضنفر حسین ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور' شیخ عبدالکریم ایگزیکٹو انجینئر اری گیشن' اے وحید ڈپٹی سیکرٹری صدر پاکستان ایوب خان' خان عبداللہ خان ایس پی سیالکوٹ' ایس ایس کرانی چیف انجینئر واپڈا' چودھری محمد حسین ڈائریکٹر اینٹی کرپشن' میاں محمد سعداللہ ڈپٹی سیکرٹری مغربی پاکستان۔

گدو بیراج کے علاقہ میں چالیس ایکڑ کے قریب زمین حاصل کرنے والے خوش نصیبوں کے نام درج ذیل ہیں:

پیر محمد ابراہیم چیف انجینئر سول ڈیریز راولپنڈی' آغا ہلالی سی ایس پی کمشنر برائے پاکستان (برطانیہ)' آغا شاہی سی ایس پی وزارت خارجہ' مسٹر جسٹس انعام اللہ خان' جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ' مسٹر ایم ڈبلیو عباس چیف سیکرٹری مغربی پاکستان' مسٹر آئی چوہان سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو' مسٹر ایس آئی حق چیف سیکرٹری' مسٹر ایس ایم شریف صوبائی سیکرٹری تعلیم' مسٹر امیر محمد خان سیکرٹری میر احسن الدین شاہ سی ایس پی' مسٹر ایم سیال ممبر واپڈا' مسٹر مشتاق احمد سی ایس پی جائنٹ سیکرٹری محکمہ خوراک' چودھری محمد افضل صوبائی سیکرٹری مواصلات' میاں انور علی سی ایس پی' مسٹر ایم اے رشید ڈپٹی سیکرٹری پلاننگ میاں عبدالعزیز سیکرٹری مواصلات' مسٹر محمد اسلم خان۔ افغانستان میں پاکستان کا سفیر' ایچ ولی خان' اے رحمان خان بیلجیئم میں پاکستانی سفیر' میر بشیر خان چیف انجینئر محکمہ آب پاشی' مسٹر محمد یعقوب آغا ممبر پبلک سروس کمیشن' خان نجف خان ڈائریکٹر انفورسمنٹ میاں ضیاء الدین سفیر پاکستان' مسٹر ایچ۔ جے اصغر چیف سیکرٹری ری ماڈلنگ' مسٹر محمد افضل کمشنر ترقی زراعت' مسٹر عبدالحمید جنرل منیجر محکمہ بجلی' جسٹس مسعود احمد' ایس عالمگیری ایس پی سیکرٹری' سید نذیر عالم آئی جی پولیس' مسٹر شریف خان چیئرمین مغربی پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ' میاں مظفر احمد چیف انجینئر آب پاشی' میجر جنرل (ر) اکبر خان ممبر روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن۔

جن اعلیٰ عہدے داروں کو ایک سو ساٹھ (۱۶۰) ایکڑ اراضی الاٹ ہوئی:

رانا میاں داد خان جائنٹ سیکرٹری ہوم مغربی پاکستان' ڈاکٹر عبدالستار ڈپٹی

ڈائریکٹر زراعت' سردار غلام فرید خان ڈپٹی کمشنر رحیم یار خان۔

ایوب خان کے پروردہ جن خوش نصیبوں کو ۱۳۰ ایکڑ فی کس اراضی الاٹ ہوئی ان کے نام درج ذیل ہیں:

خان انور خان ڈپٹی سیکرٹری ایڈمنسٹریشن اینڈ کمیشن' شیخ عنایت اللہ سیکشن آفیسر صحت' مسٹر عنایت اللہ خان ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ' سید امیر علی شاہ سیکرٹری صوبائی اسمبلی' سید عباس علی شاہ سپرنٹنڈنٹ پولیس' مسٹر فضل کریم ایگزیکٹو انجینئر آب پاشی' مسٹر ایم ایم اقبال اسسٹنٹ سیکرٹری صوبائی وزارت قانون' مسٹر ممتاز احمد خان' اے آئی جی پولیس' چودھری نیاز علی آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی ریونیو بورڈ' غلام محبوب سبحانی ٹیکنیکل آفیسر گورنر انسپکشن ٹیم' مسٹر الطاف حسن ترمذی' سابق ڈپٹی کمشنر سکھر' چودھری نصیر احمد ورک ڈپٹی سیکرٹری ریونیو' رانا مقبول احمد ڈپٹی سیکرٹری ریونیو بورڈ' ڈاکٹر جی ایم شیخ سیکرٹری پبلک ورکس۔

۱۰۰ ایکڑ اور ۹۹ ایکڑ فی کس کے حساب سے اراضی حاصل کرنے والے سرکاری افسران کے نام ذیل میں ہیں:

مسٹر بشیر احمد اسسٹنٹ سیکرٹری ریونیو بورڈ' چودھری محمد اقبال سیکرٹری مالیات' ایس اکبر احمد کنٹرولر امتحانات تعلیمی بورڈ لاہور' ایس فتح علی خان سیکشن آفیسر سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن' ایس ایم شریف بجٹ آفیسر' ملک حاکم خان اے ڈی سی گوجرانوالہ' سید بشیر علی سیکشن آفیسر ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن' چودھری غلام رسول سینئر سپرنٹنڈنٹ کوئٹہ' مسٹر مولا بخش رجسٹرار آئی جی پولیس آفس' مسٹر شیر علی پی ڈی ایس پی' مسٹر بشارت حسین شاہ ڈپٹی کلکٹر محکمہ آب پاشی' مسٹر دوری حسین شاہ ڈپٹی سیٹلمنٹ کمشنر' مسٹر شفیق احمد خان ڈی ایس پی' مسٹر رحمت علی ایڈمنسٹریٹو آفیسر الیکٹرسٹی لاہور' مسٹر سلطان احمد ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ۔

غلام محمد بیراج میں سے اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں کو اونے پونے نرخوں پر زرعی اراضی الاٹ کی گئی۔ ان میں سے ۲۴۰ ایکڑ اراضی حاصل کرنے والے خوش نصیبوں کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ محکمہ صحت' بریگیڈیر ایف آر کلاؤ ڈپٹی ڈائریکٹر خوراک ڈاکٹر محمد سعید' سپرنٹنڈنگ انجینئر بہاولپور' ڈاکٹر ریاض قدیر ایڈمنسٹریٹر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' مسٹر ماجد احسن چیف انجینئر مشیر اے ڈی سی' شیخ مظہر الحق ریجنل منیجر واپڈا' میاں اصغر علی ڈپٹی سیکرٹری تعلیم' مسٹر سعید حمید چیف انجینئر' مسٹر یونس ای حسین چیف انجینئر آب پاشی' مسٹر اے آر قریشی چیف انجینئر بی اینڈ آر' مسٹر احمد مسعود احمد چیف انجینئر واٹرونگ' مسٹر ایس ایم سعید چیف انجینئر واٹر اینڈ سوشل الوسطی گیشن ڈویژن۔

غلام محمد بیراج میں سے ہی ۴۰۰ ایکڑ فی کس اراضی حاصل کرنے والوں میں جو لوگ شامل تھے ان کے نام ذیل میں دیئے جا رہے ہیں:

شیخ نور محمد ایڈیشنل کمشنر سرگودھا' مسٹر الماس علی بیگ جائنٹ ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر۔ اس کے علاوہ لاہور کے سرحدی علاقوں میں ۱۰ سے ۴۰ مربع تک ایوب خان نے اپنے خوشامدیوں اور قصیدہ گو بیورو کریٹس اور سیاست دانوں کو ایسی زمینیں الاٹ کیں جن کو قابل کاشت بنانے کے لیے کروڑوں روپیہ سرکاری خزانے سے خرچ کیا گیا۔ ان نوازشات کے بدلے میں بیورو کریسی اور جاگیرداروں نے ایوب خان کے اقتدار کو مضبوط بنایا اور اپنی تمام تر توانائیاں ایوب خان کے لیے صرف کر دیں۔

اپنے سیاسی حواریوں کو نوازنا پاکستان کے اس پہلے فوجی حکمران کی مجبوری تھی ورنہ یہ لوگ ایوب خان کے مخالفین میں جا شامل ہوتے۔ ایوب خان نے ان سیاسی حواریوں کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ صرف وسیع پیمانے پر بدعنوانیوں کی اجازت دی بلکہ خود کئی ایسے غیر قانونی اقدامات کیے جن سے ان حاشیہ برداروں کو فائدہ پہنچتا تھا ایوب خان جو سیاست دانوں پر نااہلیت' بدعنوانیوں اور کرپشن کے الزامات عائد کرتے ہوئے اقتدار پر قابض ہوئے تھے' جلد ہی خود اپنے خاندان سمیت بدعنوانیوں اور کرپشن کی دلدل میں پھنس گئے۔ ایوب خان نے ایوان صدر میں منتقل ہوتے ہی اپنے دو بیٹوں خصوصاً گوہر ایوب پر غیر معمولی توجہ دینا شروع کر دی۔ جواب میں گوہر ایوب نے بھی اپنی "غیر معمولی صلاحیتوں" کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ جنرل ایوب خان نے جب

صدر کا عہدہ سنبھالا تو کیپٹن گوہر ایوب کو اپنا اے ڈی سی رکھ لیا۔ ایوب خان جب کمانڈر انچیف تھے تو گوہر ایوب اس وقت بھی ان کے لے ڈی سی تھے۔ ایوب خان اپنے وزیر خزانہ ایم شعیبؔ کے مشورے پر اپنے دونوں بیٹوں کیپٹن گوہر ایوب خان اور کیپٹن اختر ایوب خان کو فوج سے نکال کر نجی کاروبار کی طرف لے آئے۔

افسر شاہی سے تعلق رکھنے والے جو لوگ ایوب خان کے اچھے برے کاموں میں شریک تھے انہوں نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی کہ ابتداء میں ایوب خان کی نیت صاف تھی۔ وہ عوام کو سیاست دانوں کی زیادتیوں سے بچانے آئے تھے اور ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نیک نیتی کا سارا بھرم کھل گیا اور ایوب خان ایک اقربا پرور اور بدعنوان شخص کے طور پر سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا جنہوں نے لامحدود فوائد حاصل کر لیے اور اپنی نسلوں کو سنوار گئے۔ جب ایوب خان اپنے عہدے سے برطرف ہوئے تو ڈاکٹر فرانزیک کے تخمینے کے مطابق وہ ۱۰ سے ۲۰ ملین ڈالر تک دولت سمیٹ چکے تھے۔

ایوب خان کی شخصیت کے متنازعہ پن کا عروج ان کے لاگو کردہ "ایبڈو" سے ہوتا ہے۔ ایوب خان نے اس قانون کے تحت سیاست دانوں کی ایک پوری نسل کو نااہل قرار دے کر ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا۔ سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد جس کی جڑیں عوام میں تھیں' سیاست سے الگ کر دی گئی۔ ایوب خان کے اس عمل کے نتیجے میں ایک خوفناک سیاسی خلا پیدا ہو گیا جسے دوسرے درجے کے خانیوار قسم کے سیاست دانوں نے پر کرنے کی کوشش کی۔ ایوب خان کے ایبڈو کے جو نتائج نکل سکتے تھے' وہ ایوب خان کے مشیران کرام کی نظروں سے اوجھل رہے یا انہوں نے جان بوجھ کر انہیں ایوب خان سے چھپائے رکھا۔ ایوب خان نے مقبول اور متحدہ پاکستان کے حامی بنگالی سیاست دانوں کو نااہل قرار دے کر جو سیاسی خلا پیدا کر دیا تھا' وہ شیخ مجیب الرحمان اور اس جیسی دوسری قوتوں سے بھرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ مجیب الرحمان چھوٹے درجے کے سیاست دانوں سے ابھر کر نئی نسل

اور پوری بنگالی قوم کی آرزوؤں کا ترجمان بن گیا۔ جو سیاست دان ان شکایات اور مسائل کو متحدہ پاکستان کے تناظر میں حل کر سکتے تھے' وہ ایوب خان کے ایبڈو کا شکار ہو گئے۔ فضا پر بنگالی قوم پرستی چھا گئی اور جب ایوب خان کا اقتدار ختم ہوا تو حالات بہت زیادہ گھمبیر ہو چکے تھے۔

بے نظیر بھٹو

محترمہ بے نظیر بھٹو ۲۱ جون ۱۹۵۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے گھر واقع کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ کا نام نصرت بھٹو ہے۔

ابتدائی تعلیم کراچی کے لیڈی جیننگ نرسری سکول سے حاصل کرنے کے بعد مری کے بورڈنگ سکول میں داخلہ لیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے کلفٹے اور کیلیفورنیا کی یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم سیاست میں بھی حصّہ لیتی رہیں اور ۱۹۷۶ء میں یونین کی صدر منتخب ہوئیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کو جب پھانسی دے دی گئی تو بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی قیادت سنبھال لی۔ ضیاء الحق نے بے نظیر کو سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام کے تحت گرفتار کرا دیا۔ یوں بے نظیر بھٹو پانچ سال تک قید تنہائی کاٹتی رہیں۔ ۱۹۸۴ء میں بے نظیر لندن چلی گئیں جہاں جلاوطنی کی زندگی گزارتی رہیں۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں وطن واپسی پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ وطن واپس آتے ہی انھوں نے لوگوں سے رابطے اور پارٹی کی تنظیم نو شروع کر دی۔ ۱۱ مئی ۱۹۸۶ء میں پارٹی چیئرپرسن کا عہدہ سنبھالا۔ بے نظیر نے ۱۹۸۷ء میں آصف علی زرداری سے شادی کر لی۔ نومبر ۱۹۸۸ء میں ہونے والے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ بے نظیر بھٹو نے ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء میں وزیرِاعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت کو غلام اسحاق خان نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء میں برخاست کر دیا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ہونے والے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت ملی اور بے نظیر بھٹو دوبارہ وزیراعظم بن گئیں۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں صدر فاروق لغاری نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برخاست کر دیا اور ۳ فروری ۱۹۹۷ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر کو دوبارہ اپوزیشن لیڈر بننا پڑا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو پسماندہ جاگیردار معاشرے کی راہنما ہیں۔ بدقسمتی سے تیسری دنیا کے اکثر ممالک جاگیردار معیشت اور معاشرے کے حامل ہیں۔ جاگیردار معاشرے میں جاگیروں کے ساتھ ساتھ سیاست بھی ورثے میں ملتی ہے۔ بے نظیر بھٹو کو بھی سیاست اپنے باپ سے ورثے میں ملی۔ انھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے فوراً بعد ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو نے ان کو سیاست میں کھینچ لیا۔ بھٹو صاحب اس وقت وزیراعظم تھے۔ انھوں نے بے نظیر بھٹو کو شروع شروع میں وزارت خارجہ کے دفاتر میں تربیت حاصل کرنے کے لیے چھوڑا کیونکہ خود بھٹو صاحب نے بھی اپنی سیاست اور شہرت کا آغاز وزارت خارجہ سے کیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ حکمرانی کرنے کے لیے ان جیسے خاندانوں کو صرف خارجہ امور کی تربیت ضروری ہوتی ہے کیونکہ داخلی انتظامات میں ان کا طبقاتی کردار ان کو مہارت عطا کر دیتا ہے اور ویسے بھی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کی سیاست کا زیادہ دارومدار خارجہ امور پر ہی ہوتا ہے۔

بے نظیر بھٹو صاحبہ خارجہ امور کی وزارت میں تھوڑا عرصہ ہی کام کر پائی تھیں کہ ملک میں سیاسی ابھار شروع ہوگیا۔ یہی سیاسی ابھار بے نظیر صاحبہ کے والد کی سیاست اور زندگی کا زوال ٹھہرا مگر بے نظیر کے لیے سیاست کی شروعات کا سبب بنا۔ ۱۹۷۷ء میں جب ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا اور ذوالفقار علی بھٹو گرفتار کر لیے گئے تو بے نظیر بھٹو نے اپنی ماں کے ہمراہ پہلی بار عوام سے رابطہ کیا۔ اسی رابطہ مہم میں

دونوں ماں بیٹی پہلی بار نظربند ہوئیں۔ بے نظیر کی نظربندی کے دوران ہی ان کو بہت بڑے صدمے سے دو چار ہونا پڑا جب ان کے باپ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد بے نظیر کو جلا وطن کر دیا گیا اور وہ لندن روانہ ہو گئیں جہاں ان کے دونوں بھائی پہلے سے موجود تھے۔ بے نظیر بھٹو چاہتیں تو ضیاء الحق کے غیر مقبول اقتدار کے خلاف عوامی جدوجہد کا آغاز کرتیں مگر انہوں نے پرامن سیاسی جدوجہد کی راہ اختیار کی۔ ان کا اپنے بھائیوں خصوصاً مرتضیٰ بھٹو سے اس بات پر ہمیشہ یہ جھگڑا رہا کیونکہ مرتضیٰ بھٹو ضیاء الحق کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا چاہتے تھے مگر بے نظیر بھٹو کا موقف تھا کہ صرف قانون کے دائرے میں رہ کر ہی اقتدار حاصل کرنا چاہیے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کی بہت ساری قیادت کو یا تو فوجی حکومت نے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا یا انہوں نے خود ساختہ جلا وطنیاں اختیار کر لیں۔ اس طرح بے نظیر بھٹو کے گرد لندن میں پاکستان کا سیاسی اکھاڑہ تشکیل پا گیا۔ انہوں نے یورپ کا دورہ کر کے تمام ملکوں میں پیپلز پارٹی کی تنظیم بندی کی اور جا بجا مارشل لاء کے خلاف عالمی رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ ادھر پاکستان میں ۱۹۸۳ء میں آرنلڈ رائیل کی موٹر کار پر ملک گیر دورے کے بعد ایم۔ آر ڈی کی بنیاد ڈالی گئی۔ جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کی پاداش میں ہزاروں کارکن جیلوں میں بند کیے گئے۔ انہیں کوڑوں کی سزائیں ہوئیں اور سینکڑوں قسم کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان سے باہر رہنے کی بناء پر مارشل لاء کے اس عذاب سے محفوظ رہیں جس سے ملک کے تیرہ کروڑ عوام بالعموم اور سیاسی کارکن بالخصوص دو چار ہوئے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے کہ پاکستان کی سیاست کا تعین پاکستان کی خارجہ پالیسی اور امریکہ کی خارجہ پالیسی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۸۵ء میں جب گورباچوف برسر اقتدار آیا تو سرد جنگ کی برف پگھلنا شروع ہو گئی۔ جس سے آگے چل کر پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے پیش نظر محترمہ بے نظیر بھٹو نے ۱۹۸۶ء میں امریکہ کا طویل دورہ کیا اور امریکی سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے بااثر لوگوں سے بھرپور ملاقاتیں کیں اور نتیجتاً محترمہ دس اپریل ۱۹۸۶ء کو پاکستان

نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب ضیاء الحق کی عالمی اہمیت زیرو ہو چکی تھی اور اندرون ملک بھی لوگ تبدیلی کو ترس رہے تھے۔ اس صورت حال میں چاہیے تو یہ تھا کہ بے نظیر بھٹو ایک ایسی سیاسی جدوجہد کا آغاز کرتی جس سے فی الفور ضیاء آمریت کا خاتمہ ہوتا اور ملک کے منجمد جمہوری کلچر میں نئی جان آتی مگر شاید خود بھی بے نظیر بھٹو صاحبہ ایسی جمہوری زندگی سے خائف تھیں جس سے عام سیاسی کارکن کا سیاست پر کوئی سیاسی کردار متعین ہو سکتا تھا۔ عام سیاسی کارکن کے جوش و خروش کا اندازہ دس اپریل کے دن سے لگایا جا سکتا تھا جب لاہور کی سڑکوں نے سیاسی تاریخ کے سب سے بڑے اجتماع کا مشاہدہ کیا اور بے نظیر کو اس قابل کر دیا کہ وہ کہہ سکیں کہ وہ اگر آج چاہیں تو اسلام آباد پر بزور بازو قابض ہو سکتی ہیں۔ بے نظیر کی امریکی سامراج سے دوستی بھی اس دن ہی واضح ہو گئی تھی جب نوجوانوں کے امریکی پرچم نذر آتش کرنے پر بے نظیر نے انہیں ڈانٹ پلائی اور مینار پاکستان میں کیے جانے والے اپنے خطاب میں دس لاکھ سے زائد انسانوں کے سامنے ان سے اظہار لاتعلقی کیا۔

سیاسی تجزیہ نگاروں کے نزدیک بے نظیر طے شدہ پروگرام سے پاکستان آئیں۔ یہی وجہ تھی جب اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے ضیاء الحق سے کہا کہ وہ بے نظیر کو ایئرپورٹ سے ہی تحویل میں لے لیں گے تو ضیاء الحق نے یہ بات ٹال دی اور یوں بے نظیر لاکھوں لوگوں کی قیادت کرتی ہوئی مینار پاکستان پہنچ گئیں۔ مینار پاکستان پر اپنے خطاب میں بے نظیر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کوئی پروگرام نہ دے سکیں مگر اس کے باوجود دو سال تک ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی مضبوط ہوتی رہی اور وہ ۱۹۸۸ء میں ضیاء الحق کی وفات کے بعد ہونے والے انتخابات میں کامیاب رہی ور صدر اسحاق ور مرزا اسلم بیگ جو اس وقت چیف آف آرمی سٹاف تھے' کو چار و ناچار بے نظیر کو وزیراعظم ماننا پڑا۔ گو بے نظیر بھٹو فیملی کے لیے وزیراعظم ہاؤس یا وزارت عظمیٰ کا منصب کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ وہ ستر کی دہائی میں ایک عرصہ ایسے مراتب پر گزار چکے تھے مگر اس کے باوجود پی پی پی کی طویل تحریک جو کہ جمہوریت کی بحالی کے لیے انہوں نے چلائی تھی' جس کا رخ فوج اور بیوروکریسی کے خلاف تھا' لہٰذا فوج اور بیوروکریسی کے اندر پی پی پی سے ایک قسم کی دوری اور

اجنبیت کی فضا برقرار رہی۔ حالانکہ ۱۹۸۸ء تک بے نظیر کے وزیراعظم بننے تک انھوں نے اس تاثر کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی اور وزیراعظم بننے کے بعد بھی انھوں نے یقین دلوایا کہ وہ انتقامی سیاست نہ کریں گی بلکہ سب کو ساتھ لے کر چلیں گی۔ اس کے باوجود صدر اسحاق خان اور ان کے گروہ کے لوگ جو ضیاء الحق دور میں ایک مضبوط گروپ بن چکے تھے' انھوں نے دل سے بے نظیر کو قبول نہ کیا اور پہلے دن سے ہی انھیں اپنا اقتدار بچائے رکھنے کی فکر لاحق رہی۔

بے نظیر کے مسائل بڑھانے کے لیے پنجاب کی وزارت اعلیٰ میاں نواز شریف کے سپرد کی گئی جن کا اتحاد ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں اکثریت کے ساتھ آیا۔ میاں نواز شریف صاحب نے مرکز سے محاذ آرائی شروع کر دی اور مرکزی حکومت نے بھی دانش مندی کا مظاہرہ نہ کیا اور یہ محاذ آرائی طول پکڑتی چلی گئی۔ بے نظیر کے وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد سازشوں کا عہد شروع ہوا۔ مڈنائٹ جیکالز کی سازش بے نقاب ہوگئی اور میجر عامر اور بریگیڈیئر امتیاز کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ اسی دوران میں بے نظیر نے بھی جب یہ دیکھا کہ فوج کے سربراہ جنرل بیگ ان سازشوں کے درپردہ متحرک ہیں تو انھوں نے جنرل بیگ کو جبری ریٹائر کرنے کے لیے اپنے قریبی ساتھیوں خصوصاً جنرل نصیراللہ بابر اور کرنل سرور چیمہ سے صلاح مشورہ شرع کر دیا۔

بے نظیر اسلم بیگ کی جگہ عالم جان محسود کو فوج کا سربراہ بنانا چاہتی تھیں۔ جنرل بیگ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے بے نظیر نے ایڈمرل افتخار سروہی کو ٹیسٹ کیس بنایا اور افتخار سروہی کو ریٹائر کرنے کے احکامات جاری کر دیئے جس پر صدر اسحاق اور جنرل بیگ بہت پیچ پا ہوئے اور انھوں نے اسمبلی کے اندر سے تبدیلی لانے کے لیے میجر عامر اور بریگیڈ۔ئر امتیاز کو تیز کیا اور یوں اسمبلی کے ممبروں کی خرید و فروخت کا کام شروع ہوگیا مگر یہ کام انٹیلی جنس بیورو کی بروقت رپورٹ کی وجہ سے ناکام رہا۔ بیورو نے اکتوبر ۸۹ء کو بے نظیر کو جو رپورٹ ارسال کی' اس کے مطابق اس سازش کے پیچھے جنرل شمس الرحمٰن کا نام بھی لیا گیا۔ مگر فوج ایوان صدر اور پنجاب حکومت کی یہ سازشیں کچھ بھی نہ کر پاتیں اگر بے نظیر صاحبہ دانش مندی کا مظاہرہ کرتیں۔

انہوں نے حکومت سنبھالتے ہی ایم آر ڈی کی جماعتوں اور راہنماؤں کو خیرباد کہہ دیا حالانکہ بے نظیر کی جدوجہد کے دنوں میں ان جماعتوں اور ان کے رہنماؤں نے جمہوریت کی بحالی کے لیے کوئی کم خدمات انجام نہ دی تھیں۔ دوسری طرف بے نظیر کے امریکی سامراج کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے پارٹی کے بائیں بازو کے کارکن بھی بددل ہو گئے جو پارٹی کے روح رواں تھے مگر اس سے بھی اتنا فرق نہ پڑتا جتنا بے نظیر کی حکومت میں ان کے خاوند آصف زرداری اور دوسرے پارٹی کے اعلیٰ عہدے داروں کی مالی بدعنوانیوں نے پارٹی کو نقصان پہنچایا۔

ایک تو بے نظیر صاحبہ لوگوں کے ان خوابوں کی تشفی نہ کر سکیں جن کے لیے انہوں نے گیارہ سال تک مارشل لاء کا جبر برداشت کیا تھا بلکہ ان کی جدوجہد پر نت نئی مالی بدعنوانیوں کے سکینڈلز نے سیاہی پھیر دی۔ ہر طرف یہ چرچا عام ہو گیا کہ کوئی بھی کام لینے کے لیے ضروری ہے کہ مسٹر آصف زرداری صاحب کو دس فیصد کمیشن دیا جائے۔ اس طرح ان کو "مسٹر ٹین پرسنٹ" کا نام دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو ان کے شوہر نامدار آصف علی زرداری صاحب کے گرد جمع لوگوں نے قومی وسائل اور قومی خزانے کو جس بے دردی سے لوٹا اور استعمال کیا' اس سے لوگوں کا جمہوریت پر سے ایمان اٹھ گیا۔ جب ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق نے مرزا اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف سے ہم مشورہ ہو کے بے نظیر کی حکومت معزول کی تو بے نظیر دور کی مالی بدعنوانیوں کی درج ذیل فہرست جاری کی گئی:

قومی وسائل اور قومی خزانے کی لوٹ مار

☆ — اسلام آباد اسٹاک ایکسچینج' وفاقی وزیر مملکت برائے خزانہ ایک ایسی بدعنوانی کے مرتکب ہوتے تھے' جس کے ذریعے ان کے رشتہ دار اور حصہ داروں نے ایک ہی جھٹکے میں ایک کروڑ روپے سے زائد کما لیے۔

☆ — جام صادق علی کو دو کروڑ روپے کے قرضہ کی منظوری دی اور پھر کسی ضمانت کے بغیر ادائیگی کر دی۔

☆ — تیس چالیس کروڑ روپے کے قرضے ایسے افراد کو جاری کیے گئے جنہیں

عام حالات میں کوئی بینک ایک لاکھ روپے کا قرضہ دینے کا روادار نہ ہوتا۔

☆ - سکرنڈ شوگر مل' مرزا شوگر مل' انصاری شوگر مل' خیرپور شوگر مل' تھرپارکر شوگر مل پر مشتمل پانچ شوگر ملیں منظور کر کے اوسطاً "دو کروڑ فی مل کی شرح سے دس کروڑ روپے Kick Back کی صورت میں حاصل کیے گئے۔ یہ معاوضہ تھا' اس لاگت کے مقابلے میں کہیں زیادہ اضافی لاگت منظور کرنے کا۔ اب اگر یہ ملیں نہ بھی لگ سکیں تو بھی وہ افراد خسارے میں نہیں رہیں گے' جنہیں اجازت دی گئی ہے۔

☆ - انٹرنیشنل گارنٹی ٹرسٹ لیمیٹڈ (۱۱ وہائٹ ہاؤس اسٹریٹ لندن۔ یو کے) کو اسلام آباد میں "لیک ویو ہوٹل" تعمیر کرنے کے لیے ۴۲۳ کروڑ سے ۶۸۸ کروڑ روپے تک مالیت کی ۲۸۷ ایکڑ اراضی صرف بیس کروڑ روپے میں لیز پر اس طرح دی گئی کہ یہ رقم پانچ سال میں قسطوں کی صورت میں ادا کی جائے گی۔ یہ ہوٹل صرف چھ صدارتی سوئٹ (Suite) پر مشتمل ہوگا جو سارک ممالک کی سربراہ کانفرنس کے موقع پر کام آئیں گے۔

☆ - آصف زرداری کے ایک کرایہ دار کے نام پر کے ڈی اے سے دو لاکھ روپے کا پلاٹ خریدا گیا اور تین ہفتوں کے اندر دو کروڑ روپے میں فروخت کر دیا گیا۔

☆ - پی آئی اے کو بوئنگ ۷۶۷ کے بجائے ایئر بس خریدنے پر مجبور کیا گیا اور اس سودے پر مس منوالا کے ذریعے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کا کمیشن حاصل کیا گیا۔

☆ - سی بی آر کے وہ تین افسر ایک ایک کروڑ روپے رشوت لے کر فیلڈ میں بھیجے گئے جنہیں انتہائی بدعنوان قرار دے کر فیلڈ میں نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

☆ - جاوید پاشا نام کے ٹھیکیدار کو گریڈ ۲۲ دے کر وزیراعظم سیکرٹریٹ میں متعین کر دیا گیا۔ وہ پالیسی پلاننگ کمیٹی کے سربراہ اور مختلف قسم کے سودے کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

☆ - قبل ازیں جاوید پاشا این ایل سی کے ٹرک کے ذریعے سمگلنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کے ہمراہ ایک اور صاحب اور ایک انٹیلی جنس ایجنسی کے نمبر ۲ کا نام بھی آتا ہے۔

☆ - اسٹیٹ بینک کے گورنر اے ایچ شگی کو اسٹیبلشمنٹ بیورو کے حکم پر پارٹی کارکنوں کو ملازمتیں مہیا نہ کرنے کی بنا پر سبکدوش کر دیا گیا۔

☆ - قبل ازیں سی ڈی اے کے چیئرمین کو "لیک ویو ہوٹل" کے لیے زمین الاٹ کرنے کے راستے میں روڑے اٹکانے پر فارغ کر دیا گیا تھا"۔

☆ - سٹیل مل کا فنڈنگ ڈائریکٹر اس شخص کو مقرر کیا گیا جس کا کورٹ مارشل ہوا تھا۔ سات سال کی سزا دی گئی تھی۔ اس نے ۱۵۰ ایسے افراد بحال کیے اور ۳۰۰ افراد کو ملازمتیں دیں جس کے بعد سٹیل مل لسانی فسادات کا شکار ہو گئی۔ اس کی پیداوار آدھی رہ گئی ہے۔

☆ - گدون امازئی پراجیکٹ میں گھی کا کارخانہ لگانا ممنوع تھا۔ لیکن وفاقی وزیر قائم علی شاہ کے بھائی کو وہاں گھی کا کارخانہ لگانے کی اجازت دی گئی۔ ۱۰۰ ٹن صلاحیت کے اس کارخانے کی پیداوار میں ۲۰۰ ٹن تک کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کارخانے میں صرف ۷۵ افراد ملازم ہوں گے اور ایک سال میں کارخانے کا منافع ۲۰ کروڑ روپے ہو گا۔

☆ - نیشنل بینک کے صدر ڈی ایم قریشی کو اس بنا پر برطرف کیا گیا کہ اس نے ٹویوٹاسک کو ساڑھے تین کروڑ کا قرضہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ پہلے ہی چھ کروڑ روپے کا قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ واضح رہے کہ شارجہ میں ہونے والے آسٹرا ایشیاء کپ ٹورنامنٹ کے سرپرستوں میں ٹویوٹاسک بھی شامل تھے اور آصف زرداری نے اس ٹورنامنٹ کے اختتام پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔

☆ - گلستان جوہر میں پی ٹی اے کے ہسپتال کے لیے ۱۲۰۰ ایکڑ (۹۰ ہزار گز) زمین کی خرید ری معلق ید کے میڈی کیئر ہسپتال' ۱۷ کروڑ روپے کے عوض خریدا گیا۔ کیونکہ اس ہسپتال کا مالک پی پی اے کا ایک لیڈر طارق سیکل تھا۔

☆ - وزیراعظم کے دفتر کا خرچ ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ سے بڑھ کر ۹ کروڑ روپے ہو گیا س طرح صرف ایک سال میں ۸۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔

☆ - وزیراعظم کی حفاظت پر ایک کروڑ ۴۸ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ ۳۷۲

افراد دفتر اور ۳۲۰ افراد گھر (کل ۸۸۲) کی حفاظت پر مامور تھے۔

☆ ۔ وزیراعظم کے کچن پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے ماہانہ خرچ آ رہا تھا جبکہ پاکستانی شہریوں کی فی کس آمدنی ۸۰۰ روپے ماہانہ ہے۔

☆ ۔ وزیراعظم کے طیارے کی تزئین پر ۳ کروڑ، سندھ ہاؤس کی تزئین پر ۷ دکھ، نئے مکان کی تزئین پر پانچ کروڑ روپے خرچ آئے۔

☆ ۔ بے نظیر صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو کے دوروں پر بہت سخت تنقید کرتی تھیں۔ محمد خان جونیجو کے دورہ برطانیہ پر زیادہ سے زیادہ ۳۰ لاکھ روپے خرچ آئے تھے لیکن بے نظیر بھٹو کے صرف ایک دورہ امریکہ پر دو کروڑ ۵۸ لاکھ روپے خرچ آئے۔ اس دورے میں وزیراعظم کے ہمراہ ۹۷ افراد شریک ہوئے۔

☆ ۔ سینئر وزیر بیگم نصرت بھٹو کے ایک دورہ بلغراد پر آٹھ لاکھ چالیس ہزار خرچ آئے۔ ان کے ایک وزیر مختار اعوان کے ایک دورے پر پونے ساٹھ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔

☆ ۔ ذوالفقار علی بھٹو کی برسی منانے کے لیے پی آئی اے کے ایک متروک ہوٹل پر ایک کروڑ ۵۵ لاکھ روپے خرچ کر کے قابل استعمال بنایا گیا۔

☆ ۔ سرحد کے وزیراعلیٰ آفتاب شیرپاؤ نے بھٹو کا مقبرہ تعمیر کرنے کے لیے ۵۰ لاکھ روپے کا حقیر عطیہ دیا۔

☆ ۔ وفاقی حکومت نے وزیروں اور مشیروں کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے کی نئی کاریں خریدیں۔

☆ ۔ وفاقی لینڈ کمیشن کی تقرری غیر قانونی تھی کیونکہ اس عہدے پر کسی وفاقی وزیر کو ہی نامزد کیا جا سکتا ہے۔

☆ ۔ سیف گیمز بوڑھے اور معذور کھلاڑیوں کے نام پر ۶۸ کروڑ روپیہ کمایا گیا۔ لیکن انہیں صرف ۹۰ لاکھ روپے ادا کیے گئے سیف گیمز کی پبلسٹی کے لیے ٹیلی ویژن سے پبلسٹی پر ۹ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ خطیر رقم پر ۱۵ سے ۲۵ فیصد کمیشن کس نے وصول کیا؟ اخبارات کو ساڑھے تین کروڑ روپے کے اشتہارات دیئے گئے۔ پانچ کروڑ روپیہ سیاچین کے شہداء کے ورثاء اور معذوروں کے لیے وقف کیا

گیا۔ ۲۲ کروڑ وزارت تکمیل کے حوالے کر دیے گئے۔ باقی کہاں گیا؟ "مرد اول" کی جیب میں یا سیاسی پھولن دیوی کے پرس میں؟

بے نظیر پر لگائے گئے الزامات پر صدر پاکستان نے بے نظیر کے خلاف عدالتوں میں ریفرنس دائر کیے اور کروڑوں روپے اپنے سرکاری وکلاء کو فیس کی صورت میں ادا کیے گئے۔ گو عدالتوں میں جب حکومت ان الزامات کو ثابت کرنے میں ناکام رہی مگر ان الزامات کا عوام پر گہرا اثر مرتب ہوا اور عام انتخابات میں بے نظیر بھٹو کو شکست سے دو چار ہونا پڑا اور میاں نواز شریف وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اب تک بے نظیر بھٹو بھی اپنے خلاف ہونے والی سازشوں سے پاکستان کی پاور پالیٹکس کی ماہر ہو چکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے انتہائی مہارت سے صدر اسحاق اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بڑھانا شروع کر دیئے۔

اپنی کاوش میں وہ اس قدر کامیاب ہوئیں کہ وزیراعظم نواز شریف نے ان کو خارجہ امور کی کمیٹی کی چیئرپرسن منتخب کر لیا۔ بس پھر کیا تھا کہ ایوان صدر ور وزیراعظم ہاؤس میں تلخیاں اس قدر بڑھیں کہ بے نظیر نے ایک تیر سے دو شکار کر ڈالے۔ صدر سحاق خان نے پہلے نواز شریف کی حکومت برخاست کی بعد میں خود بھی استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ ملک میں نئے عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ امریکہ سے نگران وزیراعظم در آمد کیا گیا۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں نہ صرف انتخابات کروائے بلکہ اپنی نگرانی کے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ملک میں بے شمار ساختی تبدیلیاں کر ڈالیں جن کے لیے عالمی مالیاتی اداروں کا ہر حکومت پر دباؤ رہا ہے۔ عام انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو ایک بار پھر اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں مگر اس بار بھی پنجاب کی حکومت پی پی کی کمزور اتحاد جونیجو لیگ کے مضبوط آدمی میاں منظور وٹو کو سونپ دی گئی جنہوں نے پہلے دن سے ہی بے نظیر کو مشکلات میں ڈالنا شروع کر دیا۔ ادھر مالی بدعنوانیوں کی سابق روش جس کی بناء پر پہلے بھی بے نظیر حکومت برخاست ہو چکی تھی' میں مزید اضافہ ہوا اور بے نظیر بھٹو نے اسلام آباد میں ۴۰ کروڑ کا پلاٹ صرف ۲۳ لاکھ روپے میں پیپلز ویلفیئر ٹرسٹ کے نام پر حاصل کیا جو کہ ۴۸ کنال کا تھا۔ سرکاری محکموں' کارپوریشنوں اور اداروں کو تباہی کے دہانے تک پہنچایا

گیا اور میرٹ کو نظر انداز کر کے نااہل لوگوں کو رشوت لے کر نوکریاں دی گئیں اور اوارے ملازموں سے بھر دیئے۔ پی آئی اے میں تقرریوں کے لیے وزیراعظم ہاؤس سے براہ راست مداخلت کی جاتی رہی۔

پی آئی اے میں بھرتی کے لیے وزیراعظم کے پرسنل سیکرٹری احمد صادق اور سیاسی سیکرٹری ناہید خان کے سفارشی خط چلتے رہے۔ وزیراعظم وزیروں' سینٹروں' ممبوں اور بااثر سیاسی وڈیروں کے قریبی عزیزوں بھتیجوں اور بھانجوں کو ملازمتیں دے کر نہایت ہٹ دھرمی سے ان تقرریوں کو غریب عوام کو نوکریاں فراہم کرنے کا نام دیتی رہیں۔ احمد صادق نے اپنی گرفتاری کے وقت بیان دیا کہ اس نے سب کچھ ذاتی طور پر نہیں کیا بلکہ جائز و ناجائز کام وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے حکم پر کیے ہیں اور بحیثیت پرسنل سیکرٹری وزیراعظم کے احکامات پر عمل درآمد کرانا میرے فرض میں شامل تھا۔ وزیراعظم کی خواہش پر پسندیدہ لوگوں کی بیرون ملک تقرریاں ہوئیں۔ عمر رسیدہ افراد کو ڈائریکٹر جنرل منیجر کے عہدوں پر مستقل بنیادوں پر ملازم رکھا گیا۔ ان حرکات کی وجہ سے قومی ایئر لائن کو کروڑوں کا نقصان پہنچایا گیا۔ ۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء کو ڈیوٹی فری شاپ میں بطور اسسٹنٹ کام کرنے والے ایک شخص عمران اللہ خان کو احمد صادق کے احکامات پر پی آئی اے کے ڈائریکٹر کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔ سی طرح ایک اور حکم نامے میں میجر شاہد طور کو فوراً وہیں پوسٹ کر دیا گیا جبکہ پی آئی اے کے قوانین کے مطابق بیرون ملک پوسٹنگ کے لیے پانچ سالہ ملازمت کا ہونا ضروری ہے۔

بے نظیر کے کرپٹ دور حکومت کی داستانیں دیر تک منظر عام پر آتی رہیں . ان میں سے ہر داستان اپنی جگہ حیرتوں سے بھرپور ہے۔ یہ وہ دور تھا جب کرپشن کو براہ راست اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز حکمرانوں کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی اور خود وزیراعظم ہاؤس کرپشن کا اڈہ بنا ہوا تھا جہاں آصف زرداری کی زیر نگرانی لوٹ مار کے منصوبے تشکیل پاتے اور ان پر عملدرآمد کے لیے بددیانت اہل کاروں کا انتخاب کیا جاتا۔

یہ اپریل ۱۹۹۶ء کا ذکر ہے کہ پی آئی اے کارگو کراچی کو وزارت خارجہ کی طرف سے ایک ٹیلکس پیغام موصول ہوا۔ اس پیغام کو نہایت ہی اہم اور فوری توجہ

طلب قرار دیا گیا تھا۔ یہ پیغام وزارت خارجہ کے ڈپٹی چیف آف پروٹوکول نصیراللہ بلوچ کی طرف (بلاول ہاؤس) کراچی سے ذاتی استعمال کا کچھ سامان لندن میں پاکستان ہائی کمشن کو بھیجا جا رہا تھا۔ یہ سامان بڑے بڑے آٹھ پیکٹوں میں بند تھا اور اس کو پی آئی اے کی (۲۳) اپریل ۱۹۹۶ء کی فلائٹ کے ذریعے بھیجا جانا تھا اس لیے پی آئی اے کے نمائندوں کو ہدایت کریں کہ وہ ۲۳ اپریل کو صبح ۱۰ بجے بلاول ہاؤس میں آئیں تاکہ وہ سامان اپنے قبضہ میں لے سکیں۔ اس سلسلے میں پاکستان نیوی سے کہا ہے کہ وہ یہ سامان وزیراعظم ہاؤس سے ایئرپورٹ تک لانے کا انتظام کرے اور کسٹم والوں کو بھی ضروری ہدایات دے دی گئی ہیں۔ اس پیغام کے بعد پی آئی اے کے متعلقہ حکام میں ہلچل مچ گئی اور ہر ایک نے اپنی اپنی فرض شناسی کے جوہر دکھانا شروع کر دیئے۔ ۲۵ اپریل ۱۹۹۶ء کو ایک فیکس پیغام کلکٹر آف کسٹمز پی آئی اے کراچی کو ارسال کیا گیا جس میں ٹیلی فون پر گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ کارگو کو فوری طور پر کلیئر کرایا جائے کیونکہ آج کام کا آخری دن ہے اور تمام سامان کو کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس میں صرف گھریلو استعمال کی اشیاء ہیں اور گھریلو استعمال کی اشیاء کی تفصیل ریڈ بال (Red Ball) نامی فرم کے پاس موجود ہے جبکہ یہ سامان لکڑی مختلف قسم کی دھاتوں وغیرہ سے بنائے گئے قیمتی نوادرات پر مشتمل تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے مجسمے' تلواریں اور پرانی ساخت کا اسلحہ بھی شامل تھا اور پاکستان کے قانون کے تحت اس نوع کے نوادرات بیرون ممالک ارسال نہیں کیے جا سکتے۔ یہ سارا سامان بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری کے برطانیہ میں خریدے گئے سرے محل کے لیے تھا۔ سرے محل جس کی مالیت تقریباً ۳۰ کروڑ روپے سے زائد بنتی ہے' مگر تمام ثبوت موجود ہونے کے باوجود بے نظیر بھٹو اس سے انکار کرتی ہیں کہ سرے محل ان کا نہیں ہے۔ اگر سرے محل ان کا نہیں تو پھر بلاول ہاؤس کراچی سے اتنا قیمتی سامان سرے محل کیوں بھیجا گیا اور اس سارے سامان کو کراچی سے برطانیہ تک پہنچانے میں پی آئی اے کے کرپٹ عناصر کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں متعین ہائی کمشن واجد شمس الحسن نے جاوید پاشا کے ساتھ مل کر کلیئر کرایا۔ اس سامان پر کسٹم ڈیوٹی ۳ لاکھ ۴۰ ہزار چار سو روپے بنتی تھی۔ اس سامان کو پی آئی اے کی فلائٹ نمبر پی کے

PK787 کے ذریعے ۲۸ اپریل کو لے کر لندن روانہ ہوئی۔

بے نظیر کے کرپٹ ٹولے کے ایک رکن واجد شمس الحسن نے لوٹ مار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی ایک سیاہ واردات کا تعلق مرتضیٰ بھٹو کا قتل ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو مرتضیٰ بھٹو قتل ہو گیا اور بے نظیر بھٹو کی ایماء پر نامعلوم مقاصد کے لیے واجد شمس الحسن کو پرائیویٹ سراغ رسانوں کا اہتمام کرنے کے لیے کہا گیا۔ ظاہری طور پر ظاہر کیا گیا کہ یہ ٹیم اسکاٹ لینڈ یارڈ کے پولیس سراغ سرانوں پر مشتمل ہے لیکن حقیقت میں اس کا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ سے نہیں تھا اور واجد شمس نے سراغ رسانوں کی فیس کی ادائیگی کے لیے ۲ لاکھ پاؤنڈ کی خطیر رقم حکومت پاکستان کے اکاؤنٹ سے نکلوائی اور ایک ایسے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی جو خود واجد شمس اور اس کی بیوی کے نام تھا۔ اس رقم میں سے ایک لاکھ ۳۰ ہزار پاؤنڈ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو چیک کے ذریعے میسرز شورلاک اسٹیٹس منیجمنٹ لمیٹڈ نامی فرم کو ادا کیا گیا۔ یہ چیک نیشنل بینک لندن کی برانچ سے جاری ہوا۔ یہ وہ رقم ہے جو سراغ رسانوں کو ادا کی گئی جبکہ باقی رقم بھی ادا کر دی گئی تھی۔ واجد شمس الحسن نے حکومت پاکستان کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا کہ بعض مخصوص مقاصد کے لیے برطانیہ میں ایشین وائس نامی ایک فرم کی سرپرستی ضروری ہے جو ایشیاء وائس کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کرے گی۔ اس کے لیے احمد صادق کی ملی بھگت سے وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے تحریری منظوری حاصل کرنے کے بعد کروڑوں کے مزید فنڈز جاری کیے گئے جبکہ ایشیاء وائس کے صرف دو شمارے شائع ہوئے جس کا ہر شمارہ پاکستانی قوم کو ۳۰ ہزار پاؤنڈ یعنی تقریباً ۲۰ لاکھ روپے میں پڑا۔ بلاول ہاؤس کراچی سے سرے محل لندن تک پھیلی ہوئی اس کہانی کا ہر موڑ واضح ہے اور ہر کردار اپنے سیاہ چہرے کے ساتھ نمایاں طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ فائلیں دہائی دے رہی ہیں اور دستاویزات کرپشن کے ناقابل تردید ثبوت کی حیثیت سے انصاف کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے اور پاکستان کو دوسرا کرپٹ ملک بنا دینے والا ٹولہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معصومیت اور مظلومیت کی تصویر بننے میں مصروف ہے۔

پاکستان کی عوام ان درندوں کو عبرت ناک انجام سے دو چار دیکھنے کے منتظر

ہیں جن کے جبڑوں سے ابھی تک کروڑوں انسانوں کا لہو ٹپک رہا ہے۔

بینظیر وزیراعظم کے صرف کچن کا خرچ ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپے ماہانہ

سات سال قید کی سزا پانے والے کو اسٹیل مل کا سربراہ بنا دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو پر ایک الزام لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے پر مبنی تھا جس میں وفاقی وزیر مملکت برائے خزانہ احسان الحق پراچہ کو بدنیتی جانبداری اور اقرباء پروری کا ملزم ٹھہرایا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اسلام آباد سٹاک ایکسچینج قائم کرنے کی اجازت اپنے ایک کاروباری ساتھی امان اور فیروز سنز کے دو ڈائریکٹروں خالد وحید اور فیروز اے قاسم کو دے دی تھی جبکہ وزیر خزانہ خود بھی فیروز سنز کے ڈائریکٹر ہیں۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے یہ دستاویزات سامنے آنے پر بھی الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

بے نظیر بھٹو نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ملک کو لاقانونیت اور فرقہ پرستی اور تعصبات کے حوالے کر دیا۔ کراچی میں ہر روز درجنوں افراد قتل ہونے لگے۔ ایم کیو ایم کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے آپریشن کے نام پر ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بے نظیر بھٹو کا دور جرائم کے لحاظ سے بھی بے نظیر ثابت ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جرائم کی شدت اور وسعت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۹ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ء تک اغواء (۳۰۰۰)' عام ڈکیتی (۱۸۷۰۰)' بینک ڈکیتی ۸۸' زیورات کی دکانوں میں ڈکیتی (۸۹)' پٹرول پمپ ۲۱' ٹریول ایجنسیاں ۵۷' مسروقہ گاڑیاں (۱۰) ہزار' اغواء شدگان سے وصول کردہ تاوان (۳۰) کروڑ روپے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق یکم جنوری ۱۹۸۹ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ء تک تھانوں میں درج شدہ ایف آئی آر کی مدد سے مختلف صوبوں میں بھیانک جرائم کے جو اعداد و شمار مرتب ہوئے' وہ اس طرح ہیں:

صوبہ	قتل	زخمی	ڈکیتی	اغواء
سندھ	۷۴۳	۱۸۹۳	۱۳۴۳	۴۴۳
پنجاب	۱۷۶	۳۳۱	۲۸۷	۳۵

یکم جنوری ۱۹۹۰ء سے ۳۰ اپریل ۱۹۹۰ء تک جو جرائم ریکارڈ پر آئے:

صوبہ	قتل	زخمی	ڈکیتی	اغواء

سندھ	۵۰۲	۳۲۷	۲۱	۳۳۳
پنجاب	۱۸۴	۲۳۵	۳۹	۹

ایک عام اندازے کے مطابق تھانوں کے ریکارڈ پر آنے والے جرائم اصل تعداد کا نصف سے بھی کم حصہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کی اخلاقی لوٹ مار اور ناروا سلوک کے خوف سے اور مجرموں کے ساتھ اس کی ملی بھگت کی واضح شہادتوں کے پیش نظر لوگ چوری ڈکیتی وغیرہ کے مقدمات درج نہیں کراتے اور اپنے نقصانات پر رو پیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور دوسری طرف پولیس بھی اعداد و شمار کو قابو میں رکھنے ور سب اچھا ہے' کا تاثر دینے کے لیے ایف آئی آر درج نہیں کرتی۔

پنجاب میں جہاں آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا ۶۰ فیصد ہے' جرائم کا تناسب سندھ کے مقابلے میں بہت کم ہے جبکہ شور صرف پنجاب کے واقعات پر مچایا جاتا ہے کیونکہ یہاں پر پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں ہوتی جبکہ بے نظیر بھٹو نے اپنی حفاظت کے لیے ۸۲۷ افراد بھرتی کیے ہوئے تھے جن پر لاکھوں روپے ماہانہ خرچ آ رہا ہے۔

بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت کو بھی بے نظیر بھٹو اور ان کے حواریوں کی بدعنوانیاں لے ڈوبیں۔ پارٹی کے اندر بھی من پسند اور جی حضوری لوگوں کو آگے لا کر پارٹی کی جمہوری روح کچل دی گئی جس کی بناء پر بے نظیر صاحبہ کا ہمیشہ اپنے بھائی مرتضیٰ بھٹو سے بھی تضاد رہا اور بقول مرتضیٰ بھٹو بے نظیر بھٹو نے چند برسوں میں پی پی پی کو جتنا نقصان پہنچایا' ضیاء الحق ۱۱ سالہ آمریت میں نہیں پہنچا سکے۔ بے نظیر کی اقتدار کی طلب پر ایک مرتبہ مرتضیٰ بھٹو نے بہت خوب پھبتی کسی کہ "اگر آج ضیاء الحق زندہ ہوتا تو بے نظیر کے ساتھ بھی بحیثیت صدر کام کرنے پر تیار ہو جاتا" مگر اس تمام صورت حال کے باوجود بے نظیر آج بھی پاکستان کی سیاست میں ایک جاندار کردار ہیں۔

پاکستان جیسے پسماندہ معیشت کے حامل ملکوں کی یہ بدنصیبی ہے کہ یہاں کے حکمران اپنے دور حکمرانی میں طاقت ور اور موثر کردار کے حامل عالمی مالیاتی اداروں کے درمیان توازن قائم کرنے اور ان کے احکامات ماننے میں الجھے رہتے ہیں جن کے مفادات سراسر عوام کے مفادات کے خلاف ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ

حکمران اپنی عوام کو کچھ دینے کی بجائے ان کی لوٹ کھسوٹ میں اضافے کا سبب بنتے ہیں جس کی وجہ سے عوام بہت جلدی ان سے نفرت شروع کر دیتے ہیں اور یوں ہر ایک کا اقتدار دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہتا اور اس سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ مناسب انتخاب کے کم مواقع کی وجہ سے حزب اختلاف آئندہ انتخابات کے بعد حزب اقتدار بن جاتی ہے۔

بلخ شیر مزاری

میر بلخ شیر مزاری ۸ جولائی ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایچی سن کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے۔ وہ ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھنے والے ایسے جاگیردار ہیں' جن کے آباء و اجداد کو قوم سے غداری اور انگریز سامراج سے وفاداری کے صلے بھاری مراعات' جاگیریں اور قیمتی انعامات میسر آئے۔ یہ انگریز سرکار کی آشیرباد ہی تھی جس نے مزاری خاندان کی سیاسی حیثیت کو قد آور بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ مزاری ایک بہت بڑی قوم ہے جس کے لیے نام لفظ "مزار" بمعنی شیر سے لیا گیا ہے۔ اس قوم میں شیر کی سی بہادری اور لومڑی کی سی عیاری اور چالاکی پائی جاتی ہے۔ انگریزوں کی سرپرستی میں مزاری قبیلے نے اپنے پورے علاقے میں حاکیت قائم کر لی جہاں قبیلے کے سردار کا حکم ہی قانون آئین اور اصول سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبیلے نے اپنی جیلیں اور عقوبت خانے بنائے جہاں لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے صرف ایک شخص کے حکم اور اشارے پر ہوتے تھے۔ آج بھی غریب اور مفلس لوگوں سے جبری مشقت لینا اس قبیلے کا شعار ہے۔

میر بلخ شیر مزاری کو ابتداء ہی سے سیاست سے دلچسپی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جب بلخ شیر مزاری اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے تو اس تقریب میں اس وقت کے گورنر پنجاب نے بھی شرکت کی۔ مزاری

خاندان کے سیاسی وڈیروں سے رابطے پہلے ہی مضبوط تھے۔ سیاست سے دلچسپی کی بناء پر اور خود کو منظر عام پر لانے کے لیے بلخ شیر مزاری نے بھی قبیلے کا سردار بنتے ہی اپنے رابطوں میں تیزی پیدا کر دی اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے۔ بلخ شیر مزاری نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ڈیرہ غازی خان ڈسٹرکٹ بورڈ کی چیئرمین شپ سے کیا اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

۱۹۵۱ء میں جب ممتاز دولتانہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو بلخ شیر مزاری ان کے فنانس سیکرٹری بن گئے۔ اس طرح سیاست میں ان کی براہ راست شمولیت نے علاقے میں ان کے رعب داب کو مزید بڑھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بلوچ جرگہ کے سردار بھی منتخب ہوگئے۔ دوسرے لفظوں میں اب پورے علاقے میں ان کی عملداری قائم ہوگئی۔ جون ۱۹۵۵ء میں سردار بلخ شیر مزاری مجلس دستور ساز کے رکن بن گئے۔ لیکن جب غلام محمد نے پہلی دستور ساز اسمبلی توڑی اور اسے دوبارہ بنایا تو اس وقت سردار بلخ شیر مزاری اپنی قد کاٹھ اس حد تک بڑھا چکے تھے کہ غلام محمد نے انہیں دوسری اسمبلی میں بھی شامل کر لیا۔

سردار میر بلخ شیر مزاری نے ایوبی دور میں ہونے والے انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور ان کے لیے ایک بھرپور مہم چلائی لیکن جب دھاندلی کے ذریعے محترمہ فاطمہ جناح کو ہرا دیا گیا تو انہیں اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کیونکہ الیکشن مہم کے دوران نواب آف کالا باغ ان سے ناراض ہوگئے تھے اور انہوں نے مزاری خاندان کے روایتی سیاسی حریف لغاری خاندان کی بھرپور حمایت کی۔ نواب آف کالا باغ کی اس علاقے سے دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے بیٹے کی شادی سردار محمد خان لغاری کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔

سیاسی میدان میں سردار صاحب نے کیسی کیسی قلابازیاں کھائیں' اور اپنی وابستگیوں کو کیسے تبدیل کیا' یہ بھی ایک داستان ہے۔ بلخ شیر مزاری ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے کنونشن مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں پارٹی ٹکٹ نہ ملنے پر انہوں نے الیکشن میں حصہ

نہ لیا اور وہ کنونشن مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں آزاد امیدوار کے طور پر حصہ لیا اور کامیاب ہو گئے۔ سردار بلخ شیر مزاری نے اس موقع پر اپنی روایتی چالاکی اور سیاست سے کام لیا اور حالات کا اندازہ کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن کے ہم نوا بن گئے۔ حالات تبدیل ہوئے اور سیاسی منظر بدلا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو مزاری صاحب نے بھی ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اپنا قبلہ تبدیل کر لیا اور پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

مزاری کے لیے اب اپنی ان کاوشوں کے ثمرات سے دامن بھرنے کا موقع تھا۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سے قربت حاصل کر لی۔ جب بھٹو نے زرعی اصلاحات نافذ کیں تو اسی قربت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنے خاندانی مفادات کا بھرپور تحفظ کیا اور اپنی اراضی کو بچانے کے لیے فرضی کمپنیاں بنا کر اراضی ان کے نام منتقل کر دی۔ انھوں نے جو کمپنیاں بنائیں' ان میں یونائیٹڈ فارمز' پنجاب انڈس فارمز' پنجاب پروگریسو فارمز وغیرہ شامل تھیں۔ اس موقع پر میر بلخ شیر مزاری نے اپنی سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھایا اور قریبی دوستوں اور عزیزوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرایا اور ان کو من پسند ملازمتوں سے نوازا۔ ۱۹۷۱ء میں پیپلز پارٹی کی مقامی قیادت نے ان پر اختیارات اور اثر و رسوخ کے ناجائز استعمال' بے ضابطگیوں اور کرپشن کے سنگین ترین الزامات لگائے۔ میر بلخ شیر مزاری نے پیپلز ورکس پروگرام کو بھی اپنے ذاتی مفادات کے حصول میں استعمال کیا اور ذاتی فائدہ اٹھایا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں جب انتخابی دھاندلیوں کے تمام تر سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے تو سردار مزاری پر ایک بار پھر کڑا وقت آیا۔ ان انتخابات میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے انتخابی دھاندلی کے خلاف جب قومی اتحاد نے ملک گیر تحریک شروع کی اور حالات دگرگوں ہونے لگے تو اس کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سردار صاحب نے پیپلز پارٹی سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ قومی اتحاد کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور قومی اتحاد کے رہنماؤں سے مل رہے تھے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء

نافذ کیا تو اب ان کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ضیاء الحق کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ انہیں مارشل لاء کے دوران اپنا سیاسی مستقبل ایک بار پھر تاریک ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس وقت جنرل ضیاء الحق کو مجلس شوریٰ کے قیام کے لیے رہنماؤں کی ضرورت پڑی تو سردار بلخ شیر مزاری سرگرم عمل ہوگئے اور انہوں نے ضیاء الحق کو اس انداز سے اپنی وابستگی اور وفاداری کا یقین دلایا کہ جنرل ضیاء الحق نے اس کے صلے میں انہیں مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کر دیا۔ اس طرح سردار بلخ شیر مزاری وابستگیاں تبدیل کرتے ہوئے اور سیاسی قلابازیاں کھاتے ہوئے جنرل ضیاء کے "پروانوں" میں شامل ہوگئے۔

بلخ شیر مزاری ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے جونیجو حکومت کے دوران اپنے خاندان' قبیلے کے افراد اور دوستوں کو نوازنے کا کام جاری رکھا اور ضیاء الحق کی قربت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے۔ جونیجو حکومت میں سردار بلخ شیر مزاری وزارت کے لیے بھی بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ جونیجو حکومت کے آخری ایام میں انہیں وزارت داخلہ کا قلم دان سونپا جانے لگا تھا لیکن ان کی یہ خواہش اس وقت دم توڑ گئی جب ضیاء الحق نے پوری اسمبلی کو ہی توڑ ڈالا۔

۱۹۸۸ء کا دور آیا تو قومی انتخابات میں سردار بلخ شیر مزاری کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ مگر انہوں نے اپنے سیاسی تجربے اور اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اہلیہ بیگم در شہوار مزاری کو خواتین کی مخصوص نشست پر کامیاب کرایا اور اس طرح اپنے خاندانی مفادات کے تحفظ کا بندوبست کیا۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے آئی جے آئی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور آئی جے آئی کے ٹکٹ پر الیکشن میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ان کے تعلقات ہمیشہ "بڑی سرکار" سے رہے۔ اور جب بھی کوئی تبدیلی آئی' ان کے لیے اچھا موقع لائی۔ جس سے مزاری صاحب نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۳ء میں جب غلام اسحاق نے نواز شریف حکومت برخاست کی تو بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس طرح مزاری صاحب کا اس ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہونے کا خواب پورا ہوگیا۔

نگران حکومت کے دور میں نگران وزیراعظم پاکستان شیر بلخ مزاری "جدی سرکار" کے حکم پر لیس سر کتے رہے اور انہوں نے ملکی مسائل اور قومی نوعیت کے اہم امور پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بہت پہلے اپنی سیاسی بصیرت سے آئندہ آنے والے حالات کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے بے نظیر بھٹو سے اپنے تعلقات بہتر بنانا شروع کر دیئے تھے یہاں تک کہ وہ نگران وزیراعظم کی حیثیت سے بے نظیر کے مشوروں پر عمل کرتے رہے۔

انہوں نے نگران وزیراعظم بنتے ہی اپنے روایتی حربے استعمال کیے اور بڑی حد تک اپنے اقربا اور قریبی ساتھیوں کو نوازتے رہے۔ انہوں نے موٹروے پر ہونے والے کام کو بند کروا دیا۔ سمال بزنس سکیم کے تحت دیئے جانے والے قرضوں پر پابندی لگا دی۔ ییلو کیب سکیم روک دی گئی اور انتخابات میں بے نظیر کو کامیاب کرانے کے لیے ضلعی انتظامیہ تک کو ہدایات خود جاری کرتے رہے۔ وہ دراصل بے نظیر بھٹو کو اب اپنی وفاداریوں کا بھرپور یقین دلانا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے راستہ ہموار کرنے میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنے صوابدیدی فنڈ سے ۵۷ لاکھ روپے کے ۳۴۸ چیک غریبوں کے نام پر تقسیم کیے لیکن یہ چیک "سیاسی غریبوں" کے ہاتھوں لگے۔

جی ایم سید

جی ایم سید کا تعلق سندھ کے ایک سادات گھرانے سے تھا۔ بعض روایات کے مطابق ان کا سلسلہ امام موسیٰ کاظمؑ کے فرزند جعفر ثانی ابجواری سے ملتا ہے۔ سندھ میں ان کے جد امجد سید حیدر کی آمد ۱۸۰۱ء میں امیر تیمور کے ہندوستان میں آنے کے وقت ہوئی۔ وہ اپنے والد سید امیر علی کے ساتھ ہرات سے ملتان آئے۔ یہاں وہ سیر و سیاحت کی غرض سے علیحدہ ہوگئے اور سندھ کے ایک گاؤں ہالہ میں آکر آباد ہوئے اور یہاں ارباب شاہ محمد ہالو کے ہاں شادی کر کے یہیں کے ہو رہے۔ پھر کچھ مدت بعد مٹیاری میں بس گئے۔ ان دنوں سندھ پر جام نظام الدین سموں کی حکومت تھی۔ اس وقت لکی سے لے کر کوٹڑی تک کے حصے پر ایک سرکش چانگ قبیلہ آباد تھا جو حکومت اور عوام کو تنگ کیا کرتا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے سید سخی ابراہیم شاہ کے فرزند سید بدر الدین نے جام نظام الدین کی مدد کی۔ سرکوبی کے عوض ملی ہوئی جاگیر کو سنبھالنے کے لیے سید بدر الدین شاہ سن گاؤں میں ۹ صدی ہجری کے آخر میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے سات بیٹے تھے جن میں سے سید جیو شاہ کے ہاں دو بیٹے سید جرار اور سید حیدر شاہ پیدا ہوئے۔ جی ایم سید کے والد سید میاں محمد شاہ، سید حیدر شاہ کے تیرہویں سجادہ نشین تھے جو خاندانی رقابت کی بناء پر قتل کر دیئے گئے جن کے بعد جی ایم سید کے بڑے بھائی بھی کم عمری میں انتقال کر گئے اور خاندان کی نرینہ اولاد میں صرف ایک چھوٹا بیٹا (بچہ) جی ایم سید باقی رہ گیا۔

جی ایم سید نے اپنی زندگی کا آغاز سماجی سرگرمیوں سے کیا۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے سماجی اصلاح کی ایک انجمن قائم کی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں سندھ کے پیروں اور سادات کی ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے مقاصد میں رسومات بد سے اجتناب' بدعتوں کا انسداد' کفایت شعاری کے شعور کی بیداری اور فروغ تعلیم شامل تھے۔ انہی سرگرمیوں کے دوران ہی جی ایم سید نے اپنی سیاسی زندگی کا بھی آغاز کیا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک وہ کراچی سندھ پراونشل کواپریٹو سوسائٹی کے ڈائریکٹر رہے۔ اسی دوران انہوں نے لوئر سندھ زمیندارہ بنک قائم کیا۔ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد ۱۹۳۷ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس میں وہ رکن منتخب ہوگئے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۳۹ء میں سندھ مسلم لیگ کو فعال اور موثر بنانے کے لیے سر حاجی عبداللہ ہارون نے جی ایم سید کو گاڑی' لاؤڈ سپیکر اور وسیع لٹریچر فراہم کر دیا۔ جس پر انہوں نے سندھ کے ہر گاؤں' بستی' یہاں تک کہ قریہ قریہ گوشہ گوشہ لیگ کا پیغام اس انداز کے ساتھ پہنچایا کہ پورا سندھ اللہ اکبر کے نعروں سے گونجنے لگا۔

۱۹۴۰ء میں سندھ مسلم لیگ کی سالانہ تنظیم نو کے نتیجے میں جی ایم سید اس کے نائب صدر اور دسمبر ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے پروپیگنڈے کے لیے ایک کتابچہ بھی شائع کیا جس میں انہوں نے قائداعظم کی جدوجہد کی تعریف اور صفات بیان کیں۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۲ء کو سندھ مسلم لیگ کے صدر سر حاجی عبداللہ ہارون کی وفات کے بعد سندھ مسلم لیگ کے صدر بنے۔

تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی۔ انگریزوں نے جب قائداعظم کو مسلم اکثریت کے کسی بھی صوبے سے اپنی اکثریت ثابت کرنے کو کہا تو پنجاب کے سر سکندر حیات اور سرحد کے وزیر علی ڈاکٹر خان صاحب سے مایوس ہونے کے بعد قائداعظم نے سندھ سے رابطہ کیا۔ اس موقع پر بھرچونڈی کے پیر عبدالرحمان نے جو ایک روحانی پیشوا بھی تھے اور اسمبلی میں ان کے کئی ایک معتقد بھی' مگر ان کی اکثریت انگریزوں کے ساتھ تھی' ایک ایک ممبر سے خود جا کر کہا کہ وہ اسمبلی کے اجلاس میں

تحریک پاکستان کی تائید میں ووٹ دیں اور تحریک کی حمایت کریں۔ ۳ مارچ ۱۹۴۳ء میں جی ایم سید نے سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کی اور دو قومی نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں اور رہنماؤں کو مخاطب کر کے کہا:

"جو مسلمان اقلیتی صوبوں میں رہتے ہیں' وہ وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آئیں کیونکہ انہیں وہاں ترقی کے مواقع کم ملیں گے۔ وہ یہاں آ کر ہماری مدد کریں اور مسلمان آپس میں مل کر اپنی ترقی کے لیے کام کریں"۔

جی ایم سید کے سندھ مسلم لیگ کا صدر بنتے ہی مسلم لیگ میں پارٹی بازی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے سندھ مسلم لیگ میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنے لوگوں کو عہدے اور ٹکٹ دینے کی کوشش کی۔ سیکرٹری کے عہدہ کے لیے غلام حیدر شاہ کا نام پیش کیا گیا جو کہ ایک غیر معروف نام تھا۔ یہاں تک انہوں نے کئی ایک نامزدگیاں اپنی مرضی سے کیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سید لیگ بنا رہے ہوں۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ سندھ کی حکومت پارٹی کے تحت رہے۔ اس وقت سر غلام حسین وزیر اعلیٰ سندھ تھے اور جی ایم سید صدر مسلم لیگ سندھ' محاذ آرائی دوبارہ بڑھ گئی تو قائداعظم نے دونوں رہنماؤں کو بمبئی بلوا لیا اور بیس گھنٹے تک ان سے تفصیلی گفتگو کی اور اختلاف دور کرنے کی کوشش کی۔ جی ایم سید نے سر غلام حسین کی وزارت کو شکست سے بھی دو چار کیا جس کی وجہ سے مخالف گروپ وزارت میں شامل ہو گیا۔ جی ایم سید نے قائداعظم کو تار روانہ کیا جس کے جواب میں قائداعظم نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو کہا:

"آپ کو مزید مشورہ دینا بے کار اور بے سود ہے"۔

جی ایم سید سر غلام حسین کو تو نہ کرا سکے' البتہ مسلم لیگ میں خود ان کی اپنی پوزیشن کمزور ہونے لگی تو مرکزی قیادت سے معافی طلب کی مگر آگے چل کر سندھ پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کی پھر خلاف ورزی کی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اسمبلی کی نشستوں کے سلسلے میں مرکزی پارلیمنٹری بورڈ' جس میں قائداعظم بھی شامل تھے' کراچی میں ان کے سامنے ان کا فیصلہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ قائداعظم نے بار بار انہیں اپنے رویے میں تبدیلی کا احساس دلایا مگر وہ نہ مانے۔ اس طرح ۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو جی ایم

سید مسلم لیگ سے فارغ ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد جی ایم سید نے حزب اختلاف کی سیاست اختیار کی۔ ۳۰ مئی ۱۹۴۸ء کو انہوں نے صوبہ سرحد کے سیاسی رہنما خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر ایک سیاسی جماعت بنائی' جس کا نام پیپلز پارٹی آف پاکستان رکھا گیا۔ غفار خان اس سیاسی جماعت کے صدر اور جی ایم سید اس کے جنرل سیکرٹری بنے۔ یہ پاکستان کی پہلی سیاسی جماعت تھی۔ اس کے قیام کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرخپوش جماعت پیپلز پارٹی آف پاکستان کی فوج کی حیثیت سے کام کرے گی۔ ۱۹۴۸ء ہی میں جی ایم سید نے کراچی کو سندھ سے علیحدگی کے خلاف تحریک چلائی۔ جس پر انہیں ان کے آبائی گاؤں سن میں نظربند کر دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسمبلی میں انہوں نے ون یونٹ کی مخالفت کی جس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ کے قیام کے بعد وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے قیام کے لیے فعال کردار ادا کیا۔ ایوب خان کے مارشل لاء میں زیادہ تر وقت قید و بند میں بسر ہوا اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش رہے۔ دوبارہ سیاست میں آئے تو ایک نیا روپ سامنے آیا۔ یعنی وہ سندھ کا اسلام ہی سے رشتہ منقطع کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً ہندوستان سے شائع ہونے والی اپنی کتاب "سندھو جی سیا جاہ" میں انہوں نے بہت سے انکشافات کیے۔ صفحہ ۵۷ تا ۶۰ پر لکھتے ہیں:

"عربوں نے سندھ میں اسلام کے نام پر جو مذہب مسلط کیا' وہ نفاق' تشدد اور نفرت سے بھرپور اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف تھا لیکن عرب اور اس کے پیروکار اپنے مستقل مفاد کی حفاظت کے لیے اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ جب سندھ کے راجہ داہر کو معلوم ہوا کہ عربوں نے رسول خداؐ کے نواسے امام حسینؓ کو تنگ کیا ہے اور انہیں مارنا چاہتے ہیں تو انہوں نے امامؓ کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ سندھ آئیں گے تو انہیں پناہ دی جائے گی۔ اس پیغام کے بعد امام عالی مقامؓ مع اپنے اہل و عیال سندھ روانہ ہوئے لیکن بنو امیہ کے بادشاہ یزید نے اپنے سپہ سالار کے ذریعے امامؓ کو شہید کیا اور ان کے اہل و عیال اور حامیوں کو تنگ کیا۔"

۱۹۷۰ء کے بعد جی ایم سید نے انتخابات میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ کیونکہ وہ

میزہ کے انتخاب میں شکست سے دو چار ہوئے۔ لیکن اپنی تحریروں' تقریروں کے ذریعے وہ اہل سندھ کو پاکستان سے برگشتہ کرتے رہے۔ ناقدین کے مطابق جی ایم سید کو عوام کی طاقت پر کبھی یقین نہیں رہا۔ جی ایم سید کی سیاست کا محور ہمیشہ وڈیرے' بااثر لوگ اور یونیورسٹی کے سرپھرے نوجوان رہے۔ اپنی کتاب "اب پاکستان ٹوٹ جانا چاہیے" میں لکھتے ہیں:

"اگر مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم سمجھنا چاہیے مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں وہ ایک قوم نہیں رہے۔ انہوں نے آپس میں جنگیں لڑیں' ایک دوسرے کا خون بہایا اور اس وقت بھی پنجابی' سندھیوں' بلوچوں اور پٹھانوں کو غلام بنائے بیٹھے ہیں۔ ایران اور عراق جنگ میں مصروف ہیں۔ پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایک قوم کہنا تاریخی غلطی ہے۔ اسلام نہ جدا دین تھا' نہ اسے جدا دین کہلانا مقصود تھا۔ عرب سامراج کی طرف سے اس کے بنیادی اصولوں کو رد کر کے ایک جدا اور مکمل دین بنا دیا گیا"۔

پاکستان کے بارے میں جی ایم سید کے نظریات ——— کہتے ہیں:

"پاکستان انگریز سامراج کی پالیسی کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ پاکستان کو دنیا کی بڑی اسلامی مملکت قرار دینا وغیرہ یہ سب انگریز کے ایجاد کردہ تصورات تھے۔ انگریز سامراج کی جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔ اب وہ مسلم ممالک کے اتحاد کے نام پر پاکستان کو سرمایہ دار ممالک کی مدد سے اپنا آلہ کار بنا رہا ہے"۔

وہ تمام برائیوں کی جڑ "پنجاب سامراج" کو قرار دیتے ۔ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"ہر بات جو اہل پنجاب کو ناپسند ہو' وہ ہمیں پسند ہے۔ جب تک پاکستان ہے تب تک پاکستان کے اندر ہم کسی اچھائی کی توقع نہیں کر سکتے۔ یہ ببول سے بیر حاصل کرنے کے مترادف ہوگا"۔

پیر صاحب پگاڑہ کے پوچھنے پر کہ بقول آپ کے ہندوستان سے الحاق کیا جائے تو کیا پھر آپ ہمیں ہندوؤں کے ماتحت لانا چاہتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا:

"گدھے کی لات سے ہاتھی کی لات بہتر ہے۔ مار تو دے گی۔ ہندوستان ہمارا

سہارا بن سکتا ہے جس میں ہمدرد ہندوؤں کی کثیر تعداد رہتی ہے جو سندھ چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن اس ملک کی یاد انہیں اب تک ستاتی ہے"۔

سندھ میں خصوصی چھاؤنیوں سے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ فوجی چھاؤنیوں کے ذریعے سندھ کی لاکھوں ایکڑ زمین پر قبضہ کیا جا رہا ہے۔ چھاؤنیوں سے سندھ معاشی لحاظ سے مضبوط ہو جائے گا۔ ویسے سندھ کی آزادی چھاؤنیوں کے قیام سے نہیں روکی جا سکے گی۔ میرے کہنے یا تحریک کی جدوجہد سے اگر سندھ آزاد نہ ہوا تو پاکستان کے حکمران جس طرح غیر آئینی اور غیر اخلاقی طریقے سے حکومت چلا رہے ہیں' ان کے کرتوتوں سے ضرور ٹوٹ جائے گا اور ایک دن اقوام متحدہ میں آزاد سندھ کا جھنڈا لہرائے گا۔

بے نظیر سے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ پنجابیوں کی خوشنودی کے لیے اپنے باپ کی طرح مصروف ہے۔ مگر یہ ڈرپوک سیاست دان ہے۔ تھوڑے سے دباؤ پر اپنے اصولوں سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ یہی مثال ولی خان اور الطاف حسین کی ہے۔ ویسے بے نظیر سندھ کی سب سے بڑی غدار ہے۔ وہ اقتدار کی ہوس میں پنجابیوں کی چاپلوسی کرتی ہے۔

غداری کا مقدمہ چلنے پر عدالت میں حاضر نہ کرنے کے بارے میں کہا کہ مجھے کورٹ میں اس لیے حاضر نہیں کیا جا رہا کہ میں نے جو پونے چار سو صفحات کا بیان تیار کیا ہے' اگر وہ عدالت میں پیش ہو گیا تو بہت سے چہروں سے نقاب اڑ جائیں گے۔ اس میں' میں نے لکھا ہے کہ ہم نے پاکستان بنا کر پاکستان کی کیوں مخالفت کی اور اس کے جو دلائل میں نے دیئے ہیں' اگر موجودہ حکمران بھی پڑھ لیں اور سن لیں تو پاکستان سے نفرت کرنے لگیں۔

سندھ میں کچی شراب کی تیاری کی سب سے بڑی جگہ جی ایم سید کا گاؤں سن ہے جہاں سینکڑوں من کچی شراب تیار ہوتی ہے اور بڑی مقدار میں ضلع نوشہرو فیروز میں سپلائی ہوتی ہے۔ دودھ والے ڈرم بھر کر دریا کے راستے نواب شاہ ضلع میں' دادو مورو پل پار کر کے نوشہرو فیروز ضلع میں اور براہ راست روڈ کے ذریعے حیدرآباد بھجوائی جاتی ہے۔

جی ایم سید کہتے رہے ہے کہ اب سندھی اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ وہ مہاجروں اور پنجابیوں کی غلامی میں ایک لمحہ اپنے سے منکر ہیں۔ پاکستان اگر جنت ہے تو ہمیں آزاد سندھ چاہیے۔ خواہ وہ دوزخ ہی کیوں نہ ہو' ہمیں قبول ہے۔ سندھیوں کی لیے یہی خوشی کیا کم ہوگی کہ وہ غلامی سے آزاد ہو کر اقوام متحدہ کے رکن بنیں گے۔ اسلامی نظام اور شریعت کا ڈھونگ رچا کر مہاجر پنجابی سامراجی پاکستان کو اس کے انجام سے نہیں بچا سکیں گے۔

سول سروس اور فوج طاقت کے سرچشمے ہیں اور یہ دونوں پنجاب کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم لڑ کر پنجاب سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ ہم بین الاقوامی حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس سے ہماری منزل قریب آ جائے۔

اسلام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام کو موجودہ دور کے مطابق تبدیل کرنا پڑے گا۔ پاکستان میں جتنے حکمران آئے ہیں ضیاء ان سب سے زیادہ شریف اور بااخلاق تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کفر ہوں اور وہ اسلام۔ مگر اس کے باوجود وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ یہ ان کی شرافت ہے۔ ضیاء بھٹو سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ وہ منافق نہیں تھا' صاف بات کرتا تھا۔

اسلام میں سیاسی فکر نہیں ہے۔ اسلام میں کوئی نظام حکومت نہیں۔ اسلامی سیاست اور آئین دقیانوسی باتیں ہیں۔ اسلامی سیاست کا تعلق اس دور سے ہے جب لوگ بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ایٹم کا دور ہے۔ اس میں یہ تمام باتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "سندھو جی سانجہائی" میں لکھا ہے کہ اسلام مکمل دین نہیں ہے۔

پنجاب کے بارے میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ طاقت کے زور سے پنجاب سے علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی طرح علیحدہ ہو بھی جائیں تو اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ بنگلہ دیش علیحدہ ہوا مگر وہ امریکہ کا ایجنٹ بن گیا اور وہاں سے جمہوریت رخصت ہو گئی اور ان کے مسائل حل نہ ہو سکے۔ اگر ہم علیحدہ ہو گئے تو ہماری حالت بھی بنگلہ دیش جیسی ہو جائے گی۔ ہم بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن چاہتے ہیں۔ ہم دفاع' کرنسی

اور چند دوسرے شعبے بھارت کو دے دیں گے اور باقی معاملات خود طے کریں گے۔ اس حوالے سے بھارت میں سکھوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ امریکہ کے پیسے پر ہو رہا ہے اور سب کچھ امریکہ کروا رہا ہے۔ سکھوں کا مذہب ہندو، مسلمانوں کا مکسچر ہے۔ یہ ان کے مذہبی اصول کے خلاف ہے کہ وہ علیحدہ دیش کی بات کریں۔ یہ سب دھوکہ ہے۔

سندھو دیش بننے کے بعد زرعی اراضی پر صرف سندھیوں کا قبضہ قانونی تسلیم کیا جائے گا اور باہر سے آنے والوں کی زمین ضبط کر لی جائے گی۔ سندھ کے تمام کاروبار غاصبوں سے چھین کر سندھیوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ بنکوں، کارخانوں اور دکانوں پر صرف سندھیوں کی ملکیت کو تسلیم کیا جائے گا۔ کارخانوں اور فیکٹریوں میں غیر سندھی ملازموں اور مزدوروں کی بجائے صرف سندھی مزدور رکھے جائیں گے۔

سندھ کی آزادی کے بعد ملک کی قومی اور سرکاری زبان صرف سندھی ہوگی۔ کسی شخص کو جسے سندھی زبان سے واقفیت نہیں ہوگی، شہری حقوق نہیں دیئے جائیں گے۔ انھیں ووٹ کا حق بھی حاصل نہیں ہوگا اور وہ کسی محکمے، ادارے یا سرکاری شعبے میں ملازمت نہیں کر سکیں گے۔ اگر کسی نے زبان سے متعلق آزاد سندھ حکومت کے موقف سے اختلاف کیا تو اسے بنگلہ دیش کی طرح ملک سے باہر نکال دیا جائے گا۔ سندھی ثقافت کو ترقی دی جائے گی اور پان کھانے پر سختی سے پابندی ہوگی۔

حامد ناصر چٹھہ

حامد ناصر چٹھہ کو اگر ۱۹۹۳ سے نومبر ۱۹۹۶ تک کے بے نظیر حکومت کی طاقتور ترین شخصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف سیاسی تبدیلیوں میں بادشاہ گر کی حیثیت سے قومی سیاست کے افق پر نمودار ہوئے اور فیصلہ کن قوت کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ج) کو پنجاب میں وزارت اعلیٰ دلوانے میں کامیاب ہوگئے۔ حامد ناصر چٹھہ غیر اعلانیہ ڈپٹی پرائم منسٹر کے طور پر وہ تمام مفادات سمیٹتے رہے جو دیگر ارکان قومی اسمبلی یا ارکان کابینہ کو حاصل نہیں تھے۔

حامد ناصر چٹھہ کے آباؤ و اجداد کی خوشحالی کی وجہ وہ "تعاون" ہے جو انہوں نے انگریزوں کو گاہے بگاہے مہیا کیا۔ انگریزوں نے چٹھہ خاندان کے کئی افراد کو ۱۸۵۷ء کے بعد عہدے اور منصب دیئے۔ حامد ناصر چٹھہ کے والد چودھری صلاح الدین چٹھہ ۱۹۱۲ء میں وزیر آباد کے ایک قصبہ احمد نگر میں پیدا ہوئے۔ صلاح الدین چٹھہ نے ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور گوجرانوالہ میں پریکٹس شروع کر دی۔ یہیں سے صلاح الدین چٹھہ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ مسلم لیگ سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۴۶ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

صلاح الدین چٹھہ کی طرح حامد ناصر چٹھہ بھی مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور انہوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں زبردست شکست کھائی۔ مارشل لاء

حکومت میں حامد ناصر چٹھہ نے صوبائی وزیر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ فخر امام کے خلاف عدم اعتماد کے بعد حامد ناصر چٹھہ سپیکر اسمبلی بنائے گئے۔ حامد ناصر چٹھہ نے لاہور کی ایک فونڈری کے مالک میاں شریف کے بیٹے نواز شریف سے تعلقات استوار کیے۔ حامد ناصر چٹھہ ۸۸ء کے انتخابات میں بھی بست بری طرح ہار گئے۔

۹۰ء کے انتخابات کے نتائج نے میاں نواز شریف کو وزیر اعظم کے منصب پر پہنچا دیا۔ حامد ناصر چٹھہ نواز شریف کی کامیابی سے خوش نہیں تھے اور علیحدہ سے اپنا تشخص بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کے دوران ہی حامد ناصر چٹھہ نے مسلم لیگ میں موجود اپنے ہم مزاج اور قیادت سے ناراض لوگوں سے رابطے کرنا شروع کر دیئے۔ حامد ناصر چٹھہ نواز شریف کابینہ سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ (جونیجو) کے نام سے علیحدہ ہو گئے۔ بعد میں حامد ناصر چٹھہ پی ڈی ایف کے اتحادی بن گئے۔

۱۹۹۳ء میں بے نظیر حکومت قائم ہوئی تو حامد ناصر چٹھہ نے اپنی مٹھی بھر ارکان اسمبلی کے ساتھ بے نظیر کا ساتھ دیا اور بدلے میں پنجاب میں منظور وٹو کی صورت میں وزیر اعلیٰ بنوا لیا۔ میاں منظور وٹو نے مقدور بھر کوششیں کیں کہ کسی طرح حامد ناصر چٹھہ کو خوش رکھا جا سکے لیکن چونکہ میاں منظور احمد وٹو کے اپنے مزاج میں بدعنوانی اور اقرباء پروری اس حد تک بس چکی تھی کہ انہوں نے حامد ناصر چٹھہ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور وہ مالی فوائد جو وہ حامد ناصر چٹھہ کو پہنچا سکتے تھے' خود سمیٹنے لگے۔ منظور وٹو چونکہ مرکز میں بیٹھی بے نظیر کا مقابلہ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھے اس لیے انہیں حامد ناصر چٹھہ کی بے نظیر کے ساتھ "انڈر سٹینڈنگ" بہت کھٹکتی رہی اور انہوں نے حامد ناصر چٹھہ کو نظر انداز کر کے ظفر اللہ جمالی اور دیگر مسلم لیگیوں سے روابط مستحکم کرنا شروع کر دیئے۔

حامد ناصر چٹھہ کے سخت ناقدین کا خیال ہے کہ بے نظیر اور حامد ناصر چٹھہ میں بہت سی اقدار مماثل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ دونوں کے آباء و اجداد انگریز سامراج کے وفادار رہے ہیں اور اس کے علاوہ دونوں میں جاگیردارانہ مزاج کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اسی لیے ۹۳ء سے ۹۶ تک کی بے نظیر حکومت میں حامد ناصر

چٹھہ مسلم لیگ (ج) کو نظرانداز کرکے بے نظیر کے تیز نوں میں بیٹھے رہے اور انھوں نے بے نظیر سے کروڑوں روپے ترقیاتی فنڈز کی مد میں حاصل کر لیے۔

حامد ناصر چٹھہ نے بے نظیر حکومت میں پنجاب کی بیورو کریسی کو اپنے حلقہ انتخاب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کیا اور ان کا آبائی شہر احمد نگر چٹھہ بے نظیر دور حکومت میں سرکاری افسروں کے لیے سجدہ گاہ بنا رہا۔ پنجاب میں خصوصاً اور وفاقی سطح پر عموماً ہر قسم کے تقرر و تبادلے اور نامزدگیاں حامد ناصر چٹھہ کی مرضی کے بغیر ممکن نہ تھیں۔ یوں انگریزی راج کے مزے اڑانے والے خاندان کو ایک بار پھر بھرپور انداز میں اقتدار حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ حامد ناصر چٹھہ نے ترقیاتی فنڈز ہڑپ کرنے کے لیے چن چن کر اپنے "خاص" لوگوں کو گوجرانوالہ ڈویژن میں تعینات کروایا جن کی بدعنوانیوں اور عیاشیوں کا چرچا عام تھا۔ مذکورہ پولیس آفیسر اپنی بدعنوانیوں میں سے ایک خطیر رقم حامد ناصر چٹھہ کو کمیشن کے طور پر پہنچاتے رہے۔

گوجرانوالہ میں نواز شریف کی تحریک نجات کے دوران ایک مسلم لیگی کو تشدد کرکے ہلاک کرنے کے ذمہ دار ڈپٹی کمشنر جاوید سرور کو حامد ناصر چٹھہ نے خصوصی طور پر تعینات کرایا۔ گوجرانوالہ شہر اور دیگر قریبی علاقوں کے تمام ترقیاتی کام حامد ناصر چٹھہ کی وساطت سے مکمل ہوتے۔ حامد ناصر چٹھہ پر الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ ۳۰ فیصد کمیشن حاصل کرکے تمام منصوبے شروع کراتے۔ ڈپٹی کمشنر جاوید سرور گوجرانوالہ کی آدھی سے زیادہ انتظامی مشینری حامد ناصر چٹھہ کی خدمت پر معمور رکھتا جبکہ ڈویژنل انتظامیہ کی گاڑیاں اور چھوٹے درجے کے ملازمین حامد ناصر چٹھہ کی زمینوں اور ڈیرے پر مستقل تعینات رہتے۔

ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ جاوید سرور کے خلاف گوجرانوالہ کے عوام اور تمام سیاسی و غیر سیاسی حلقوں نے جلوس نکالے اور اس کے تبادلے کے لیے سینکڑوں درخواستیں پنجاب اور مرکزی حکومتوں کو ارسال کیں لیکن بے نظیر حکومت کے خاتمے کے دن تک جاوید سرور کو گوجرانوالہ سے تبدیل نہ کیا جا سکا اور اس کی بڑی وجہ حامد ناصر چٹھہ کی پشت پناہی تھی۔ جاوید سرور ڈویژن کے تمام محکموں سے روزانہ کے

حساب سے کمیشن وصول کرتا اور ایک قابل قدر حصہ اپنے آقا کو فراہم کرتا رہا۔

جاوید سرور کے ساتھ حامد ناصر چٹھہ کا تعلق پاکستانی سیاست کے متنازعہ ترین کردار جنرل رانی (اقلیم اختر رانی) کی بیٹی عروسہ عالم کے باعث تھا۔ جاوید سرور عروسہ عالم کا قریبی عزیز ہے اسی بناء پر عروسہ عالم خود بھی اس کمیشن میں سے معقول حصہ وصول کرتی رہی۔ حامد ناصر چٹھہ پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ ان کے عروسہ عالم کے ساتھ بہت قریبی تعلقات ہیں عروسہ اسلام آباد کے مقتدر حلقوں میں تقریباً اسی طرح اپنا اثر و رسوخ رکھتی تھی جس طرح جنرل رانی کا اس کی جوانی کے عالم میں اثر و رسوخ تھا۔ عروسہ عالم کی اس علاقے میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی مقامی شخص نے اپنے حلقے میں کسی پٹواری کا تبادلہ کرانا ہوتا تو بھی وہ براہ راست عروسہ عالم سے رابطہ کرتا اور مقدور بھر رشوت دے کر اپنا مطلب حاصل کرتا۔

گوجرانوالہ کے مشہور قصبہ تتلے عالی تھانہ کے ایس ایچ او کو ایک دن عروسہ عالم کا فون آیا کہ کالے رنگ کے چار بکرے ایک گھنٹہ کے اندر اندر چاہئیں۔ عروسہ کے فون کے بعد مذکورہ انسپکٹر نے علاقے میں پولیس ملازمین کو چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے چار کالے رنگ کے بکروں کا انتظام کریں ورنہ اپنی نوکری کا بندوبست کر لیں۔ غرض پولیس ملازمین چند منٹوں میں چار بکرے لے کر تھانے میں حاضر ہو گئے۔ یہ بکرے عقیدت و احترام کے ساتھ عروسہ عالم کو پہنچا دیئے گئے۔

حامد ناصر چٹھہ چونکہ اپنے اقتدار کو اپنے مخالفین کے لیے زیادہ استعمال کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے ہمیشہ مقامی انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ حامد ناصر چٹھہ نے بے نظیر دور میں اپنے دوست ایس ایس پی پولیس کو خوش رکھنے اور اسے قائم مقام ڈی آئی جی کی سیٹ پر دیکھنے کے لیے مہینوں گوجرانوالہ ڈویژن کی پولیس کو ڈی آئی جی سے محروم رکھا۔ چودھری احمد مختار' نواب زادہ غضنفر گل' مہدی حسن بھٹی اور عبداللہ ورک جیسے لوگ بھی حامد ناصر چٹھہ کی طاقت کے سامنے بے بس نظر آتے اور ان مذکورہ سیاست دانوں نے کئی بار کوشش کی کہ وہ کسی پولیس آفیسر کو گوجرانوالہ میں ڈی آئی جی کے عہدے پر تعینات کرا سکیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ حامد ناصر چٹھہ گوجرانوالہ کے مسلم لیگی رہنماؤں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ

جانے دیتے۔

خصوصی طور پر حامد ناصر چٹھہ نے اپنے حریف کرنل (ر) غلام سرور چیمہ کو مزہ چکھانے کے لیے گوجرانوالہ پولیس کی خدمات حاصل کیں۔ واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ ایک روز اسلام آباد میں واقع کرنل سرور چیمہ کے گھر سے ان کے نوجوان انجینئر بیٹے کو یرغمال بنا لیا گیا۔ کرنل (ر) غلام سرور چیمہ تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے بیٹے کا سراغ نہ لگا سکے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ ڈی ایس پی وزیر آباد نے ان کے بیٹے کو اس الزام کے تحت گرفتار کر لیا ہے کہ اس نے حامد ناصر چٹھہ کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ کرنل غلام سرور چیمہ کے بیٹے کی گمشدگی نے فوجی حلقوں کو بھی حیران کر دیا۔ فوج کی خفیہ ایجنسیوں نے اپنے طور پر اس کیس کو لیا اور کرنل غلام سرور چیمہ کو اس سارے ڈرامے کی تفصیلات مہیا کر دیں۔ بعد میں حامد ناصر چٹھہ کو اس کیس میں خاصی ندامت اٹھانا پڑی۔

گوجرانوالہ میں انکم ٹیکس کے ڈپٹی کمشنر کی بیوی عظمیٰ مجیب کا اغواء اور بعد ازاں روپوشی کی وارداتوں میں حامد ناصر چٹھہ کے عزیزوں کو ملوث کیا جاتا رہا۔ عظمیٰ مجیب کو اغواء کرنے والے حاذق بٹ کا قریبی تعلق حامد ناصر چٹھہ کے بیٹے فیاض چٹھہ اور عارف چٹھہ ایم پی اے کے بیٹے عاطف چٹھہ سے تھا۔ بعض حلقوں کے مطابق چٹھہ برادران عظمیٰ مجیب کی زلفوں کے اسیر ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنے مبینہ مقاصد کے لیے حاذق بٹ کو استعمال کیا۔ بعد ازاں ان افراد نے حاذق بٹ کو دن دھاڑے پولیس کی تحویل سے فرار کرا دیا۔ اصل میں حاذق بٹ کی گرفتاری اور تفتیش کی صورت میں چٹھہ برادران کے بارے میں انکشافات سامنے آ سکتے تھے اس لیے پولیس کو مجبور کیا گیا کہ وہ حاذق بٹ کو فرار ہونے میں مدد دے۔

حامد ناصر چٹھہ کی مدد سے ان کے قریبی عزیز نے میونسپل کارپوریشن گوجرانوالہ کے ایڈمنسٹر کے ذریعے شہر کی تاریخ میں پہلی بار "چھجہ ٹیکس" متعارف کرایا۔ کارپوریشن کی حدود میں جن گھروں' فیکٹریوں' دکانوں اور عمارتوں کا چھتا شیڈ بازار یا گلی میں نکلا ہوا تھا اس پر فی فٹ کے حساب سے ٹیکس لگایا گیا۔ "چھجہ ٹیکس" کا باقاعدہ ٹھیکہ عارف چٹھہ کے بیٹے عاطف چٹھہ کے پاس تھا۔ اس ٹیکس کے خلاف

گوجرانوالہ کے عوام نے زبردست احتجاجی مظاہرے کیے حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کے مقامی رہنما بھی اس مہم میں چٹھہ برادران کے خلاف مظاہروں میں شامل ہو گئے مگر یہ ٹھیکہ واپس نہ لیا گیا۔ ۳۵ لاکھ روپے میں حاصل کیے گئے اس ٹھیکے سے تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپے گوجرانوالہ کے عوام سے بٹورے گئے۔

حامد ناصر چٹھہ نے ۹۳ء کے انتخابات میں قومی و صوبائی اسمبلی کی نشستوں سے کامیاب ہونے کے بعد ایک ایسے شخص کو ممبر صوبائی اسمبلی منتخب کروایا جس نے حامد ناصر چٹھہ کی بدنامی میں اپنا پورا پورا حصہ ڈالا۔ عارف چٹھہ کی حرکات و سکنات نے پورے پنجاب میں شہرت حاصل کی۔

بے نظیر حکومت نے اپنے حامیوں اور حلیفوں کے مالی فائدے کے لیے ایک بڑا آسان طریقہ وضع کیا۔ مائع پٹرولیم گیس کے کنوؤں کی پیداوار کے پرمٹ مختلف لوگوں کو دیئے۔ بے نظیر حکومت نے پنجاب میں اپنے معاملات سلجھانے کے لیے مائع گیس کے گومی مسو، ضلع اٹک میں واقع کنوئیں سے ۲۰ ٹن روزانہ کا گیس پرمٹ انفنٹی گیس لاہور کے نام پر حامد ناصر چٹھہ کو جاری کیا۔ اس کنوئیں سے نکلنے والی گیس ۱۵۰ ڈالر فی ٹن کے حساب سے حامد ناصر چٹھہ کو پڑتی تھی جبکہ مذکورہ کمپنی اس مائع گیس کو ۳۰۰ ڈالر فی ٹن کے حساب سے واپس حکومت کو فروخت کرتی تھی۔ اس طرح حامد ناصر چٹھہ کی فرم تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار روپے روزانہ کماتی رہی اور حامد ناصر چٹھہ بے نظیر حکومت کے استحکام کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہے۔

خالد احمد کھرل

بے نظیر بھٹو کی دونوں حکومتوں کے دوران بڑی تیزی کے ساتھ ابھر کر منظر عام پر آنے والی سیاسی شخصیات میں خالد احمد کھرل بھی شامل تھے۔ خالد احمد کھرل' ملک مشتاق اعوان' جہانگیر بدر اور ناہید خان وغیرہ یہ وہ سیاسی لوگ تھے' جنہوں نے بے نظیر کی دونوں حکومتوں میں اپنی سیاسی معراج اسی کو تصور کیا کہ کسی نہ کسی طرح انھیں محترمہ بے نظیر بھٹو کی مکمل حمایت اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔ یہ تمام لوگ بہت حد تک اس "سیاسی مقصد حیات" میں کامیاب رہے اور اس کامیابی کے طفیل انہوں نے بے نظیر کی حکومتوں میں وہ تمام فوائد حاصل کر لیے' جنہیں حاصل کرنا ہمارے سیاسی پہلوانوں کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان سیاسی ادوار میں وہ "کارہائے نمایاں" سر انجام دیئے اور پوری قوت صرف کر کے جس نوعیت کی کرپشن اور بے قاعدگیاں فرمائیں' اس کی کوئی مثال آسانی کے ساتھ ملنا مشکل ہے۔

خالد احمد کھرل پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنی ایک طویل "سرکاری وابستگی کی تاریخ" رکھتے ہیں اور انہوں نے جس مہارت کے ساتھ ۷۷ کے انتخابات میں لاڑکانہ کے ڈپٹی کمشنر کے طور پر مستقبل کی "منصوبہ بندی" کی اس کی داد دیئے بغیر چارہ نہیں۔ خالد احمد کھرل نے اپنے "محبوب قائد" کو جس "سرکاری معاونت" کے ساتھ بلا مقابلہ منتخب کرایا' اس کو تمام لوگ جانتے ہیں۔

خالد احمد کھرل نے وزارت اطلاعات و نشریات کا قلمدان سنبھالتے ہی فوائد کشید کرنا شروع کر دیئے اور تیزی کے ساتھ اپنے من پسند لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر

فائز کر دیا۔ خالد احمد کھرل پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے وزارت اطلاعات و نشریات میں باقاعدہ کمیشن کے بل بوتے پر اعلیٰ عہدوں کی تقسیم شروع کی اور کروڑوں روپے وصول کر کے نئے لوگوں کو بھرتی کرایا اور پرانے لوگوں کو ان کی پسند کی اسامیوں پہ تعینات کیا۔ خالد کھرل کی زیر سربراہی حکومت کے نشریاتی اداروں میں "اعلیٰ نوعیت" کی کرپشن کا آغاز ہوا۔

خالد احمد کھرل نے جہاں دیگر بدعنوانیوں کو اپنا "سہارا" عطا کیا اور چیکے سے کمشن وصول کرنا شروع کیا' وہاں آصف علی زرداری سے دوستی کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور ترقیاتی فنڈز میں سے اپنا حصہ کشید کر لیا۔ خالد احمد کھرل پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے کمالیہ میں ترقیاتی کاموں کے نام پر تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں میں بانٹ دیا جبکہ ضلع میں ہونے والے تمام ترقیاتی کاموں سے بھی ۱۴ فیصد کمشن وصول کر لیا۔ خالد احمد کھرل نے "حکومتی تعاون" کے ساتھ اپنی ایک ٹیکسٹائل ملز قائم کی اور اس ملز کی آڑ میں بھی خالد کھرل نے کروڑوں روپے ہڑپ کر لیے۔

خالد احمد کھرل نے حکومتی سطح پر اپنی مضبوط حیثیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور بدعنوانی کے سب سے بڑے اور رائج الوقت انداز کو اپنایا۔ خالد احمد کھرل نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھٹی دے دی کہ وہ ہر حربہ استعمال کر کے علاقے میں زمینوں پر قبضہ کریں اور پیپلز پارٹی کی "مقبولیت" میں اضافہ کریں۔ خالد احمد کھرل نے جس طرح کمالیہ میں ایک رکن صوبائی اسمبلی کی خالی ہونے والی نشست پر ضمنی انتخاب کے دوران حکومتی خزانے کے منہ کھول دیئے اور ملکی خزانے کو جو نقصان پہنچایا' یہ ایک حیران کن اور عبرت ناک داستان ہے۔

خالد احمد کھرل نے اپنے بیٹے اور دیگر عزیزوں کو یہ ٹارگٹ سونپا کہ وہ علاقے میں کھرل خاندان کی زمینداری کو وسیع کریں اور ساتھ لگنے والی زمینوں کی اونے پونے داموں خرید کے علاوہ قبضہ بھی کر لیں کیونکہ وہ بالآخر ایک طاقتور وفاقی وزیر ہیں۔ جو تمام معاملات کو کنٹرول کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مئی ۱۹۹۶ء میں خالد احمد کھرل کے پرجوش صاحبزادے حیدر خان کھرل نے کمالیہ رجانہ روڈ پر

واقع زرخیز ترین زرعی اراضی کے ایک ڈیڑھ سو ایکڑ کے قطع پر قبضہ کر لیا۔ خالد کھرل کے صاحبزادے نے غریب مزاروں کی زیر کاشت اراضی پر قبضہ عین اس وقت کیا' جب ان کی جان توڑ محنت کے بعد گندم کی فصل بالکل تیار تھی اور وہ گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔

طاقتور ترین وزیر خالد احمد کھرل کے صاحبزادے نے مسلح افراد کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ قبضہ کے لیے کارروائی کی تھی۔ اس دوران غریب مزاروں کی گندم کی فصل بھی اٹھالی گئی۔ ان کے مکانوں کو مسمار کر دیا گیا اور کھیتوں میں بنی جھونپڑیوں کو بھی آگ لگا دی گئی۔ خالد احمد کھرل جو اس آپریشن کی موبائل فون پر نگرانی کر رہے تھے' انہیں لمحہ لمحہ کی رپورٹ دی گئی اور تمام اقدامات ان کی ہدایات کے مطابق بروئے کار لائے گئے۔

جس اراضی پر خالد احمد کھرل گروپ کے مسلح افراد نے قبضہ کیا تھا' اس کے لیے خالد کھرل بہت عرصے سے بے تاب تھے اور انہوں نے اراضی کے اصل مالک سابق ایس پی پولیس کے بیٹے اور بیٹیوں سے پہلے بھی زمین حوالے کر دینے کا کہا تھا لیکن وہ لوگ ان کی اصل "طاقت" کا اندازہ نہ کر سکے اور انہوں نے زمین اونے پونے داموں خالد کھرل کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جس کے تمام مطالبے اس وقت کی حکومت آنکھ جھپکنے سے پہلے پوری کرتی تھی' ان کی اس چھوٹی سی "خواہش" کو پورا نہ کیا جاتا۔

خالد احمد کھرل کے بیٹے نے قبضے کے لیے اتنا زبردست آپریشن کیا کہ غریب مزارے زمینیں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور پورے کمالیہ میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ان مظلوموں کو پناہ دیتا۔ یہ مزارے کمالیہ سے فرار ہو کر لاہور پہنچ گئے اور پنجاب اسمبلی کے اجلاس کے دوران اسمبلی ہال کے سامنے دھرنا دینے کی کوشش کی لیکن اسلام آباد میں بیٹھے خالد احمد کھرل نے وزیر اعلیٰ پنجاب کو اور گورنر پنجاب کو فون کر کے مزارعوں کو مال روڈ سے بھگا دیا۔ انہیں خالد کھرل گروپ کے مسلح افراد نے قتل کی دھمکیاں دیں اور عدالت میں جانے کی صورت میں ان کو پیشگی بتا دیا کہ وہ کبھی بھی کمالیہ کی زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکیں گے۔

اس قیمتی اراضی پر خالد احمد کھرل کے گروپ کے قبضے کی داستان اس طرح ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک ایس پی پولیس عبیداللہ خان کو حکومت نے ۱۹۵۶ء کی زرعی اراضی کی آباد کاری سکیم "۲۰ سالہ ٹیوب ویل سکیم" کے تحت ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں چک نمبر ۲۷۰ گ ب میں ۴۴۳ کنال اور ۸ مرلہ اراضی الاٹ ہوئی۔ مذکورہ ایس پی پولیس نے اس اراضی کو آباد کرنا چاہا اور زمین کے کچھ حصہ پر مزارعے بٹھا لیے۔ ذوالفقار علی بھٹو دور میں کی گئی زرعی اصلاحات میں ایوب خان دور کی آبادکاری سکیم توڑ دی گئی۔ لیکن عبیداللہ خان نے حکومت کے اس فیصلے کو عدالت عالیہ میں چیلنج کر دیا اور عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ حکم امتناعی حاصل کرنے کے بعد زمین عبیداللہ خان اور اس کے مزارعوں کے پاس رہی اور دونوں فریقین اس پر کاشتکاری کرتے رہے۔ اس سے پہلے عبیداللہ خان ۹ ایکڑ اراضی کسانوں مزارعوں کو فروخت کر چکے تھے اور مزارعوں نے رجسٹری بھی لکھوائی تھی اور عبیداللہ خان سے اس کا قبضہ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن محکمہ مال کے کاغذات حقداران زمین میں اس اراضی کا انتقال مزارعوں کے نام نہیں ہو سکا تھا۔ اس سودے کے فوراً بعد مزارعوں اور عبیداللہ خان میں جھگڑا ہو گیا۔ عبیداللہ خان خریدی ہوئی زمین اور مزروعہ زمین سے مزارعوں کو بے دخل کرنا چاہتا تھا لیکن مزارعوں کا موقف تھا کہ چونکہ عبیداللہ کو زمین حکومت کی طرف سے الاٹ ہوئی ہے اور مزارعوں نے دس سال سے زیادہ عرصہ اس پر کاشت کی ہے' اس لیے ان کو قانون کے مطابق مالکانہ حقوق دیے جائیں لیکن کوششوں کے باوجود مزارعے اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

کچھ عرصہ بعد مزارعوں اور عبیداللہ کے درمیان صلح ہو گئی اور تین مربع زمین پر مزارع کاشتکاری کرنے لگے اور باقی تین مربع عبیداللہ کے پاس رہی۔ عبیداللہ کی وفات کے بعد بھی مزارعوں اور عبیداللہ کے لواحقین کے درمیان زمین کے معاملات خوش اسلوبی سے طے پاتے رہے۔ عبیداللہ کے خاندان نے خود کاشت کاری ترک کر دی اور زمین ٹھیکے پر دینا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خاندان بھٹو دور میں حاصل کیے گئے زمین کے حکم امتناعی کے تحت وائر دیوانی مقدمہ بھی لڑتا رہا۔ اس خاندان نے ۱۹۸۸ء میں اپنے حصے کی تین مربع اراضی خالد احمد کھرل کو ٹھیکہ پر دی

جبکہ باقی نصف اراضی پر مزارع قابض رہے۔

خالد احمد کھرل سے ٹھیکہ لینے کے بعد عبداللہ خان کے بیٹے سعید اللہ اور بیٹیوں شہناز گل اور شہوار گل کو کہا گیا وہ یہ زمین فروخت کر دیں کیونکہ خالد کھرل خاندان اس رقبے پر بڑی ٹیکسٹائل مل لگانا چاہتا ہے۔ عبداللہ خاندان کے انکار کے باوجود خالد احمد کھرل نے پیر محل رجانہ روڈ پر ٹیکسٹائل مل لگا دی لیکن اس زمین کو حاصل کرنے کے جتن جاری رکھے۔ وفاقی وزیر محکمہ امتناعی کا کیس جو کمشنر فیصل آباد کے پاس تھا' اسے تبدیل کروا کر کمشنر سرگودھا کے پاس لے آیا۔ چونکہ اس وقت خالد کھرل حکومت میں تھے' اس لیے انہوں نے کمشنر سرگودھا پر دباؤ بڑھایا کہ وہ کیس کا فوری فیصلہ کرے۔ کمشنر سرگودھا کے پس و پیش کے بعد خالد احمد کھرل کیس لاہور کمشنر کے پاس لے آیا۔ اس دوران اس نے تمام اراضی خریدنے کی کوشش کی اور الاٹیوں کو ۵۷ لاکھ روپے کی پیشکش کی لیکن مزارع آڑے آ گئے اور یوں زمین کا سودا نہ ہو سکا۔ اس دوران اس متنازعہ زمین کا بیعہ نامہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن مالکوں نے بیعہ نامہ کرنے سے انکار کر دیا۔

وفاقی وزیر خالد کھرل کی طرف سے معاملہ طے کرنے کے لیے مزارعوں کو پنچایت میں طلب کیا گیا۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ اگر وفاقی وزیر زمین کے الاٹیوں سے زمین کا مختار نامہ حاصل کر کے عدالت سے مقدمہ جیت گئے تو پھر وہ صرف عبداللہ خان کی زمین تین مرلے اپنے پاس رکھیں گے اور جو زمین انہوں نے عبداللہ سے خریدی ہے ان پر ان کا قبضہ رہے گا۔

۱۹۹۵ء میں کمشنر لاہور کی عدالت نے حکومت کی بجائے عبداللہ خاندان کے حق میں کر دیا۔ خالد کھرل کے دباؤ پر حکومت نے عدالت کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہ کی اور نہ ہی مزارعوں کی طرف سے فریق بننے کے لیے دی جانے والی درخواستوں کی شنوائی دی گئی۔ جب عدالتی فیصلہ کے خلاف اپیل کرنے کی مدت گزر چکی تو خالد کھرل نے زمین کی ملکیت کا حتمی فیصلہ کرنے کے لیے مزارعوں کو طلب کر لیا۔

اس دوران خالد کھرل نے زمین کی ملکیت کے کاغذات الاٹیوں کے نام مکمل

کرا لیے اور ساری زمین کا انتقال اپنے بیٹے حیدر کھرل کے نام کرانے کی کوشش کی۔ چونکہ عبیداللہ کی ایک بیٹی وفات پا چکی تھی' اس لیے مزارعوں نے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی کہ پہلے اس زمین کا انتقال اصل مالکوں کے نام ہو اور جو زمین مزارع اصل مالکوں سے خرید چکے ہیں' اس کو مزارعوں کے نام منتقل کیا جائے یا پھر ان کو بھی ایک حصہ پر مالک تصور کیا جائے۔ کیونکہ اس زمین کو آباد کرنے میں انہوں نے ۳۰ برس تک محنت کی اس لیے پنچایت میں مزید فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد خالد کھرل کے بیٹے حیدر کھرل نے مقامی ڈی ایس پی پولیس کو ساتھ لیا اور مذکورہ زمین سے متعلقہ پٹواری کو گھر سے اٹھا لیا اور اس کے پاس موجود مزارعوں کی خرید کردہ اراضی کے گرداوریوں والا رجسٹر بھی چھین لیا۔ اس رجسٹر کے چھن جانے سے مزارعوں کے پاس زمین خریدنے کا کوئی ثبوت باقی نہ رہا۔ صرف وہی فوٹو کاپیاں باقی بچیں جو انہوں نے رجسٹر کے مختلف حصوں سے بطور ثبوت کروا رکھی تھیں۔ زمین کے اصل مالک وفاقی وزیر کے آگے بے بس ہوگئے اور انہوں نے اپنی رہائش لاہور منتقل کر لی اور زمین سے ایک حد تک لاتعلقی اختیار کر لی۔ ظاہر ہے اس کے پیچھے وفاقی وزیر کی طاقت کا خوف تھا۔

اس کے بعد خالد کھرل کے بیٹے نے سینکڑوں مسلح افراد کو ساتھ لیا اور غریب مزارعوں کی بستی پر بلہ بول دیا۔ مزارعے بھاگ گئے اور مالکان بھی روپوش ہو گئے۔ پولیس اور مقامی عدالتیں بالکل خاموش ہو گئیں۔ اس میں حملہ آوروں نے عورتوں اور بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ گھروں کو تباہ کر دیا اور ۲۰ ایکڑ پر کھڑی گندم کی فصل کاٹ لی۔ مزارع جان کے خوف سے بھاگ گئے اور مالکان روپوش ہوگئے اور ساری زمین خالد احمد کھرل کی ملکیت میں چلی گئی۔ نہ تو اصل مالک زبان کھولنے کو تیار ہوئے اور نہ ہی مزارعوں میں اتنی جرات تھی کہ وہ خالد کھرل سے ٹکر لے سکیں۔

اس کے علاوہ سابق بے نظیر دور میں سابق وزیر اطلاعات خالد کھرل نے پی ٹی وی کی ایم ڈی رعنا شیخ سے ۳۳ انچ والا سونی رنگین ٹی وی عطیہ کے طور پر حاصل کیا اور ۲ لاکھ ۲۹ ہزار روپے مالیت کا فرنیچر بھی پی ٹی وی کے خزانے سے حاصل کیا۔ یاد رہے کہ کمپنیز آرڈیننس ۱۹۸۴ء کی دفعہ ۱۹۷ کے تحت کسی سیاسی شخصیت' جماعت یا

ادارے کو تحفے تحائف دینے والی کمپنی کو ۱۰ ہزار روپے جرمانہ اور متعلقہ ذمہ دار آفیسر یا ڈائریکٹر کو دو سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو

ذوالفقار علی بھٹو ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو سر شاہنواز بھٹو کے گھر لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام لیڈی خورشید تھا۔ ابتدائی تعلیم لاڑکانہ سے حاصل کرنے کے بعد بمبئی سکول میں داخلہ لیا جہاں سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۳ سال کی عمر میں ذوالفقار علی بھٹو کی شادی ان کے اپنے خاندان کی ایک لڑکی امیر بیگم سے ہو گئی جس کی عمر ۹ سال تھی۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ بھٹو خاندان ایران سے تعلق رکھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے برکلے یونیورسٹی (کیلی فورنیا) سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے ایم۔ اے فلسفہ قانون میں کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۵۳ء میں لنکنزان یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک ساؤتھ ہیمٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون پڑھاتے رہے۔ وطن واپس آنے پر بھی سندھ مسلم لاء کالج میں بین الاقوامی قانون پڑھانا شروع کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۵۱ء میں نصرت بھٹو سے دوسری شادی کر لی۔ ۲ سال بعد ۱۹۵۳ء میں ان کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بے نظیر رکھا گیا اور ایک سال بعد مرتضیٰ بھٹو کی پیدائش ہوئی جبکہ ۱۹۵۷ء میں صنم بھٹو اور ۱۹۵۸ء میں شاہ نواز پیدا ہوئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ جب ملک میں ۱۹۵۸ء کو ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو بھٹو کو وزیر تجارت بنا دیا گیا۔ اسی سال جنیوا سمندری قانون کے بارے میں ہونے والی اقوام متحدہ کانفرنس میں

پاکستان کی نمائندگی کی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں پاکستانی وفد کے چیئرمین کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت کی اور مسئلہ جموں و کشمیر پر بھارت کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء میں وفد کی قیادت کی۔

محمد علی بوگرہ کی وفات کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۶۳ء کو وزیر خارجہ بنا دیئے گئے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل کے اجلاسوں میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ معاہدہ تاشقند (روس) کے بعد ایوب خان کے ساتھ اختلافات پیدا ہوگئے۔ اس طرح ایوب خان نے بھٹو کو وزارت خارجہ سے برطرف کر دیا۔

۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء کو بھٹو نے پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ ایوب خان نے ۱۹۶۸ء میں بھٹو کو سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر گرفتار کروا لیا جس پر ملک میں ہنگامے شروع ہوگئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھٹو کو کامیابی نصیب ہوئی تو ۱۹۷۱ء میں بھٹو نے اپنی کابینہ کی تشکیل کے مرحلہ کو طے کیا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین بنایا اور ملک میں نافذ کیا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد ملک میں ہڑتالوں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ ہنگامے پاکستانی قومی اتحاد کی طرف سے پیپلز پارٹی پر دھاندلی کے الزامات لگانے کے بعد رونما ہوئے۔ ۵ جولائی کو ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور بھٹو حکومت توڑ دی۔

ستمبر ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ہائی کورٹ نے ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء میں سزائے موت کا حکم سنایا۔ ۴ اپریل ۱۹۷۹ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور انہیں ان کے آبائی گاؤں گڑھی خدا بخش (لاڑکانہ) میں دفن کیا گیا۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۵۸ء میں ایوب آمریت میں شامل ہو کر اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ انہوں نے ایوب کابینہ میں بحیثیت وزیر تجارت حلف اٹھایا۔ وزارت کے وقت ذوالفقار علی بھٹو کی عمر صرف ۳۰ برس تھی اور یوں وہ اس وقت کے تمام وزیروں میں سب سے کم عمر وفاقی وزیر تھے۔

ـ ـ ـ ____________________ بھٹو مرحوم فن

. . . . . . درجہ کا بے حد شعور رکھتے تھے۔ لہٰذا جلد ہی انہیں

وزیر خارجہ کا منصب سونپ دیا گیا۔ بحیثیت وزیر خارجہ بھٹو مرحوم نے اپنی خارجہ ڈپلومیسی کی جس کے اثرات آج بھی برصغیر اور افغانستان میں پائے جاتے ہیں۔

ان کی ذات اقتدار کی ہوس اور حب الوطنی کا آمیزہ تھی۔ سیاسی شطرنج میں ان کے آئیڈیل نپولین بوناپارٹ تھے جبکہ سیاسی شہرت میں وہ نہرو سے خاصے متاثر تھے اور نہرو سے بڑے سیاسی لیڈر بننا چاہتے تھے۔ خود ان کی زبانی سنتے ہیں "میری اکیسویں سالگرہ جو ۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو لاس اینجلس میں منائی گئی۔ مجھے لاڑکانہ سے دو تحفے موصول ہوئے۔ ایک خاصی قیمتی دستاویز جو کہ نپولین بوناپارٹ کی ۵ جلدوں پر مشتمل سوانح عمری تھی اور دوسرا ایک سستا سا پمفلٹ تھا۔ نپولین سے میں نے طاقت کی سیاست کے گر سیکھے اور پمفلٹ سے میں نے غریبوں کی سیاست سمجھی"۔ اگر بھٹو تھوڑے سے اور مہربان ہوتے اور یہ سچ بتا سکتے کہ ان کی اچھی تعلیم غریبوں کی حمایت اور بہبود عامہ کی خواہش کے باوجود وہ اپنی ذات کے اندر چھپے ہوئے اس جاگیردارانہ مزاج پر قابو نہ پا سکے جو بچپن میں ہی ان کے ذہن میں سرایت کر چکا تھا۔

بھٹو کا مندرجہ بالا بیان جو کہ انہوں نے موت کی کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر لکھا' جس میں ہمیں بھٹو ذاتی طاقت کے حصول اور سماجی بہبود کی خواہش کے درمیان تقسیم نظر آتا ہے۔ تاہم یہ تضاد بھٹو نے خود ختم کیا اور وہ آہستہ آہستہ سماجی بہبود کو بھولتا چلا گیا اور اپنی سیاسی طاقت کو بڑھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ سماجی بہبود اور عوامی بھلائی صرف اس حد تک ہی رہ گئی جس حد تک وہ اس سے مزید طاقتور ہو سکتا تھا۔ اس کا اعتراف بھی خود بھٹو کی زبانی سننا چاہیے اوریانا فلاچی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ سیاست میں کوئی بھی محض عوامی بھلائی اور سیاسی شوق کی وجہ سے نہیں آتا بلکہ سیاست کا مقصد طاقت کا حصول اور اس کا استحکام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سیاست جاتا ہے' وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیاست دان آپ کو ہمیشہ یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ وہ اچھے' مہذب اور مستقل مزاج ہوتے ہیں مگر آپ ان کے دھوکے میں مت آیئے۔ دنیا میں اچھے' مہذب اور مستقل مزاج سیاست دان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ سب بوائے سکاؤٹس کے نصب العین ہیں اور میں بوائے سکاؤٹس کے نصب العین کو سکول سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بھول گیا تھا۔

بھٹو کے سیاسی نصب العین میں ذاتی سیاسی اقتدار کی انتہائی ہوس کا نتیجہ ہی انھیں ایوب خان سے دور کرتا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ایوب خان کے درمیان اختلافات ۱۹۶۳ء میں ہی شروع ہوگئے تھے جو جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند پر منتج ہوئے اور یوں دونوں سیاسی استاد شاگرد ایک دوسرے کے بھیانک حریف بن کر آمنے سامنے آگئے۔ معاہدہ تاشقند میں روسی انتظامیہ نے ایوب خان کو بھٹو کے سی آئی اے سے روابط سے آگاہ کیا۔ جن کی بناء پر ذوالفقار علی بھٹو معاہدے کو ناکام بنانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اس لیے گفتگو کے آخری دور میں ذوالفقار علی بھٹو کو میٹنگ میں نہ بیٹھنے دیا گیا جس کے متعلق انھوں نے پاکستان میں ہمیشہ یہی کہا کہ وہ معاہدہ تاشقند کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کر کے آگئے ہیں۔

تاشقند سے واپسی کے بعد بھٹو نے ملک گیر دورے کا پروگرام بنایا اور وہ پہلے سیاست دان ہیں جنھوں نے قومی رازوں کو افشاء کرنے کا جھانسہ دے کر خوب مجمع بازی کی مگر وہ راز جو انھوں نے کبھی اپنے جلسوں میں افشاء کرتے تھے' وہ ۱۹۷۹ء تک ان کے سینے میں ہی رہے اور وہ کبھی ان پر سے پردہ نہ اٹھا سکے۔

جس زمانے میں بھٹو نے حزب اختلاف کی سیاست شروع کی اس وقت ملک میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کا طوطی بولتا تھا۔ اسی عہد میں ملک کے اندر ہونے والی سرمایہ کارانہ ترقی کی وجہ سے شہری مزدوروں اور دیہی کسانوں کا استحصال اپنے عروج پر تھا۔ شہری علاقوں میں سرمایہ سمٹ کر ۲۲ خاندانوں کے قبضے میں چلا گیا تھا جبکہ دیہاتوں میں جاگیرداروں کی فرعونیت سے عوام کا جینا دوبھر ہو چکا تھا۔ اس صورت حال نے لازمی طور پر عوام کا سیاسی شعور انقلابی تبدیلیوں کی طرف ابھارا۔ بھٹو نے اس صورت حال کا درست ادراک کیا اور انھوں نے ترقی پسند نعروں کا اس قدر شور مچایا کہ لوگ ان کی ایوب آمریت کی بیکاولی سیاست کو بھول گئے۔

۱۹۶۷ء میں بھٹو نے لاہور میں شیزان ہوٹل میں منعقد ہونے والے نیشنل عوامی پارٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور نیشنل عوامی پارٹی کا جنرل سیکرٹری بننے کی خواہش کا اظہار کیا مگر نیشنل عوامی پارٹی کی چند ریڈیکل نوجوانوں نے بھٹو کو دھکے دے کر شیزان ہوٹل سے باہر نکال دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی سے ناکام لوٹنے کے بعد ۱۹۶۷ء

میں ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا اور مغربی پاکستان سے اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

عوام نے اپنی معاشرتی اور سماجی محرومیوں کا جن کا وہ سالہا سال سے شکار تھے' کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بھٹو کا ساتھ دیا۔ عوام نے استحصالی طاقتوں پر فیصلہ کن وار کیا تھا۔ اس عوامی ریلے میں بڑے بڑے سیاست دان تنکے کی طرح بہہ گئے۔ بھٹو نے جاگیرداروں کے خلاف عوام میں بھرپور جوش و خروش پیدا کیا۔ عوام نے اس قدر ووٹ دیئے کہ خود ذوالفقار علی بھٹو بھی بوکھلا گئے۔ محض مغربی پاکستان سے جیتنے کے باوجود مجیب الرحمٰن کی اکثریتی پارٹی کو اقتدار منتقل کرنے سے اس شخص نے انکار کر دیا جو عوام کے ایک حلقے میں جمہوریت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریت کے اگر ادنیٰ معیار کو بھی مانا جائے تو بھی حکومت بنانے کا حق صرف عوامی لیگ کو ہی پہنچتا تھا۔ جو کہ اسمبلی کی واحد اکثریتی پارٹی تھی اور اگر اس طرح ہو جاتا تو پاکستان دولخت نہ ہوتا۔ مگر بھٹو جو کہ خود بھی جاگیردار تھے اور ملک کی جاگیردار اشرافیہ کی نمائندگی بھی کرتے تھے ہرگز کسی ایسے شخص کو اقتدار نہیں دے سکتے تھے جو ملک میں بنیادی زرعی اصلاحات کا پروگرام رکھتا ہو۔ بھٹو نے منتخب ممبروں کے سیاسی اظہار کا اس قدر مذاق اڑایا کہ انہوں نے کہا کہ جو ممبر ڈھاکہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جائے گا' اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ بے چارے ممبران اپنی ٹانگیں بچانے کے لیے ڈھاکہ نہ گئے اور ملک کو ٹوٹنے سے بھی نہ بچا سکے اس طرح ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا مشرقی بازو بنگلہ دیش بن گیا۔

جس وقت جنگ جاری تھی اس وقت بھٹو نے جنرل اسمبلی میں جنگ بندی کی قرارداد یہ کہہ کر پھاڑ دی کہ میں اس فضول دستاویز پر وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بلکہ اس وقت میرے ملک کو میری ضرورت ہے اور میں وطن واپس جاؤں گا اور گھاس کھا کر بھی بھارت سے جنگ کریں گے مگر وہ وطن واپس آنے کی بجائے سیدھے امریکہ سدھارے اور وہاں امریکن سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے اپنا اپوائنٹمنٹ لیٹر جاری کروانے میں مگن رہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ روم آ ٹھہرے اور سستانے لگے۔ روم سے ہی ان کو پی آئی اے کے چارٹرڈ طیارے کے ذریعے وطن واپس لایا گیا مگر تب تک

پاکستان جنگ بھی ہار چکا تھا اور ۹۰ ہزار فوجی قیدی بھی بن چکے تھے۔ انہوں نے واپس آتے ہی ملک کے پہلے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے باقی ماندہ ملک کا نظم و نسق سنبھالا۔ بھٹو اور مجیب کی جمہوریت دوستی کا ایک اور فرق بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد سامنے آتا ہے۔ شیخ مجیب نے بنگلہ دیش واپس جاتے ہی ملک میں نئے الیکشن کروائے اور نئے ملک کے عوام سے مینڈیٹ حاصل کیا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو عوام کے بے پناہ مطالبے اور صورت حال کی مکمل تبدیلی کے باوجود اپنی سابقہ انتخابی برتری پر ڈٹے رہے اور انہوں نے الیکشن کا مطالبہ مسترد کر دیا۔

قومی اسمبلی میں اکثریت ہونے کے باوجود بھٹو جمہوری حقوق اور جمہوری آزادیوں سے اس قدر خائف تھے کہ انہوں نے ۳ سال تک اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل نہ لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی جیت کے بعد عوام میں پایا جانے والا جوش و خروش آہستہ آہستہ ریاستی جبر و تشدد کے آگے کمزور ہوتا چلا گیا۔ ڈیرہ غازی خان کے کسانوں نے چوٹی کے لغاریوں کی زمین پر قبضہ کر کے دیہی ناخداؤں کو چوٹی سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا مگر تین ماہ بعد ہی جب جمال خان لغاری نے اسلام آباد میں بھٹو سے ملاقات کی اور اپنی زمینوں کو واگزار کرانے کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً لغاریوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے والے کسانوں کو قید و بند اور ریاستی جبر و تشدد کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

اس طرح کی صورت حال سے صنعتی مزدوروں کو بھی دو چار ہونا پڑا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کو دھمکی دی (Power will be met with state power) کہ گلیوں کی طاقت کو ریاستی طاقت سے روکا جائے گا۔ (Street جہاں بھٹو عوام کو دبا کر اپنے کنٹرول میں لانے کی کوشش میں تھے وہاں انہیں چار و ناچار عوام سے کیے گئے وعدے بھی نبھانا پڑے۔ ان میں سب سے اہم کام جس کا بھٹو کو بہت زیادہ کریڈٹ حاصل ہے' وہ تھا ۱۹۷۳ء کا متفقہ آئین۔ بھٹو نے پاکستان کی سیاست میں سب سے پہلے تمام اپوزیشن پارٹیوں سے اتفاق رائے کے ساتھ آئین مرتب کروایا۔ اس آئین کی نمایاں خصوصیات میں صوبوں اور مرکز کے درمیان تعلقات اور

اختیارات کی حد بندی جس سے صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کی خاطر خواہ حد تک تشفی ہوئی ملک میں پارلیمانی جمہوری اور وفاقی نظام تشکیل دیا۔ آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی۔ معاشرے کو ایلیمیرین استحصال سے پاک اور اسلامی اصولوں کے مطابق ترتیب دینے کی ضمانت دی گئی۔ آئین نے آزاد عدلیہ کا نظام دیا مگر بہت جلد ہی پاکستان کے سابق حکمرانوں کی طرح بھٹو کو اپنے ذاتی اقتدار اور طاقت کے استعمال کے راستے میں آئین رکاوٹ محسوس ہونے لگا اور انہوں نے پے در پے اس میں ترامیم متعارف کروائیں اور ترامیم کرواتے ہوئے انہوں نے کبھی بھی اپوزیشن کو اعتماد میں نہ لیا۔ ترامیم سے عدلیہ کی آزادی اور بنیادی شہری حقوق سلب کر لیے گئے۔ بھٹو نے اپنے اقتدار میں طویل عرصے تک ایمرجنسی نافذ رکھی۔ آئین نے صوبائی خودمختاری کی ضمانت دی مگر بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں برخاست کر کے صدارتی نظام نافذ کر دیا۔

سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ خود اپنی پارٹی کا یہ حشر کیا کہ چھ سالوں کے اندر اندر پارٹی کے بانی ارکان میں سے ایک بھی ممبر سنٹرل کمیٹی میں نہیں رہ گیا تھا۔ پارٹی کے نظریہ دان جے ایم رحیم کو نہ صرف پارٹی سے نکال دیا گیا بلکہ سیکیورٹی اداروں نے انہیں بری طرح زدو کوب کیا۔ حتیٰ کہ انہیں ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس کے علاوہ احمد رضا قصوری' مختار رانا اور معراج محمد خان کو بھی اسی عقوبت کا شکار ہونا پڑا۔ یہ تو تھی اپنی پارٹی کے اندر بھٹو کی جمہوریت نوازی۔ اپوزیشن کے اکثر راہنما بھٹو کے عہد میں پابند سلاسل رہے۔ چودھری ظہور الٰہی پر ایک سو سے زائد مقدمات درج کیے گئے۔ مسلم لیگ کے صدر خواجہ خیر الدین کو ملک بدر کیا گیا۔ ملک قاسم اور ایم اے خاکوانی کو بطور خاص ہدف بنایا گیا۔ اسی عہد میں خواجہ رفیق کا قتل ہوا۔ صوبائی اسمبلی کے ممبران راجہ منور احمد' نذر حسین اور طاہر شاہ سنگین قسم کے مقدمات کا سامنا کرتے رہے۔ قومی اسمبلی کے رکن مظفر حسین خان اور مخدوم زادہ حسن محمود کے علاوہ غلام حیدر وائیں' صفدر رضوی اور راجہ اورنگ زیب بھی مقدمات کا سامنا کرتے رہے۔

درحقیقت بھٹو برتری کے احساس کا اس قدر شکار ہو گئے تھے کہ وہ اپنے

خلاف ایک لفظ بھی نہ صرف جرم سمجھتے تھے بلکہ گناہ عظیم گردانتے تھے۔ اسی احساس برتری کی وجہ سے انہوں نے علاقے میں امریکی چوکیدار شہنشاہ ایران کے بجائے بذات خود چودھری بننے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کروائی جس سے وہ خود کو عالم اسلام کا راہنما ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایٹمی صلاحیت کے حصول کی بھی کوشش کی۔ یہی دو باتیں امریکی سامراج کو بہت ناگوار گزریں۔ بھٹو نے عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس میں نہ صرف ترقی پسند ممالک کے غیروابستہ تحریک کو نقصان پہنچایا بلکہ اس طرح عالم اسلام کو دنیا سے کاٹ کر الگ کر دیا جس سے مسلم دنیا میں بنیاد پرستی کے رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ بھٹو کی ذات گوناگوں تضادات کا مجموعہ تھی۔ خود ان کا کہنا تھا کہ "میری ذات میں بہت سے تضادات ہیں۔ میں ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں۔ میں نے عام آدمی کی طرح تعلیم حاصل کی اور اسلامی ماحول میں پروان چڑھا مگر اس کے باوجود میرا ذہن مغربی اور میری روح مشرقی ہے"۔

مگر حقیقی صورت حال یوں نہ تھی۔ بھٹو کے ذہن اور روح دونوں ایک ہی نقطے پر مرتکز تھے کہ وہ کس طرح زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت حاصل کر سکتے ہیں۔ سیاسی طاقت کے حصول کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ ریاستی اداروں پر انحصار کرتے گئے اور جمہوری سیاست کی نفی ہوتی گئی۔ بقول حنیف رامے بھٹو نے جمہوریت سے جمہوریت کو قتل کیا۔ انہوں نے پہلے سے موجود ریاستی اداروں کے ہوتے ہوئے اپنی ذات سے وفادار لوگوں پر مشتمل فیڈرل سیکیورٹی فورس تشکیل دی۔ F.S.F بناتے وقت ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں چیف سیکیورٹی ایڈوائزر کو ۱۹۷۳ء میں ایک نوٹ لکھا "لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سڑکوں پر آ جاتے ہیں اور وہ منتظم انتظامیہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے تو گوریلا حکمت عملیوں کے ماہر ہوگئے ہیں۔ خونی ہنگامے روزبروز بڑھتے جا رہے ہیں اور صورت حال اس قدر خراب ہوتی جا رہی ہے کہ اگر ایک بار بھی فوج کو طلب کیا گیا تو فوج اپنا "کھیل" شروع کر دیں گے۔ ایک سول حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور مسائل سے نبٹنے کے لیے فوج سے پرہیز کرے۔ جبکہ پولیس ہمارے ملک میں ناکافی اور اس کے وسائل

ناقص ہیں۔ لہٰذا ہمیں انتہائی جدید اور عمدہ قسم کی فورس درکار ہے"۔

اسی FSF میں ۱۹۷۳ء میں راولپنڈی میں UDF کے جلسے پر فائرنگ کر کے ساتھ افراد ہلاک کیے۔ بھٹو کے مخالفین پر قاتلانہ حملے FSF کی سفاکی اور خوفناک استعمال کا اظہار اس وقت ہوا جب نومبر ۱۹۷۵ء میں ترمیمی بل پر اپوزیشن کے اراکین کی بحث کو روکنے کے لیے فورس کو اسمبلی کے اندر بلایا گیا اور حزب اختلاف کو اسمبلی کے اندر نہ صرف پیٹا گیا بلکہ اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کیا آپ نے کبھی پرندہ انڈے سیتا ہوا دیکھا ہے ایک سیاست دان کی انگلیاں اس قدر ہلکی اور لچکدار ہونی چاہئیں کہ وہ اس طرح سے پرندے کے نیچے سے ایک ایک انڈہ اٹھا لے کہ پرندے کو پتہ تک نہ چلے"۔ یہی عمل ذوالفقار علی بھٹو کو موت کے پھندے تک لے گیا۔ ریاستی جبر و تشدد کے ساتھ ساتھ ذوالفقار علی بھٹو نے طمع، تحریص اور نوازشات اور سرکاری خزانے اور پلاٹوں کی الاٹمنٹ اونے پونے کر کے بھی اپنے سیاسی حاشیہ برداروں کے ٹولے کی ہمدردیاں جیتنے کی مسلسل کوشش کی۔ غریب پرور بھٹو نے اسلام آباد کے قیمتی ترین پلاٹ اونے پونے تقسیم کر دیئے۔ جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ اس لسٹ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان نوازشات سے بہرہ مند ہونے والوں میں کتنے غریب اور بے گھر عوام شامل ہیں۔

سردار شوکت حیات کا پلاٹ ان میں سب سے بڑا ۴۲۷۳ مربع گز تھا۔ سردار شوکت حیات اور مولانا عبدالحق کو دو پلاٹ الاٹ ہوئے۔ مولانا کوثر نیازی ۲۱۵۷، مولانا نقی محمود ۱۰۹۷، ملک محمد صادق ایم این اے ۸۰۰، ملک محمد اختر ایم۔ این اے ۸۰۰، فاروق لغاری سینیٹر ۱۱۲۳، محمد سردار خان ایم این اے ۸۰۰، چودھری غلام حیدر چیمہ ایم این اے ۸۰۰، غلام نبی چودھری ایم این اے ۸۰۰، نیامت اللہ خان شنواری ایم این اے ۸۰۰، چودھری نثار احمد بھوں ۸۰۰، چودھری ممتاز احمد ایم این اے ۸۰۰، سردار شوکت حیات ایم این اے ۱۴۰۰، مہر غلام حیدر بھروانہ ایم این اے ۹۳۳، صاحبزادہ نذیر سلطان آف سلطان باہو ایم این اے ۱۰۶۶، خان کمال محمد گوریجہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی حکمت اللہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی صدر الشہید ایم این

اے ۱۰۶۲' محمد خان چودھری ایم این اے ۹۷۸۹' چودھری محمد اسلم سینیٹر ۱۰۲۲' محمد ہاشم
غلزئی ۱۰۲۲' مس عذرا مسعود دختر میاں مسعود احمد ایم ایم اے ۱۰۲۲' مولانا عبدالباقی ایم
این اے ۱۰۲۲' میر مہران خان بجارانی سینیٹر ۹۷۷' فضل الحق پراچہ سینیٹر ۱۰۲۲' عبدالنبی
کانجو ایم این اے' اکبر خان ایم این اے ۹۳۳' احمد خان معرفت شہادت خان بھٹی'
ایم این اے' ۹۳۳' تاج محمد جمالی سینیٹر ۱۰۲۲' حاجی صالح خان ایم این اے ۱۰۱۱'
شہادت علی خان ایم این اے ۱۰۱۱' حاجی سید حسین شاہ سینیٹر ۹۳۳' غلام رسول تارڑ
ایم این اے ۸۰۰' اتالیق جعفر علی شاہ ایم این اے ۸۰۰' مولانا عبدالحق ایم این اے
۸۰۰' خواجہ سلیمان ایم این اے ۸۰۰' محمد حنیف خان ایم این اے ۹۳۳' مس طلعت
احسان ۳۳۳' سید قمر الزمان سینیٹر ۱۳۲۲' صاحبزادہ فاروق علی خان سپیکر ۸۰۰' ملک محمد
سلیمان ایم این اے ۸۰۰' محمد زمان اچکزئی سینیٹر ۹۳۳' منظور حسین سومرو ایم این
اے ۱۰۲۲' ابراہیم برق ایم این اے ۹۳۳' شیرباز خان مزاری ایم این اے ۱۰۲۲'
شفقت خان ایم این اے ۱۰۲۲' پیر عبدالقادر شاہ جیلانی ایم این اے ۱۰۲۲' عبدالعزیز
بھٹی ایم این اے ۹۳۳' مولانا عبدالحق ایم این اے ۸۰۰' میر سمیع عثمان سینیٹر ۱۰۰۰'
احمد وحید اختر سینیٹر ۸۰۰' چودھری جہانگیر علی ایم این اے ۱۲۲۲' خان حبیب اللہ خان
چیئرمین سینٹ ۸۰۰' محمد داؤد خان ایم این اے ۲۰۰۰' مسز تو بیہ خانم ۲۵۰۰' مولانا کوثر
نیازی ایم این اے ۳۱۵۷' نصراللہ خان خٹک ایم این اے ۲۵۰۰' مولانا غلام غوث
ہزاروی ایم این اے ۵۵۵' قمر الزمان سینیٹر ۵۰۰' ظہور الحق سینیٹر' ڈاکٹر غلام حسین
ایم این اے ۱۷۷۷' مخدوم محمد امین ایم این اے ۸۰۰' احمد رضا قصوری ایم این اے
۸۰۰' مولانا عبدالحکیم ایم این اے ۸۰۰' سید خیال محمد شاہ سینیٹر' چودھری بشیر احمد ایم
این اے' حفیظ اللہ چیمہ ایم این اے ۳۳۳' منظور حسین دوہرا ایم این اے ۳۳۳'
میاں حامد یاسین ایم این اے ۳۳۳' پاشان میر ۹۳۳' میر دریا خان کھوسو ایم این اے
۳۳۳' ملک نصراللہ خان آفریدی سینیٹر ۸۰۰' ممتاز فاروق خٹک ایم این اے ۱۳۲۲'
غلام مصطفیٰ جتوئی ایم این اے ۳۰۶' ملک جہانگیر خان ایم این اے ۳۳۳' راؤ
عبدالستار ایم این اے ۳۳۳' نوابزادہ محمد ذاکر قریشی ایم این اے ۱۱۷۵' کرم بخش
اعوان ایم این اے ۱۱۱' محمد یوسف خٹک ایم این اے ۱۳۷۲' عبدالحفیظ پیرزادہ ایم این

اے ۱۳۳۳، راجہ تری دیو رائے ایم این اے ۱۰۲۹، بیگم شیریں وہاب ایم این اے ۱۲۰۰، سکندر یوسف عبدالرحمٰن ۱۰۲۹، اسعد علی نون ایم این اے ۱۳۳۳، میاں احسان الحق ایم این اے ۱۰۲۹، میاں غلام عباس خان ایم این اے ۱۰۴۰، عبدالسبحان ایم این اے ۱۰۴۰، سردار عبدالعلیم ایم این اے ۱۰۰۰ مربع گز کے پلاٹ لینے والوں میں شامل تھے۔

نوازشات کا یہ سلسلہ صرف اسلام آباد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ لاہور میں لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے پلاٹ الاٹ کیے۔ ان میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ اس سے حکومت پر بیوروکریسی کی مضبوط گرفت کے اشارے ملتے ہیں۔ سابق وزیر اعلیٰ حنیف رامے نے شادمان کالونی میں ۶۷ افراد کو دس دس مرلے سے لے کر دو کنال تک کے پلاٹ الاٹ کیے   ان ناموں کو دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ بعض خاندانوں نے مختلف ناموں سے لاہور کی انتہائی ماڈرن کالونیوں گارڈن ٹاؤن، گلبرگ، شادمان اور مسلم ٹاؤن میں دو کنال سے لے کر آٹھ کنال تک اراضی الاٹ کرائی۔ ان ناموں میں ارکان قومی و صوبائی اسمبلی بھی شامل تھے۔ سینیٹر احسان الحق دو کنال، سینیٹر عبداللہ خان دو کنال، رکن قومی اسمبلی محمد افضل رندھاوا ایک کنال، محمد خان دو کنال، میاں شہادت علی خان دو کنال، رائے عمر حیات ایک کنال، چودھری محمد علی دو کنال، میاں شہادت علی خان دس مرلے، سابق صوبائی وزیر محمد صادق علی دو کنال، چودھری غلام قدر دو کنال، راجہ منور احمد دو کنال، چودھری مشتاق احمد دس مرلے، صوفی نذیر احمد دس مرلے، ؟؟ علی عمر دس مرلے، محمد افضل وٹو دو کنال، رائے احمد حیات کھرل دو کنال، مرزا طاہر بیگ ایک کنال، ملک حاکمین خان دو کنال، خنک خالق داد خان دو کنال، چودھری بشیر احمد دو کنال، حاجی محمد بخش مخدوم دس مرلے، چودھری حمید اللہ دس مرلے شامل ہیں جبکہ پیپلز پارٹی کے لیڈر اور اراضی حاصل کرنے والوں میں عارف اقبال بھٹی ایک کنال، مولوی ہدایت اللہ ایک کنال، شہزادہ جہانگیر بار ایٹ لا ایک کنال، قیوم نظامی دس مرلے، راجہ محفوظ علی حیدر (رحیم یار خان) دس مرلے، بہادر حسین ڈار دس مرلے، ایس اے روحث دس مرلے، حکیم عمر دین (لاہور) دس مرلے اور ایک شیخ دس مرلے شامل ہیں۔

اعلیٰ حکام میں ہندوستان میں پاکستان کے سفیر سید فدا حسین دس مرلے' سابق اسسٹنٹ ایڈووکیٹ عبدالستار نجم ایک کنال' مقبول حسین قریشی صاحبزادہ صادق حسین قریشی دو کنال' عاشق حسین قریشی دو کنال' جسٹس محمد افضل چیمہ دو کنال' آصف ہاشمی سوا کنال' شیخ محمد اسد اللہ ایک کنال' شوکت علی رانا اسسٹ کمشنر ایک کنال' سید عابد علی سابق ڈائریکٹر پی آر پی' میجر جنرل سعد طارق سابق چیئرمین واپڈا دو کنال' میاں وحید الدین ڈپٹی سیکرٹری ریونیو بورڈ دو کنال' فاروق ایوب دو کنال' نبی بخش بھٹی ڈیڑھ کنال' ثناء اللہ ڈپٹی ٹاؤن پلانر ایک کنال' ڈاکٹر عبدالرحیم ڈائریکٹر پلاننگ ایل ڈی اے ایک کنال' کے محمود ایک کنال' اے اے نسیم کمشنر سی دو کنال' خالد احمد کھرل ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ دو کنال' مراتب علی شیخ دس مرلے۔

پاکستان کے حکمران گروہ پر اس قدر نوازشات کے علاوہ بھٹو کے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پی پی پی کے امیدواروں کو سرکاری خرچ پر گاڑیاں خرید کر دی گئیں۔ بھٹو مرحوم کی ان بدعنوانیوں کے علاوہ انہوں نے غیر ملکی دوروں پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ پی آئی اے کے خصوصی طیارے کئی کئی روز تک وقف رہتے جبکہ ایک طیارہ لاکھوں روپے کا زرمبادلہ روزانہ کماتا ہے۔ غیر ملکی دوروں پر ان کے ساتھ ہمیشہ سینکڑوں سیاسی مجہولوں کی ٹیم ہوتی۔ ان کے لیے لاکھوں روپے کی غیر ضروری خریداری کی گئی اور ناجائز طور پر درآمد شدہ اشیاء کی کسٹم ڈیوٹی ادا نہ کر کے سرکاری خزانے کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا۔ ان کے عہد میں پورٹ قاسم میں بارہ کروڑ روپے کا گھپلا ہوا کراچی پورٹ ٹرسٹ اور نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کروڑوں کی بدعنوانیاں سامنے آئیں۔ پورٹ قاسم کی گودیوں کا ایک ٹھیکہ ۳ کروڑ ڈالر کی بجائے ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر میں دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی یہ بدعنوانیاں جبر و تشدد' سرکاری اداروں کا سیاسی استعمال اور جمہوری حقوق کی نفی ان کے زوال کا سبب بنی۔ وہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات آسانی سے جیت سکتے تھے مگر انہیں دو تہائی اکثریت چاہیے تھی۔ کیونکہ وہ ملک کے سیاسی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لندن سکول آف اکنامکس کے شعبہ سیاسیات کے ہیڈ مسٹر وولف کو پاکستان بلایا اور ملک کے نظام کو صدارتی بنانے اور

ملک میں صدارتی آئین نافذ کرنے کے لیے رپورٹ مرتب کرنے کو کہا۔ ملک کے نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل کر کے وہ تمام اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ۷ مارچ ۱۹۷۷ء میں منعقد ہونے والے قومی اسمبلی کے عام انتخابات میں دھاندلی کی جس پر اپوزیشن نے ۱۰ مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور ملک میں نظام مصطفیٰ کی تحریک شروع ہو گئی۔ جس کی آڑ میں ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء میں اس دن ملک کا سیاسی نظام معطل کر دیا جس دن بھٹو اور اپوزیشن کے مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کو تھانہ اچھرہ میں درج نواب محمد احمد خان کے قتل کی ایف آئی آر میں ٹرائیل کیا گیا۔ اور عدالت عالیہ نے ان کو سزائے موت دے دی جس کی بعد میں سپریم کورٹ نے تین کے مقابلے میں چار ججوں کے فیصلے سے توثیق کر دی۔ بھٹو کی ذات کی طرح پاکستان کی عدالتی تاریخ میں بھٹو کیس بھی متنازعہ کیس ہے۔ سپریم کورٹ کی توثیق کے بعد ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

رعنا شیخ

پیپلز پارٹی کے ۱۹۹۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۶ء نومبر تک چلنے والے دور حکومت میں بعض حکومتی اور نیم حکومتی اداروں میں کرپشن کا جو کھیل کھیلا گیا اور جس طرح حکومتی عہدیداروں نے اپنی من مانیاں کیں اور اپنے من پسند افراد کو منافع بخش اداروں میں تعینات کیا' اور اس عمل کے جو نتائج نکلے' وہ بہت بھیانک تھے۔ بے نظیر دور میں اعلیٰ سیاسی شخصیات نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے قومی اہمیت کے اداروں کو بدعنوان لوگوں کے سپرد کر دیا۔ اسی طرح کی ایک "سپردگی" کی بھیانک مثال "پاکستان ٹیلی ویژن" جیسا ادارہ تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کو رعنا شیخ نامی خاتون کے حوالے کیا گیا جنہوں نے اپنی "مدت سربراہی" کے دوران پی ٹی وی میں جو گل کھلائے' اس کی مثال پی ٹی وی کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ وزارت ثقافت کی انچارج سیکرٹری سے پی ٹی وی کی مینجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالنے کی ابتداء سے ہی رعنا شیخ نے پی ٹی وی کے ہر شعبے میں اپنی کرپشن کی شروعات کیں۔ رعنا شیخ پراسرار طریقے سے پی ٹی وی کی چیف ایگزیکٹو کے طور پر سامنے آئیں جس کی ایک خاص وجہ بارسوخ سیکرٹری خارجہ کی اہلیہ ہونا بھی تھی۔

رعنا شیخ نے اپنے دور میں اس ادارے کو اپنی ذاتی ملکیت بنائے رکھا اور ہر معاملے میں اپنی من مانی کی۔ رعنا شیخ کا پورا دور لوٹ مار اور قواعد و ضوابط کی دھجیاں اڑانے کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے دور میں مجموعی طور پر پی ٹی وی کو ۴۰ کروڑ ۴۰ لاکھ ۸۵ ہزار روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

۱۹۹۳ء میں ۳ کروڑ ۷۷ لاکھ منافع کمانے والا ادارہ ۱۹۹۶ء کے اواخر میں ۲۰ کروڑ ۹۷ لاکھ کے نقصان سے دو چار ہوا۔ محترمہ نے کروڑوں کے گھپلوں سے پی ٹی وی کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔ اسے سٹیٹ بینک اور دوسرے قومی بینکوں سے اوورڈرافٹ کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا اور ملازمین کو لاکھوں روپے کے بونس دینے والا ادارہ روزمرہ کے اخراجات کے لیے فنڈ کی کمی کا رونا رونے لگا اور رعنا شیخ کی کرپشن کی دہائی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گئی۔ یہ ساری کرپشن اس وقت سامنے آئی جب سابق نگران وزیراعظم ملک معراج خالد کے حکم پر خصوصی تحقیق ہوئی جس میں سابق منیجنگ ڈائریکٹر رعنا شیخ کی لوٹ مار، من مانیاں، غلط نوازیاں اور اقرباء پروری سامنے آئی۔

حیران کن بات تو یہ ہے کہ انتہائی باصلاحیت افراد کی موجودگی کے باوجود پرائیویٹ کمپنیوں سے زیادہ رقم کے عوض پروگرام خریدے گئے جن کی کوئی غیر معمولی مقبولیت میں دیکھنے میں نہیں آئی اور پی ٹی وی اتنا ناکارہ ہوگیا کہ سرکاری تقریبات اور سرگرمیوں کی کوریج کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہ رہا۔ ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ ۱۹۹۶ء میں ورلڈ کپ کلچرل شو کے نام سے بے حیائی کے طوفان بدتمیزی کے دھچکوں نے بڑوں بچوں کے اوسان خطا کر دیے اور مالی طور پر پی ٹی وی کو ۱۳ کروڑ ۶۷ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کا مالی نقصان اٹھانا پڑا اور اس شو میں پی ٹی وی کے قوانین کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی کسی معاملے میں بھی منظوری حاصل نہ کی۔

کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے اکاؤنٹس سے اپنی پسند کے افراد کو کروڑوں روپوں کے عطیات سے نوازا گیا اور فنانس ڈیپارٹمنٹ بے بس ہو کر رہ گیا۔ کلچرل شو میں اشتہارات کے نرخوں میں ۸۵ فیصد چھوٹ دی گئی اور ۳۶ کمپنیوں کے توسط سے ۱۵ فیصد نرخوں پر ۲۰۰۰۳ سیکنڈ کے اشتہارات کی بکنگ کی گئی۔ اس میں پی ٹی وی کو ۹ کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۰ ہزار روپے کا خسارہ ہوا۔ ان اشتہاروں میں سے ۱۲۳۹۳ سیکنڈ کے اشتہارات جون تک چلتے رہے۔ اس سے پی ٹی وی کو ڈیڑھ کروڑ روپے نقصان ہوا اور ۳۳۰۰ ٹکٹ من پسند افراد میں بانٹے جس سے پی ٹی وی کو ۶ لاکھ ۳۰ ہزار ۹ سو روپے کا نقصان ہوا۔ ۸۵ ہزار ٹکٹوں میں سے صرف ۱۹۳۳۷ ٹکٹوں کی فروخت کا

ریکارڈ مل سکا۔ رفیع پیر تھیٹر کو کلچرل شو کے سٹیج بنانے، ساؤنڈ سسٹم، لائٹنگ اور سیٹ لگانے کے لیے ۶۰ لاکھ ۲۹ ہزار روپے ادا کیے گئے۔ محترمہ نے ثقافتی دورے کے منصوبے میں ۲۱ لاکھ ۳ ہزار روپے کے اخراجات حاصل کیے اور اس دورے کا ایک پروگرام بھی پی ٹی وی پر نہ دکھایا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کوئی حساب نہیں اور اسٹاف اور فنکاروں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرایا۔ ان کو ایسے ہوٹلوں میں ٹھہرایا، جن کی ایک دن کی اجرت ۳۵ ہزار ۶۰ روپے تھی۔ رعنا شیخ نے اپنے چہیتے فنکاروں کو صرف ۳۸۹۲۷۷ روپے کے واجبات کی جگہ ۶۸۳۵۰۰۰ روپے ادا کیے۔ اس طرح پی ٹی وی کو ۶۴ لاکھ ۴۵ ہزار ۷ سو ۲۹ روپے کا نقصان ہوا۔ سب سے زیادہ رقم مرحوم نصرت فتح علی خان کو ملی۔

۱۰ مارچ کے ۲۲ منٹ کے دورانیے کے ایک پروگرام کے بدلے ۵ لاکھ ادا کیے۔ اس سے قبل ۲۵ فروری اور ۲ مارچ کے ۳۰ منٹ اور ۲۱ منٹ کے دورانیے کے پروگراموں میں بالترتیب پانچ پانچ لاکھ روپے ادا کیے۔ مزے کی بات یہ کہ ان کا اسٹینڈرڈ ریٹ ۳۹ ہزار اور چند روپے بنتا ہے۔ رعنا شیخ نے نصرت فتح علی خان مرحوم، علی حیدر، عابدہ پروین، عطا اللہ، جنون گروپ، ارشد محمود بٹ، نگہت چودھری، سجاد علی، وائٹل سائن، ابرار الحق، عارف لوہار اور دوسرے فنکاروں کو ۳ لاکھ ۸۹ ہزار ۲ سو ۷۷ روپے کی بجائے ۶۸ لاکھ ۳۵ ہزار روپے ادا کیے۔ اس طرح مجموعی طور پر ۶۴ لاکھ ۴۵ ہزار ۷ سو ۲۹ روپے زیادہ ادا کیے۔

اس کے علاوہ ریسورس پرسن اور کلچرل شو کے شرکاء کو ۱۰۰۰ روپے کی جگہ ۱۰ ہزار روپے نذرانہ دیا گیا۔ اس نذرانہ میں پی ٹی وی کو ۲۵ لاکھ ۲۹ ہزار روپے نقصان اٹھانا پڑا۔ موصوفہ نے کلچرل شو میں فنکاروں اور وی آئی پی افراد کی تفریح کے لیے پی ٹی وی کے کھاتے سے ۵۷ لاکھ ۲ ہزار روپے ۸ ہزار ۷ سو ۲ افراد پر صرف کر دیئے۔ محترمہ نے "ہمسی بھول" کے نام پر فروری میں منعقد ہونے والے ایک پروگرام کو منسوخ کر دیا اور اس میں مدعو ۳ سو افراد کے کھانے کا بل ۳ لاکھ ۷۹ ہزار ۷ سو روپے پی ٹی وی کے خزانے سے ادا کر دیا جس میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے ہوٹل بالترتیب حاجی ٹینٹ سروس، آواری اور میریٹ ہوٹل کو ادا کیے۔ محترمہ نے پی ٹی وی

کے پروگراموں کی تشہیر کے لیے پی ٹی وی کے بجائے اخبارات میں ۳۲ لاکھ ۴۴ ہزار روپے کے اشتہار دیئے۔ اس طرح اس کھیل میں ۳۳ لاکھ ۹ ہزار روپے ہڑپ ہوئے اس طرح ۲۲ لاکھ ۲۵ ہزار روپے کی رقم کا نقصان ہوا۔ کلچرل شو میں حصہ لینے والے فنکاروں اور اسٹاف کو VIP ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ جن پر ۲۳ لاکھ ۹۳ ہزار روپے خرچ کیے اور خود رعنا شیخ ہوٹل کے ایسے کمروں میں ٹھہریں جن کا ایک دن کا بل ۱۴ ہزار ۳۰۰ روپے تھا۔

کلچرل میلے میں کراکری اور فرنیچر کی گمشدگی اور ٹوٹ پھوٹ کی آڑ میں ۶ لاکھ ۵۱ ہزار ۹ سو ۳۵ روپے کا تاوان پی ٹی وی کے کھاتے سے ادا کیا۔ کے ایم سی کمپلیکس کراچی کے صرف دو پروگراموں میں ضائع اور گم شدہ کراکری اور فرنیچر کا تاوان ۴ لاکھ ۸ ہزار ۵۸۵ روپے ادا کیا گیا اور ۲ لاکھ ۷۵ ہزار ۸ سو روپے بورڈ آف ڈائریکٹر کی اجازت کے بغیر خرچ کر دیے۔

رعنا شیخ نے اپنے ریکارڈنگ کا کام سرانجام دینے والے عملہ کی موجودگی کے باوجود کلچرل پروگراموں کی ریکارڈنگ لاہور کی ایک پرائیوٹ کمپنی آڈیو وڑیول کمیونیکیشن کو دی جس کو ۳۷ گھنٹے کی ریکارڈنگ کا ۹۵ ہزار روپے فی گھنٹہ کے حساب سے دیا گیا۔

محترمہ نے جولائی ۱۹۹۲ء میں ایف ایم سی نامی ایک کمپنی سے معاہدہ کیا جس کا مقصد پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی ریکارڈنگ اور انہیں برطانیہ' امریکہ اور یورپ میں دکھایا جانا مقصود تھا۔ اس معاہدے کی شق نمبر ۴ کے مطابق اس کمپنی نے پی ٹی وی کو فی منٹ ۳۰ ڈالر رائیلٹی ادا کرنا تھا جبکہ شق نمبر ۵ کے مطابق پی ٹی وی نے اس کمپنی کو سروس چارجز کے طور پر ۳۰ ڈالر فی منٹ ادا کرنا تھا۔ یہ عجیب معاہدہ تھا جس میں پی ٹی وی کے فنکاروں کو فیس پی ٹی وی کے کھاتے سے ادا کرنی تھی۔ اس کے علاوہ پی ٹی وی نے آمدنی میں مساوی حصہ داری کی بنیاد پر انکار وادی' پل دو پل' گہرے پانی' آہن اور آوازیں نامی پروگرام خریدے جس میں حاصل ہونے والی آمدنی کا نصف جو مجموعی طور پر ۵ کروڑ ۳ لاکھ ۴۵ ہزار روپے بنتا ہے' پرائیوٹ کمپنیوں کو ادا کرنا پڑا۔ ان پروگراموں میں سے بہت سوں کے لیے آلات' تکنیکی معاونین'

اسٹوڈیو عملہ، میک اپ اور ہدایت کاری کی سہولتیں بھی پی ٹی وی نے خود فراہم کیں۔ کاسموس ٹیلی ویژن نامی کمپنی سے ٹرانسمشن کے اخراجات بھی وصول نہیں کیے گئے۔ پی ٹی وی خود اگر یہ پروگرام تیار کراتا تو یہ کروڑوں روپے اس کے اپنے حسابات میں جمع ہوتے۔ اس سے قبل جمال شاہ کے ادارے ہنرکدہ کو ڈرامہ "نگل" کے لیے ۵۲ لاکھ ۴۰ ہزار، ثمینہ پیرزادہ کو ڈرامہ "کرب" کے لیے ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار، رفیع پیر کو "مستقل اپنا گھر" کے لیے ۳۰ لاکھ ۴۰ ہزار، رفیع پیر تھیٹر کو "نل ٹائم" کے لیے ۹ لاکھ ۸۴ ہزار اور سرمد پروڈکشن کو "ہنستی دنیا" نامی پروگرام کے لیے ۴ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ادا کیے۔ پی ٹی وی کے ایک کروڑ ۷ لاکھ روپے اپنے پسندیدہ لوٹ میں تقسیم کر دیے جبکہ پی ٹی وی کا اپنا عملہ اور مشینری یہ تمام کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

رعنا شیخ نے پی ٹی وی کے ڈائریکٹروں کو ۳۲ لاکھ ۷۰ ہزار روپے مالیت کی ۱۳۰۰ سی سی والی ۹ گاڑیاں خرید کر دیں جبکہ ۵ جنوری ۹۵ء میں حکومت کے جاری کردہ سرکلر کے تحت یہ ڈائریکٹر صرف ۱۰۰۰ سی سی کی گاڑیاں استعمال کر سکتے ہیں۔ پی ٹی وی کے عہدیداروں کو ہی نہیں بلکہ سابق وزیر اطلاعات خالد کھرل اور بے نظیر بھٹو کے پرسنل سیکرٹری احمد صادق کو بھی پی ٹی وی کے فنڈ سے فیض یاب کیا گیا۔ دونوں اصحاب کو ۳۴ انچ سکرین والے سونی ٹی وی سیٹ فراہم کیے گئے جن پر ایک لاکھ ۵۴ ہزار چھ سو روپے خرچ ہوئے۔ خالد کھرل کو ۲ لاکھ ۲۴ ہزار چار سو روپے کا فرنیچر بھی فراہم کیا گیا۔ یاد رہے کہ کمپنیز آرڈیننس ۱۹۸۴ء کی دفعہ ۱۹۷ کے تحت کسی سیاسی شخصیت، جماعت یا ادارے کو تحفے تحائف دینے والی کمپنی کو ۱۰ ہزار روپے جرمانہ اور ذمہ داری ڈائریکٹر یا افسر کو دو سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

رعنا شیخ پی ٹی وی کی ایم ڈی بننے سے پہلے ہی اس ادارے کے احسان مندوں میں سے تھی۔ سابق ایم ڈی فرہاد زیدی نے ۱۹۹۳ء میں انھیں ایک پروگرام کے سلسلے میں ۵ لاکھ روپے ادا کیے لیکن نہ تو یہ پروگرام منعقد ہو پایا اور نہ ہی رعنا شیخ نے رقم واپس کی۔ جسے لوگ "رعنا شیخ کا فراڈ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ گزشتہ تین برسوں میں وفاقی وزارت خزانہ کی ہدایت پر پی ٹی وی نظام نے ملازمین کو اعزازیہ کی مد میں ۲ کروڑ ۴۱ لاکھ ۵ ہزار ۱۴۲ روپے ادا کیے جو ایک تحیّج مالی بے ضابطگی ہے۔

سلمان فاروقی

سابقہ بے نظیر دور میں کرپشن اور بدعنوانیوں کو جو عروج ملا اور مجموعی طور پر بدعنوانیوں کے اس سیلاب میں جو ایک نیا رخ سامنے آیا' وہ سیاست دانوں کے شانہ بشانہ اعلیٰ بیورو کریٹس کی بدعنوانیاں تھیں۔ طاقتور سیاست دانوں نے اپنی کرپشن کی رفتار کو تیز کرنے اور کرپشن کے عمل کو عوامی معلومات سے دور رکھنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیتے ہوئے ملک کی بیورو کریسی میں ایسے اعلیٰ عہدیداروں کو منتخب کیا جو اپنے اپنے شعبوں میں مکمل اختیارات کے مالک تھے اور ان کا حلقہ اثر بیورو کریسی میں وسیع تھا۔

سیاست دان اور بیورو کریٹس کرپشن کی اس "باہمی جدوجہد" میں ایک دوسرے کو مفادات پہنچاتے رہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو تحفظ بھی مہیا کرتے رہے۔ نومبر ۹۶ء میں بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد ان کے شوہر آصف علی زرداری کے جن "پانچ یاروں" کے نام منظرعام پر آئے' ان میں سلمان فاروقی کا نام بھی شامل تھا۔ واضح رہے کہ یہ دونوں بھائی سلمان فاروقی اور عثمان فاروقی آصف علی زرداری کے "لنگوٹے یار" تھے اور دونوں کے پاس ملک کے اہم ترین اداروں اور محکموں کا چارج تھا۔ عثمان فاروقی پاکستان میں فولاد سازی کے سب سے بڑے کارخانے "پاکستان اسٹیل ملز" کے چیئرمین تھے جبکہ سلمان فاروقی کامرس اینڈ منسٹری کے سیکرٹری تھے اور بعد میں ان کو دیگر اعلیٰ اور اہم محکموں کی سیکرٹری شپ بھی میسر رہی۔

بے نظیر کے دوسرے دور حکومت میں سلمان فاروقی کا کردار ایک "وِیو مانڈگی" کردار ہے۔ بے نظیر دور میں وہ وفاقی سیکرٹری تجارت و مواصلات' پانی' بجلی اور ماحولیات وغیرہ کے بھی سیکرٹری رہے اور ان تمام عہدوں کی وساطت سے انہوں نے

وہ "کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ ان کی مثال نہیں ملتی۔ سلمان فاروقی ہمیشہ اپنے محکمے کے وزیر سے "بہترین روابط" رکھتے اور پھر اسے اپنے تجربات کی روشنی میں "اعلیٰ نوعیت" کی کرپشن کرنے کے گر سکھاتے۔ سلمان فاروقی کی یہ اضافی خصوصیت رہی کہ وہ سیاست دانوں کے "کمال طبیعت شناس" تھے۔

فروری ۱۹۹۷ء میں جب نواز شریف حکومت آئی اور حکومت کے قائم کردہ احتساب سیل کی کاوشوں سے سلمان فاروقی کو اسلام آباد سے گرفتار کیا گیا تو دوران تفتیش ان کی کرپشن اور ان کے ذریعے رونما ہونے والی آصف علی زرداری کی کرپشن کی داستانیں ذرائع ابلاغ کے ذریعے سامنے آنا شروع ہوئیں۔ انہوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کلفٹن کراچی سے کیا۔ سلمان فاروقی بھی اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی اسکیم سے اپنے سالے کے نام سے ۲ ہزار گز کا پلاٹ کوڑیوں کے بھاؤ خرید کر اپنی پہلی مالی بدعنوانی کی ابتداء کی اور پھر یہ سلسلہ ایسا چلا کہ ان کی پشت پناہی کرنے والے آصف علی زرداری کی اہلیہ کی حکومت کے برطرف ہونے تک جاری رہا۔

اس رہائشی علاقے میں کمرشل پلاٹ خریدنا سکیم کے "بائی لاز" کے خلاف ہے۔ لیکن سلمان فاروقی نے وزیر اعلیٰ کے دباؤ سے یہ پلاٹ خرید کر بعد میں اپنی بیوی "شاہ تاج فاروقی" کے نام تبدیل کر دیا۔ اس پلاٹ کی خریداری پر رجسٹریشن فیس جو ساڑھے سات فیصد کے حساب سے ۸ لاکھ روپے بنتی تھی' وہ بھی ادا نہ کی۔ سرکار کو اس پلاٹ کی خریداری کے ضمن میں ۸ لاکھ کا ڈنک مارنے کے بعد اس پر مکمل قبضہ حاصل کر کے کروڑوں روپوں میں فروخت کر دیا۔ مذکورہ پلاٹ کی خرید و فروخت کے عمل میں سرکاری خزانے کو مجموعی طور پر ۳۳ لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

سلمان فاروقی جب سیکرٹری خزانہ تھے تو ان کی کرپشن اور سرکاری خزانے کے قصے بھی بہت مشہور ہوئے۔ جب ان کو سیکرٹری تجارت کا عہدہ دیا گیا تو وہ ٹیکسٹائل کوٹہ مینجمنٹ ڈائریکٹوریٹ کے انچارج بھی تھے۔ اس حیثیت سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے من پسند اور خاص لوگوں کو بھاری رشوت وصول کر کے برآمدی لائسنس دلوائے اور سنگین قسم کی بدعنوانیوں کا راستہ ہموار کیا۔

سلمان فاروقی نے جن ٹیکسٹائل کمپنیوں کو لائسنس جاری کیے' وہ تمام کی تمام

فرضی تھیں اور ان کا حقیقت میں کوئی وجود نہ تھا۔ سلمان فاروقی نے جعلی اور کاغذی ناموں کو لائسنس جاری کر کے جس طرح ملکی قانون اور محکمانہ اصول و ضوابط کا مذاق اڑایا' اس کی مثال نہیں ملتی۔ سلمان فاروقی کو سابقہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے شوہر نامدار آصف علی زرداری کا قرب اس لیے میسر تھا کہ وہ ان کو ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کرنے کے نئے نئے ذرائع دریافت کر کے دیتا تھا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے جیالوں کو بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے بے شمار مواقع فراہم کیے۔ انہوں نے ٹیکسٹائل کوٹہ کے انچارج ہونے کی حیثیت سے ڈائریکٹر جنرل مسٹر نیر باری کو پی پی پی کے کارکنوں اور جیالوں کے لیے قومی خزانے کا منہ کھولنے کا حکم دیا اور کہا کہ وزیراعظم بے نظیر کو ۵ کروڑ کی رقم فوری طور پر مطلوب ہے جو ان کو پہنچا دی جانے اور یاد رکھو کہ یہ رقم ڈائریکٹوریٹ کے فنڈ سے دینی چاہیے۔ مذکورہ رقم کی پہلی قسط جو کہ ۳ کروڑ تھی' نیر باری نے اس وقت کے پرسنل سٹاف آفیسر سراج شمس الدین کو ۲ قسطوں میں ادا کی۔ یہ رقم جون ۱۹۹۶ء میں ۱ کروڑ ۴۰ لاکھ اور ستمبر میں ۱ کروڑ ۶۰ لاکھ ادا کر دی گئی۔ باقی ماندہ رقم حاصل کرنے کی کوشش ابھی کر رہے تھے کہ بدعنوانوں کی چھٹی کرا دی گئی اور ۵ کروڑ کا ہدف ادھورا رہ گیا۔

سلمان فاروقی کے اختیارات کے ناجائز استعمال کی مثالیں بے شمار ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے سیکرٹری کی حیثیت سے اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کے اعلیٰ حکام سے مل کر کارپوریشن کو مجبور کیا کہ وہ کارپوریشن کے لیے بھاری قیمت پر زمین خریدے۔ اس واردات میں جہاں سلمان فاروقی نے قومی خزانے کو کروڑوں روپوں کا نقصان پہنچایا' وہاں سیاست دانوں اور افسر شاہی کے درمیان رشوت' سفارش' اقرباء پروری اور دھاندلی کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس واردات کی روداد کچھ یوں ہے کہ کراچی میں کارپوریشن نے "ہاشو سنٹر" خریدا۔ اس کی خریداری پر ۲۰۵ ملین روپے خرچ ہوئے جبکہ اس کی مارکیٹ میں قیمت اس مذکورہ رقم سے کئی گنا کم تھی۔ اس میں سلمان فاروقی نے اپنے کرپٹ ٹولے کے ساتھ مل کر ایک معقول رقم حاصل کی۔

سلمان فاروقی نے سیالکوٹ میں ۳ کنال اراضی عرصہ ۳۳ لاکھ روپے میں خریدی جبکہ اس کی مارکیٹ قیمت بھی انتہائی قلیل تھی۔ اس کے علاوہ سلمان فاروقی نے پیپلز میڈیا فاؤنڈیشن کا گراؤنڈ ۲ کروڑ روپے میں خریدا۔ ان مذکورہ ... حاشیہ لاہور

کی خریداری میں سلمان فاروقی نے کروڑوں روپے کی کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور کمیشن کی صورت میں ایک معقول رقم آصف علی زرداری کو بھی دی۔

سلمان فاروقی نے کرپشن کے سفر کو تیز تر کر دیا۔ ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کرنے کے دوران وہ قومی خزانے کو کروڑوں کے جھٹکے دیتے گئے اور آگے بڑھتے گئے۔ انہوں نے اسی قسم کا ایک جھٹکا رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کو لگایا جس میں رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کو ۳۶ ملین کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے ٹوگو کوائل ٹریڈنگ لمیٹڈ کے ذریعے ۹۸ ہزار میٹرک ٹن چاول ۲۴۲ ڈالر فی ٹن کے حساب سے برآمد کیے۔ اس وقت بین الاقوامی منڈی میں چاول کی قیمت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ چاول برآمد کر کے کمیشن اور کک بیک کی رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔

اسلام آباد سیکرٹریٹ کے طاقتور ترین بیوروکریٹ سلمان فاروقی کی شخصیت اس حوالے سے بھی بڑی شہرت کی حامل رہی ہے کہ وہ اعلیٰ افسران کے تقرر و تبادلے اپنی مرضی سے کرواتے تھے۔ ان تبادلوں کے عوض سلمان فاروقی لاکھوں روپے کمانے کے ساتھ ساتھ افسران کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے مطلوبہ محکمہ میں کرپشن کرنے میں آسانی رہتی۔ سلمان فاروقی نواز شریف کے سابق دور میں سیکرٹری ٹورازم بھی رہ چکے ہیں۔ جنرل ضیاء کے دور میں جب وہ ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ تھے تو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کھل کر کرتے رہے۔

دونوں بھائیوں میں کرپشن میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا مقابلہ جاری تھا کہ ان کی اس دوڑ کے دوران حکومت توڑ دی گئی۔

مقابلہ بازی میں سلمان فاروقی نے اپنے بھائی عثمان فاروقی کو پیچھے چھوڑ دیا اور کرپشن کے سارے ''اعزاز'' حاصل کر لیے۔ عثمان فاروقی نے پاکستان کے سب سے بڑے فولاد سازی کے کارخانے ''پاکستان سٹیل مل'' کو تباہی سے دو چار کیا۔ جبکہ سلمان فاروقی نے آصف زرداری کے زیر سایہ رہ کر ''ادارہ تحفظ ماحول'' بنایا۔ جس کے چیئرمین آصف زرداری اور سیکرٹری سلمان فاروقی تھے۔ پاکستان میں ماحولیاتی آلودگی کے انسداد اور خاتمہ کے لیے انہوں نے جو کوششیں کیں اور جس طرح اس ادارے کے اربوں روپے کے فنڈز کو اپنے ذاتی مفادات اور عیش کے لیے استعمال کیا' یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ کرپشن کے ذریعے انہوں نے قومی ماحول کو اس حد تک پراگندہ ضرور کر دیا ہے کہ جس کی گرداب بیٹھتے بیٹھتے ہی بیٹھے گی۔ اس ادارے کے نام پر

سلمان فاروقی نے فیصل آباد میں ساڑھے تین سو ایکڑ اراضی حاصل کی اور یہاں پر جاپان کے تعاون سے ماحولیاتی آلودگی کو دور کرنے کے لیے ٹریٹمنٹ پلانٹ بنوایا اور اس کی آڑ میں صنعت کاروں اور فیکٹری مالکان سے کروڑوں روپے جھپیے لیے جبکہ اسی قسم کے پلانٹ اسلام آباد اور کراچی میں بھی لگائے گئے تھے جن کی کارکردگی ۱۰ فیصد بھی نہیں تھی۔

کرپشن اور بدعنوانی کے یہ ایسے دو کردار تھے' جنہوں نے گزشتہ ۳ سال کے عرصے میں قومی خزانوں کو چاروں ہاتھوں سے لوٹا اور قومی معیشت کو ایسا نقصان پہنچایا جو ناقابل بیان بھی ہے اور ناقابل تلافی بھی۔

شفیع محمد سوانی

بے نظیر دور میں کرپشن مافیا نے ملک میں اس قدر لوٹ مار کا بازار گرم کیا کہ
ایسے ایسے بیورو کریٹس کے کارنامے سامنے آئے' جن کا شمار بے نظیر کے قریبت
داروں میں ہوتا ہے اور ان کے روابط اس قدر مضبوط ہوگئے کہ ان کی کرپشن کے
تمام ثبوت و شواہد سکرین سے غائب کر دیے جاتے۔ ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا
اور ان کو تمی اتھارٹی دی گئی کہ وہ حکومتی افراد سے روابط مضبوط کر کے اپنے کام کو
مزید آسان بنا لیتے۔ اس کے علاوہ برسر اقتدار پارٹی کے اہم افراد کی شفقت کا ہاتھ ان
کے سر پہ رہا اس لیے ان کے راستے کی تمام رکاوٹیں آسانیوں میں تبدیل ہو گئیں۔
بے نظیر دور کے اس کرپٹ مافیا کی پیداوار کا ایسا کردار جس نے کرپشن کی
دوڑ میں انتہا کر دی' اس کردار کا نام شفیع محمد سوانی ہے۔ وہ سی۔ ڈی اے اسلام آباد
کے چیئرمین تھے۔ انہوں نے اپنے عہدے کو مضبوط رکھتے ہوئے سابق وزیراعظم کے
شوہر کی قربت حاصل کی اور اربوں روپے کی لوٹ مار میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔
شفیع محمد سوانی آصف علی زرداری کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ وہ
آصف علی زرداری کی خواہشات پر عمل کرنا باعث فخر سمجھتے تھے اور ان کی خوشنودی
حاصل کرنے کی ہر طرح سے کوشش کرتے۔ ان کی اس چاپلوسی کی بدولت ان کو سی۔
ڈی اے اسلام آباد کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ چیئرمین بننے کے بعد سوانی نے آصف علی
زرداری کی طرف سے دیے گئے ٹارگٹ کو پورا کرنے کے لیے "عملی کام" شروع کر
دیا اور قانون کو پاؤں تلے روندتے ہوئے ہر ناجائز طریقے سے روپیہ اکٹھا کرنا شروع کر
دیا۔ اسی دوران آصف علی زرداری نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسلام آباد
یونیورسٹی کا منصوبہ شروع کر دیا۔ سوانی نے اپنے من پسند اور چہیتوں کو پلاٹوں کی

ناجائز الاٹمنٹ شروع کر دی اور کنونشن سنٹر کے ابتدائی منصوبے میں یادگاری بارہ دریوں کی تعمیر سے اپنے محسن کی خوشنودی حاصل کی۔

یاد رہے کہ جب بے نظیر حکومت توڑی گئی تو اس وقت بھی وہ اپنے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن الیکشن کے بعد نواز شریف کے آتے ہی وہ ہندوستان کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

مصلحت سے کام لیتے ہوئے لوٹ مار کے دوران جمع ہونے والے سرمائے کو شفیع محمد سوانی نے بیرون ملک بینکوں میں رقم کی صورت میں جمع کروانا شروع کر دیا۔ اس میں امریکہ، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور دیگر کئی ممالک شامل ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے سوچا کہ بینکوں میں پڑی ہوئی رقم زیادہ منافع بخش نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے پیاروں کے ذریعے جائیدادیں خریدنے کے کام کو بہتر جانا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سوانی نے امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست طارق ایم ارشاد کو جو پراپرٹی کی خرید و فروخت کے ایک ادارے سے وابستہ تھا، اسے بتایا کہ وہ امریکہ میں جائیداد خریدنا چاہتا ہے۔ طارق ایم ارشاد نے سوانی کو فیکس کے ذریعے ورجینیا میں جائیداد کے بارے میں تفصیلات کے بارے میں آگاہ کیا کہ:

☆ کمپیوٹر سائنس بلڈنگ چیرندون کی متوقع قیمت ۷۵ لاکھ ڈالر ہے۔
☆ فیرفاکس میڈیکل بلڈنگ اور اس کی متوقع قیمت ۵۷۰ لاکھ ڈالر ہے۔
☆ وک بروک بلڈنگ اور اس کی قیمت ۳۵ لاکھ ڈالر ہے۔
☆ ٹریل سیون بلڈنگ اور اس کی متوقع قیمت ۲۰ لاکھ ڈالر ہے۔

سوانی ان تفصیلات سے صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ اس نے اس سے مزید تفصیلات طلب کیں اور فیکس کے ذریعے ان فرموں سے رابطہ کرتے رہنے اور قیمتوں میں کمی اور منظوری سے متعلق اسے کہا۔

اسی دوران سوانی نے سچے ایک اور دوست طارق رشاد سے بھی روابط رکھے۔ جو خریداری کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ جو پل پل کی خبر سوانی کو دیتا تھا۔ طارق ایم ارشاد کی کوششوں سے سوانی نے امریکہ کے پراپرٹی سنٹر "مری ویسٹ پراپرٹیز لمیٹڈ" سے ساتھ زیادہ مختلف قسم کی جائیدادوں کی خریداری کے لیے معاہدہ کیا۔ سوانی نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے یہ تمام جائیدادیں اپنی اہلیہ روبی فرحانہ کے نام سے خریدیں۔ ان تمام جائیدادوں کی پاکستانی روپوں میں مجموعی مالیت

تین ارب روپے ہے' امری ویسٹ پراپرٹیز لمیٹڈ کو بیعانے کے طور پر چھ کروڑ روپے ادا کیے۔ اتنی بڑی جائیدادیں خریدنے پر امریکی ایجنٹ نے طارق اوشلو سے پوچھا کہ اس کا گاہک کس مالی حیثیت کا مالک ہے۔ تو سوانی نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس کے اور اس کے بیوی کے اکاؤنٹس میں ساڑھے چھبیس کروڑ ڈالر موجود ہیں۔

ایک ماہ میں سوانی کی خریدی جانے والی جائیدادوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

* (FAIRIDE FIDGE) - 4001 کا سودا ستاون لاکھ ڈالر میں ہوا جس کا بیعانہ دو لاکھ ڈالر ادا کیا گیا۔

* 601 - MADISON STREET ALEXANDRIA کا سودا ساٹھ لاکھ ڈالر میں ہوا جس کا پیشگی پچاس ہزار ڈالر ادا کیا گیا۔

* 699 STREET ALEXANDRIA کا سودا پچاس لاکھ ڈالر میں ہوا اور ایک لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیا گیا۔

* 3330 NORTH WASHINGTON_ BOULEVARD کا سودا ستاون لاکھ ڈالر میں ہوا اور ایک لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیا۔

* 734 - 15TH. STREET WASHINGTON. D.C کا سودا اناسی لاکھ ڈالر میں ہوا اور پچاس ہزار ڈالر پیشگی ادا کیا گیا۔

* 1025 - VERMONT AVENLIE N.W WASHINGTON D.C کا سودا بائیس لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوا اور دو لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیا۔

* 610 - FRANKLIN STREET ALEXANDRIA کا سودا چھیاسی لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوا اور دو لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیے۔

* 950 - HERNDON PARK WAY HERONDON کا سودا پچاس لاکھ ڈالر میں ہوا اور دو لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیا۔

* اور 2230 GALLOWS ROAD VIENINA کا سودا اکسٹھ لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں ہوا اور دو لاکھ ڈالر پیشگی ادا کیا۔

جام صادق علی

پاکستان کی متنازعہ ترین سیاسی شخصیات میں جام صادق علی کا نام بہت "جاندار" ہے اور اس کردار کے ساتھ جو تاریخ وابستہ ہے اسکی پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ سندھ میں ڈاکوؤں کی پشت پناہی کا معاملہ ہو یا مثلق استحکام حکومت کا' جام صادق علی کا نام سرِدفتر ملتا ہے۔ یہی حال جام صادق علی کی کرپشن کا بھی رہا۔

جام صادق علی کو ابتداء ہی سے سیاست بازی اور سیاسی جوڑ توڑ سے گہرا شغف تھا۔ جام صادق علی کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اس کے سیاسی مخالفین اسے اپنے مفادات کے لیے رائج الوقت اصطلاح "ابن الوقت" کی بجائے "ابن المسٹ" کے نام سے پکارتے۔ جام صادق علی نے اپنا سیاسی سفر بلدیاتی سیاست کے میدان سے شروع کیا۔ جام صادق علی کا یہ سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہا اور اس سفر کا انجام جام صادق علی کی متنازعہ ترین وزارت اعلیٰ پر آکر ہوا۔

جام صادق علی کا نام اس وقت متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سانگھڑ کے انتخابی دورہ کے دوران ذوالفقار علی بھٹو پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جام صادق علی کے مخالفوں اور ذوالفقار علی بھٹو کے حامیوں نے اس حملے کا الزام جام صادق علی پر لگایا۔ ان انتخابات میں جام صو علی نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور پیپلز پارٹی کے علاوہ پگاڑا لیگ کے امیدواروں کو شکست دے کر سندھ اسمبلی کا

انتخاب جیتا۔ بعد ازاں جام صادق علی نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور ممتاز بھٹو کی کابینہ میں وزارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب ممتاز علی بھٹو کی جگہ غلام مصطفیٰ جتوئی سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو اس مرتبہ جام صادق علی کو لوکل گورنمنٹ' ہاؤسنگ اور ٹاؤن پلاننگ کا صوبائی وزیر بنا دیا گیا۔

یہاں سے جام صادق علی کی کرپشن کا دور شروع ہوتا ہے۔ بھٹو حکومت کے خاتمے پر ضیاء مارشل لاء کے تحت جو قرطاس ابیض شائع کیا گیا اس میں جام صادق علی پر الزام لگایا گیا تھا "سندھ میں ہاؤسنگ ٹاؤن پلاننگ اور لوکل گورنمنٹ کے وزیر کی حیثیت سے جام صادق علی رہائشی اور تجارتی پلاٹ غیر قانونی طور پر فروخت کرانے اور مفاد عامہ کے لیے مخصوص کیے ہوئے پلاٹ کچھ افراد کو ریزرو قیمت پر الاٹ کرنے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے"۔

ٹریبونل میں اس طرح کی کئی بے قاعدگیاں ثابت ہو گئیں۔ مثال کے طور پر کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ایک ملازم نے اپنے بیان میں کہا کہ جام صادق علی نے کراچی کے مختلف علاقوں میں بعض افراد کے نام ایسے بہت سے پلاٹ الاٹ کر دیئے تھے جو قواعد کے مطابق نیلام عام یا قرعہ اندازی کے ذریعے فروخت ہونا چاہئیں تھے۔ اس ملازم نے الاٹمنٹ کی ۱۲۳ درخواستیں ٹریبونل میں پیش کیں جن کی جام صادق علی نے اپنے ہاتھ سے توثیق کی تھی۔ اس کے علاوہ جام صادق علی نے سندھ کے مختلف سرکاری محکموں میں سینکڑوں افراد کو غیر قانونی طور پر بھرتی کرا دیا اور ان لوگوں سے لاکھوں روپے رشوت وصول کر لی تھی۔ جام صادق علی نے پہلی بار بہت ہی منظم طریقے سے کئی ایسے گروپ کراچی میں متعارف کرائے جو سرکاری و عوامی املاک پر قبضہ کرتے اور پھر اس جائیداد کی فروخت یا اس پر غیر قانونی تعمیرات سے حاصل ہونے والی رقم میں سے جام صادق علی کو باقاعدہ حصہ فراہم کرتے۔

جام صادق علی کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے اپنے دور وزارت میں کراچی کو بیچ کھایا۔ ہزاروں کی تعداد میں سرکاری پلاٹ اپنے قریبی عزیزوں اور تعلق دار عورتوں میں تقسیم کر دیئے۔ کراچی میں کے ڈی اے (K D A) کا پلاٹ سکینڈل بھی جام صادق علی کے ذہن کی اختراع تھا جس سے جام صادق علی نے کروڑوں روپے

کمائے۔

جام صادق علی پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے اپنی وزارت کے دور میں درجنوں افراد کو سیاسی مخالفت کی بناء پر قتل کرایا۔ واضح رہے کہ ان مقتولین میں بڑی تعداد حروں کی تھی۔ جام صادق علی جب ہاؤسنگ کے صوبائی وزیر تھے تو اس دوران ذرائع ابلاغ میں ان کی کرپشن کا اس قدر چرچا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بار کراچی ایئرپورٹ پر جام صادق علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جام صاحب کہیں مزار قائد نہ الاٹ کر دینا ورنہ قوم میرے پیچھے پڑ جائے گی"۔

بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد جام صادق علی ملک سے فرار ہوگئے اور انھوں نے برطانیہ میں سیاسی پناہ حاصل کرلی۔ جام صادق علی ۱۱ سال تک برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی کاٹتے رہے۔ اس دوران جام صادق علی نے لندن میں رہائش پذیر محترمہ بے نظیر بھٹو کی بہت خاطرمدارت کی اور انھیں اپنی رہائش گاہ میں رہنے کی پیشکش کی جو بے نظیر بھٹو نے قبول کرلی اور بے نظیر بھٹو ناہید خان کے ساتھ جام صادق علی کے گھر میں رہنے لگیں' جہاں سے جام صادق علی کے سرمایہ سے ناہید خان اور صفدر ہمدانی نے ایک رسالہ "عمل" نکالا جو بیرون ملک مقیم پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پاکستان کے سیاسی حالات اور پیپلز پارٹی کی حکمت عملیوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا تھا۔

۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر برسراقتدار آگئیں تو ۱۹۸۹ء میں جام صادق علی پاکستان آگئے۔ بے نظیر نے جام صادق علی کو اپنا مشیر مقرر کرلیا۔ بعض لوگ یہ الزام لگاتے رہے کہ جام صادق علی جو کہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کے متمنی تھے' انھیں بے نظیر بھٹو نے اس لیے وزیر اعلیٰ نہ بنایا کہ آئی ایس آئی نے بے نظیر کو یہ کہا تھا کہ وہ جام صادق علی کو کوئی اعلیٰ عہدہ نہ دیں کیونکہ جام صادق علی بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کا ایجنٹ ہے۔

۶ اگست ۹۰ء کو جب غلام اسحٰق خان نے بے نظیر کی حکومت ختم کردی تو جام صادق علی کو سندھ کا نگران وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا سندھ کی نگران وزارت اعلیٰ کے دور میں بھی جام صادق علی نے کرپشن کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ذرائع نے

مطابق انہوں نے صرف کراچی میں ۳۰۰ پلاٹ ایسے لوگوں کو الاٹ کر دیے جو سندھ میں ڈاکوؤں کے سرپرست تھے اور جام صادق علی کا "عسکری سہارا" تھے۔ یہاں سے جام صادق علی کی سیاسی زندگی کا ایک نیا رخ جنم لیتا ہے۔ جام صادق علی نے بے نظیر اور پیپلز پارٹی کے بارے میں اپنا نظریہ مکمل طور پر تبدیل کر لیا اور ایک نئے روپ کے ساتھ ایک ظالم اور کرپٹ جام صادق علی کے "میک اپ" کے ساتھ سامنے آ گئے۔

۹۰ء کے انتخابات میں جام صادق علی نے صدر غلام اسحاق خان اور پاکستان کی "مقتدر قوتوں" کی حکمت عملی کا بھرپور ساتھ دیا اور پاکستان کی انتخابی سیاست میں "دھاندلی" کی ایک ایسی روایت کو جنم دیا جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک موقع پر خود کہا کہ "محترمہ بے نظیر بھٹو کو صدر مملکت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے انہیں لاڑکانہ سے ہرانے کی ہدایت نہیں کی اور اگر ایسی ہدایت مل جاتی تو سابق وزیراعظم اپنے آبائی حلقے سے بھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں"۔

۹۰ء کے انتخابات کے بعد جام صادق علی وزیراعلیٰ سندھ بنا دیے گئے۔ جام صادق علی آزاد رکن اسمبلی کی حیثیت سے منتخب ہوئے تھے۔ جام صادق علی نے سندھ کی وزارت اعلیٰ کے لیے اس طرح کا کھیل شروع کیا کہ پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتیں اپنی اکثریت کے باوجود ان کا راستہ نہ روک سکیں۔ جام صادق علی نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری کے خلاف درجنوں مقدمات درج کرا دیے۔ جام صادق علی نے سندھ میں پنجاب کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا بھی بیڑہ اٹھایا۔

نفرت کی اس فضا میں سندھ کے اندر علیحدگی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ جام صادق علی نے اس تحریک کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایم کیو ایم کو ہر طریقے سے مضبوط کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جام صادق علی نے شہری سندھ اور دیہاتی سندھ کے باشندوں کو ایک دوسرے کے خلاف اس طرح لڑایا کہ اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ جام صادق علی سندھ میں پیپلز پارٹی کو کچلنے میں مصروف ہو گئے۔

وزیراعظم نواز شریف نے کئی بار کوشش کی کہ جام صادق علی سندھ میں پی پی پی کے خلاف وحشیانہ کارروائی کا سلسلہ بند کر دیں لیکن ایوان صدر کی حمایت ہونے کے باعث جام صادق علی پر نواز شریف کا کنٹرول قائم نہ رہ سکا۔ جام صادق علی تو بھٹو کی طرح بے نظیر اور نصرت بھٹو کو بھی پھانسی دینا چاہتے تھے لیکن نواز شریف کی مخالفت کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔

سندھ میں جام صادق علی کو پی پی پی کے ساتھ کس قدر نفرت تھی' اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مارچ ۱۹۹۱ء میں نواز شریف نے بحیثیت وزیراعظم پاکستان سندھ میں ہونے والے جرائم اور ان کی روک تھام کی غرض سے تجاویز مرتب کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم سندھ بھیجنے کا اعلان کیا تو جام صادق علی برہم ہو گئے اور انہوں نے نواز شریف کو بحیثیت وزیر اعلیٰ خط لکھ کر کہا کہ سندھ میں تحقیقاتی کمیشن بھیج کر وہ صوبے میں مداخلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نواز شریف نے جام صادق علی کو س کی بغاوت کی سزا دینے کے لیے ایوان صدر میں بیٹھے غلام اسحاق خان سے رابطہ کیا تو غلام اسحاق خان نے کہا "جام صادق علی سندھ کا وزیر اعلیٰ ہے اگر آپ نے سندھ کی حد تک بے نظیر بھٹو کے ساتھ مفاہمت کرنے یا تعلقات کار بحال کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو کم از کم صوبے کے وزیر اعلیٰ' کو اعتماد میں لیں آخر انہیں ہم نے کس مقصد کے لیے بٹھا رکھا ہے؟"۔

نواز شریف وزیراعظم کے طور پر سندھ کو جرائم سے پاک علاقہ قرار دینے کے حامی تھے۔ وہ سندھ سے جرائم کا خاتمہ چاہتے تھے کیونکہ ان کے دور میں سندھ پر ڈاکوؤں کا راج تھا۔ اغواء برائے تاوان کی وارداتوں نے انتہائی سنگین صورت حال اختیار کر لی تھی۔ سندھ میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس صورت میں بھارت کے ایجنٹوں اور جرائم پیشہ عناصر کو سندھ میں آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مئی ۱۹۹۱ء میں اسی صورت حال کے پیش نظر فوج اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا۔ فوج آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے تحت اختیارات چاہتی تھی جبکہ جام صادق علی اور غلام اسحاق کسی صورت بھی ایسا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اسحاق خان اور جام صادق سندھ آپریشن کو پی پی پی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے

جبکہ فوج ڈاکوؤں سے زیادہ اہم کیو ایم میں داخل ہونے والے دشمن ایجنٹوں اور جرائم پیشہ عناصر کا خاتمہ چاہتی تھی۔

جام صادق علی کا مطالبہ تھا کہ پہلے سندھ کے دیہی علاقوں میں الذوالفقار کے ایجنٹ اور پی پی پی کی سرپرستی میں دندنانے والے ڈاکو مارے جائیں جبکہ شہری علاقوں میں آپریشن بعد میں کیا جائے۔ فوج شہری اور دیہی علاقوں میں بیک وقت آپریشن کی حامی تھی۔ اسی دوران ۱۱ مئی ۱۹۹۱ء کو سندھ میں ڈاکوؤں نے ۳ چینی انجینئروں کو اغوا کر لیا۔ اس واقعہ سے پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ چین کا سفارت خانہ حکومت سے چینی انجینئروں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہا تھا جبکہ ڈاکوؤں کا "سرپرست اعلیٰ" جام صادق علی ڈاکوؤں کو وزیراعلیٰ ہاؤس میں پناہ دیئے ہوئے تھا۔ نواز شریف کے مطالبے پر جام صادق علی نے جواب دیا سندھ میں حالات معمول کے مطابق ہیں اور وہ جلد ہی مٹھی بھر شرپسند عناصر پر قابو پا کر حالات معمول پر لے آئیں گے جبکہ دراصل چینی انجینئروں کے اغواء کا ڈرامہ خود جام صادق علی نے رچایا تھا اور اس کے پیچھے بھی مقاصد کارفرما تھے کہ کسی طرح اندرون سندھ میں پی پی پی کے کارکنوں کو کچلا جا سکے۔

جام صادق علی نے کھلے عام شراب نوشی کا اعلان کیا تھا تو بہت سے علماء اور دینی جماعتوں کے رہنما جام صادق علی اور وزیراعظم میاں نواز شریف پر برس پڑے تھے۔ میاں نواز شریف کی "اسلامی حکومت" کے اجزائے ترکیبی بھی ہل کر رہ گئے تھے۔ جام صادق علی نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ وہ صوبے میں زبردستی "احترام رمضان" کا بندوبست نہیں کر سکتے۔

جام صادق علی حکومت نے سندھ کو چار سے چھ ڈویژن اور ۱۷ سے ۲۳ اضلاع میں تقسیم کر کے سندھ کے نئے انتظامی ڈھانچے کا جو نقشہ تیار کیا' اس پر ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ بعض اخبارات نے جام صادق علی کو نئے "چارلس نیپیئر" سے تشبیہ دی۔ جام صادق علی کی خودسری کی جھلک ۲۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو بہت سے لوگوں نے سرکٹ ہاؤس میں اس وقت دیکھ لی تھی جب ایک پولیس آفیسر کے باڈی گارڈ پر ڈاکو ہونے کا الزام لگانے والے معزز شہری کو صفائی کا موقع اور پوری بات کہنے کی سہولت

دیئے بغیر بری طرح جھاڑ کر بٹھا دیا گیا تھا۔ حالانکہ ایسے حالات میں جب جام حکومت کا ڈی آئی جی خود پولیس افسروں کے ڈاکوؤں سے ملوث ہونے کی شہادت دیتا پھرتا تھا۔ کئی پولیس والے ڈاکوؤں کے ساتھ لوٹ مار کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جا چکے تھے۔ اس تناظر میں ایک ایس پی کے باڈی گارڈ پر لگایا جانے والا الزام صحیح ہو سکتا تھا مگر جام صادق کا الزام لگانے والے کے ساتھ جو رویہ تھا' اس سے کیا کچھ مترشح نہیں ہوتا تھا۔

جام صادق علی پاکستانی سیاست کا ایک ایسا کردار تھا کہ جس نے جی بھر کر اپنے مخالفوں کی تذلیل کی اور جب جی چاہتا اپنے ہی حلیفوں کی بے عزتی بھی کر دیتا۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں لامحدود پیمانے پر کرپشن کی اور اس کی وزارت ہاؤسنگ اور پھر وزارت اعلیٰ کے دوران یہ فقرہ مشہور تھا "جام نے آدھا کراچی بیچ کھایا ہے جو باقی بچا ہے وہ فسادات میں ختم ہو جائے گا"۔ جام صادق علی طاقت کے حصول کے لیے ہمیشہ ڈاکوؤں کا مرہون منت رہا۔ اس نے سندھ کی تاریخ میں پہلی بار خطرناک ترین ڈاکوؤں کو وزیراعلیٰ ہاؤس میں پناہ دی اور سرعام ان کی پشت پناہی کا دم بھرتا رہا۔

جنرل ضیاء الحق

جنرل محمد ضیاء الحق ۱۲ اگست ۱۹۲۴ء میں مولوی اکبر علی کے گھر واقع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مولوی اکبر علی شملہ میں وائسرائے ہند کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ضیاء الحق نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول شملہ سے پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا جہاں سے بی اے آنرز کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں فوج میں کیڈٹ آفیسر منتخب ہوگئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ضیاء الحق برما، ملائیشیا اور جاوا کے محاذوں پر انگریزی فوج کی طرف سے لڑتے رہے۔

قیام پاکستان کے وقت وہ جالندھر سے ہجرت کرکے پشاور آگئے۔ پاکستان میں انہوں نے نوشہرہ میں رسالہ رجمنٹ کے بوائز ونگ کمانڈر کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۰ اگست ۱۹۵۰ء میں ضیاء الحق کی شادی ان کی خالہ زاد شفیقہ بیگم سے ہوئی۔ ۲۶ سالہ ضیاء الحق اس وقت کیپٹن تھے۔ شفیقہ بیگم کی عمر شادی کے وقت ۱۸ سال تھی۔ ضیاء الحق نے ۱۹۵۵ء میں سٹاف کالج سے گریجویشن کی۔ ۱۹۶۴ء میں ضیاء الحق کو لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا جس کے بعد وہ سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۶۶ء میں ضیاء الحق بریگیڈیئر بن گئے اور مئی ۱۹۶۸ء میں انہیں ایک آرمڈ ڈویژن میں کرنل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ضیاء الحق کو بھٹو دور میں ۱۹۷۵ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنایا گیا تو بکتر ڈویژن کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں جنرل کا عہدہ ملنے پر چیف آف

آرمی سٹاف مقرر کیے گئے۔ ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی اور ۵ جولائی ۱۹۷۸ء میں اپنی بائیس رکنی کابینہ بنائی۔ اپریل ۱۹۷۹ء میں ہونے والے انتخابات کو ضیاء الحق نے ملتوی کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

ضیاء الحق نے ۱۹۸۸ء میں غیر جماعتی انتخابات کرائے اور اپنے گیارہ سالہ دور حکومت میں آئین میں اپنی مرضی کی ترامیم کروائیں۔ آٹھویں ترمیم بھی ضیاء الحق نے اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے جونیجو حکومت سے منظور کروائی۔ افغانستان کی جنگ میں ضیاء الحق نے اپنا کردار ادا کیا۔ ضیاء الحق ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء میں ایک فضائی حادثہ میں ہلاک ہوگئے اور ان کو اسلام آباد کی فیصل مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق (مرحوم) کی شخصیت کو اگر ایشیاء کی متنازعہ ترین شخصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بلکہ اگر ضیاء الحق مخالف لوگوں کا نقطہ نظر یہاں پیش کیا جائے تو ان کے بقول کائنات کی متنازعہ ترین شخصیات میں ضیاء الحق کا شمار صف اول کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ضیاء الحق کی شخصیت میں بیک وقت ایک ابن الوقت' چالاک' وعدہ خلاف' بدعنوان اور ایک "راسخ العقیدہ" مسلمان کے تمام اوصاف یکجا جتے ہیں۔ ضیاء الحق نے ۹۰ دن میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا اور منتخب حکومت کو اقتدار سونپ دینے کا اعلان کیا لیکن موصوف ۱۱ سال اور ۴۴ دن تک پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ اس گیارہ سالہ "حکومتی تپسیا" کے بعد ان کی شخصیت "امیر المومنین" کے درجات کو تیزی سے طے کرنے لگی تھی کہ اچانک ۱۷ اگست ۸۸ء کو بہاولپور کے نزدیک ان کا طیارہ حادثے کا شکار ہوگیا اور موصوف ہمراہ درجنوں اعلیٰ فوجی افسران کے ہلاک ہوگئے۔

۵ جولائی ۷۷ء کو ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا اور پاکستان کے کونے کونے سے غیر پسندیدہ اور پیپلز پارٹی مخالف سیاست دانوں کو چن کر اپنے ساتھ ملانے لگے۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے اپنی پہلی نشری تقریر میں آئین کے مطابق ۹۰ دن میں عام انتخابات کرانے کا وعدہ کیا لیکن آپریشن فیئر

بپے کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنے اقتدار کو اتنا طول بخشا کہ
وہ ۱۱ سال پر محیط ہو گیا۔ اقتدار کی مسند پر فائز ہونے کے چند ہی ماہ بعد ضیاء الحق بحالی
جمہوریت کا وعدہ گول کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کے دور حکومت کو ایک
غاصب' مداخلت کار اور آمر مطلق کا دور کہا جاتا ہے۔ وہ پہلے ہی دن سے پیپلز پارٹی کو
دبانے کے لیے مارشل لاء کے کوڑے کا استعمال کرنے لگے جس کے نتیجے میں پیپلز
پارٹی اور سیاسی کارکنوں کو قید و بند اور کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ صدر ضیاء الحق
کے دور حکومت میں سب سے زیادہ ضعف اسلام کو پہنچایا گیا کیونکہ انہوں نے اسلام
کے نام پر حکومت کی اور اسلام کے نام کو اس انداز میں اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل
کے لیے استعمال کیا کہ دنیا بھر کے تجزیہ نگاروں نے ضیاء الحق کے دور کو طنزاً
"اسلامائزیشن کی زد میں آیا ہوا دور" کہا۔ زکوۃ و عشر کے آرڈیننسوں سے لے کر
صلوۃ کمیٹیوں کے قیام اور پھر اپنی نوعیت کے انوکھے "ریفرنڈم" تک ضیاء الحق کی
شخصیت کی مختلف پرتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ضیاء الحق کی اس بہت بڑی اور فاش غلطی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو
انہوں نے ملک میں زکوۃ و عشر آرڈیننس کا نفاذ کر کے کی۔ یہیں سے پاکستان میں فرقہ
وارانہ جنگ کی باقاعدہ ابتداء ہوئی اور پھر ضیاء الحق نے اپنے فکری مخالفین کو کچلنے کے
لیے پارہ چنار کے طوری قبائل پر فوج کشی کر دی۔ ضیاء الحق کی لاگو کردہ زکوۃ کے
خلاف پاکستان کے اہل تشیع نے اسلام آباد میں ایک بڑا ہجوم اکٹھا کر لیا اور سیکرٹریٹ
کے سامنے ایک دن اور رات تک دھرنا دیا گیا۔ مجبوراً ضیاء الحق کو اپنے آرڈیننس میں
ترمیم کرنا پڑی لیکن یہاں سے جو مزاج ابھرا' آج اس کے بھیانک نتائج ہمارے سامنے
ہیں۔ ضیاء الحق جو اپنی شخصیت کی نمود و نمائش اسلام کے زیر سایہ اور اسلام کا نام
لے کر کرتے رہے' انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ اعلان کر دیا کہ دینی
مدارس کی اسناد اور ڈگریاں یونیورسٹیاں اور پبلک سروس کمیشن جیسے ادارے تسلیم
کریں گے۔ اس دور میں لاتعداد ایسے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں جنہوں نے
محض کسی دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہنر
نہیں تھا لیکن ان کو اعلیٰ ملازمتوں پر لے لیا گیا۔ خطیبوں کی تنخواہیں وغیرہ مقرر کر دی

گئیں۔ ضیاء الحق نے ہر اقدام' ہر فیصلہ' ہر حکم اور ہر تبدیلی کو اسلام کا نام لے کر نافذ کیا۔

ضیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو نے آٹھ سینئر جرنیلوں پر فوقیت دے کر مسلح افواج کا سربراہ بنایا تھا۔ ضیاء الحق نے اپنے اسی محسن کی حکومت ختم کی اور پھر خود اس کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور نواب محمد احمد خان بنام ذوالفقار علی بھٹو مقدمہ قتل کو نئے سرے سے شروع کرایا۔ استغاثہ کے ذریعے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ مقتول کو فیڈرل سیکیورٹی فورس کے ذریعے لاہور میں فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا۔ پہلے یہ مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں چلتا رہا جس نے اپنے فیصلے میں ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ پھر سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو بحال رکھا اور بالآخر ۴ اپریل ۷۹ کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

جنرل ضیاء الحق کا یہ اقدام اپنے اقتدار کو طول دینے کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے اپنی کسی بھی بات اور کسی بھی اقدام میں مستقل مزاجی اور بالغ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔ مارشل لاء کے آغاز ہی سے بعض سیاست دانوں سے ملاقاتوں کے دوران انہوں نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ وہ ۹۰ دن میں انتخابات کا وعدہ پورا کریں گے لیکن ۹۰ دن گزر جانے کے بعد انہوں نے مارشل لاء کو قوم پر مسلط رکھا اور انتخابات ملتوی کر دیئے اور ۱۹۸۵ء میں ایم آر ڈی کے زبردست دباؤ کے تحت وہ انتخابات کی جانب آئے۔

انہوں نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جن کا تقریباً تمام جمہوریت پسند جماعتوں نے بائیکاٹ کیا بلکہ سیاسی جماعتوں کو ان انتخابات سے خارج ہی کر دیا گیا۔ اس طرح ۱۹۷۳ء کے آئین اور جمہوری روایتوں کو بری طرح پامال کیا گیا۔ غیر جماعتی انتخابات کے بعد ضیاء الحق ایک غیر معروف سیاست دان محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنا دیا۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں ضیاء الحق نے نام نہاد اور "تاریخی" ریفرنڈم کے ذریعے ووٹ کی حرمت پامال کی۔ جب انہوں نے اپنے حق میں اسلامی نظام کے لیے ووٹ مانگا۔ یہ اسلامی مملکت میں اسلام کے ساتھ ایک سنگین مذاق تھا جس کی بازگشت پوری

دنیا میں حیرانی کے ساتھ سنی گئی۔ اس ریفرنڈم میں ۵ اور ۶ فیصد ووٹوں کو اپنی ۹۹ فیصد کامیابی میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح ایک سنگین بدعنوانی اور دھوکہ دہی کا ارتکاب کیا گیا۔ اصل صورت حال یہ رہی کہ عوام نے ضیاء الحق کے ریفرنڈم کو یکسر مسترد کر دیا اور عوام کی نفرت کا برملا اظہار ہوا۔ اس ریفرنڈم کے نتیجے میں ضیاء الحق مزید پانچ سال تک اپنے اقتدار میں اضافہ کر گئے۔

سماجی معاشرتی اور اخلاقی سطح پر ضیاء الحق دور ایک افراتفری' انتشار اور سماجی بگاڑ سے دو چار رہا۔ اسی دور میں کلاشنکوف کلچر کی ابتداء ہوئی۔ ہیروئن کی بین الاقوامی سطح پر سمگلنگ کا آغاز ہوا۔ اقرباء پروری' رشوت خوری اور پلاٹوں کی سیاست کا آغاز کیا گیا۔ صحافیوں کو نوازا گیا اور من پسند جرنلسٹوں کو مراعات دی گئیں۔ ۱۹۸۵ء میں اپنے ہی وضع کردہ نظام کے تحت بنائی گئی قومی اسمبلی اور وفاقی حکومت کو جنرل محمد ضیاء الحق نے بڑی آسانی کے ساتھ ختم کر دیا۔ محمد خان جونیجو کے تین سالہ دور اقتدار کو مالی و سیاسی رشوت اور اقربا پروری کا دور قرار دیا گیا اور اپنی ایک نشری تقریر میں جنرل ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کو بدعنوان قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس دور میں نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک بدعنوانی شروع ہوئی۔ معاشی حالت مفلوج ہو گئی اور حکومت اپنے وسائل کے بجائے سب کچھ قرضوں پر چلاتی رہی اور کراچی میں تین برسوں کے دوران جو تشدد آمیز واقعات اور خون خرابہ ہوا' وہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

جونیجو حکومت پر لگائے گئے ان الزامات کے تحت جنرل ضیاء الحق نے خود اپنے ہی استوار کردہ نظام کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کے اس اقدام کی ہر سطح پر مذمت کی گئی۔ جماعت اسلامی اور دیگر سیاسی جماعتوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس وقت کے قومی اسمبلی کے سپیکر حامد ناصر چٹھہ نے اس اقدام کو غیر ذمہ دارانہ کہا۔ صوبہ سرحد کے گورنر فدا محمد خان نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ جون کو صدر ضیاء الحق نے جن اٹھارہ ارکان کو اپنی کابینہ میں شامل کیا' ان میں آٹھ افراد ایسے تھے جو ضیاء الحق کی طرف سے بدعنوانیوں' لوٹ مار اور نااہلی کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی سابق حکومت میں بھی شامل تھے۔ ایسے

پرانے وزراء میں محمد اسلم خان خٹک' ملک نسیم احمد' ڈاکٹر محبوب الحق' چودھری شجاعت حسین' وسیم سجاد' سردار وزیر احمد جوگیزئی' چودھری نثار علی اور سردار فتح محمد حسنی شامل تھے۔

جونیجو حکومت کی برطرفی کے بعد ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے آئندہ انتخابات کی تیاریوں کے لیے رابطے شروع کر دیئے اور صدر ضیاء پر زور دیا جا رہا تھا کہ وہ انتخابات کے شیڈول کا اعلان کریں مگر ضیاء الحق انتخابات سے قبل اپنی پسند کے کچھ اقدام کرنے پر بضد رہے۔ ۱۵ جون کو انہوں نے شریعت آرڈیننس نافذ کر دیا مگر ساتھ ہی آرڈیننس کے نفاذ کے اگلے روز لاہور میں منعقدہ دینی جماعتوں کی کانفرنس نے اس شریعت آرڈیننس کو مسترد کر دیا اور اسے صدر ضیاء کی جانب سے اپنے اقتدار کو طول کی ایک کڑی قرار دیا۔

جنرل ضیاء الحق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتخابات کو معرض التواء میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان پر ہر طرح کا سیاسی اور عوامی دباؤ بڑھ رہا تھا جس سے مجبور ہو کر انہوں نے ۱۶ نومبر کو انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور کہا کہ انتخابات غیر جماعتی ہوں گے۔ اس فیصلے کے خلاف بھی سیاسی جماعتوں نے شدید احتجاج کیا لیکن ضیاء الحق اس بات پر اڑے رہے کہ عوام کی اکثریت غیر جماعتی انتخابات چاہتی ہے اور کوئی جماعت قومی سطح پر منظم نہیں ہے اور اگلے پانچ الیکشن بھی غیر جماعتی ہونے چاہئیں۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء تک انتہائی قیمتی پلاٹ اسلام آباد میں حاصل کرنے اور اعلیٰ قسم کی قیمتی کاریں ڈیوٹی فری درآمد کرنے والوں کی فہرست منظر عام پر آئی تو عوام پر راز کھلا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر مجلس شوریٰ کے ارکان کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے جنرل محمد ضیاء کو کس کس انداز میں سیاسی رشوت پیش کرنا پڑی۔
۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۸۵ء تک جن اعلیٰ فوجی اور سول حکام نے بیش قیمت ۲۹ ڈیوٹی فری کاریں درآمد کیں' ان میں (نواب عباسی گورنر پنجاب' لیفٹیننٹ جنرل فضل الحق گورنر سرحد' ایئرمارشل ریٹائرڈ رحیم خان' چیف آف نیول جائنٹ سٹاف مسٹر کرامت رحمٰن نیازی' چیئرمین جائنٹ سٹاف جنرل محمد شریف' لیفٹیننٹ جنرل سوار

خان' وائس ایڈمرل ریٹائرڈ اے آر خان' لیفٹیننٹ جنرل رحیم خان' جنرل محمد اقبال خان' جنرل محمد موسیٰ' لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم عباسی' لیفٹیننٹ جنرل فضل الحق (چار مرتبہ) لیفٹیننٹ جنرل رحیم گل حسن' سابق ایئرمارشل نور خان' لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عبدالحمید خان' وائس ایڈمرل ریٹائرڈ ایچ ایم ایس چودھری' وائس ایڈمرل مظفر حسن' محمد انور شمیم ایئر چیف مارشل' سابق لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین (دو مرتبہ) سابق میجر جنرل ریٹائرڈ عبدالرحمٰن خان (صدر آزاد کشمیر) لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان (دو مرتبہ شامل تھے)

اسی طرح پلاٹ حاصل کرنے والوں میں سبھی پارلیمنٹ کے ارکان تھے جن میں رانا شوکت حیات نون' سینیٹر صاحبزادہ الیاس' کنور قطب الدین خان' چودھری امام اللہ بھروانہ' میر محمد عارف جان' سابق کیپٹن ثناء اللہ' چودھری محمد نواز بوسال' ملک غلام محمد مجتبیٰ غازی کھر' سردار وزیر احمد جوگیزئی' دل مراد جمالی' سابق کرنل ڈبلیو ہربرٹ' امان اللہ خان شاہانی' حمید خان' حاجی نادر شاہ' میر خداداد خان ملک' حاجی جاوید اقبال عباسی' سینیٹر محمد علی خان ہوتی' سردار محمد سرفراز' نواب امان اللہ خان سیال' سید منظور حسین شاہ' چودھری محمد بشیر رندھاوا' محمد عبداللہ غازی' فیروز الدین انصاری' میاں ریاض احمد سردار محمد جہانگیر خان' پیر علی گوہر شاہ' چودھری ممتاز احمد جام' آغا عطا محمد خان' میر مہران خان بجارانی' شہاب الدین شاہ' حاجی خیر محمد' محمد قاسم خان' یعقوب خان جدون' سیٹھ چمن داس' مسز ریحانہ علیم مشہدی' بیگم بلقیس شہناز' مس نورجہاں پانے زئی' بریگیڈیئر ریٹائرڈ افتخار بشیر' سابق بریگیڈیئر محمد اصغر' محمد اکرم خان' پیر ثناء اللہ بودلہ' نواب یاسین خان' میر نواز خان مروت' عطا محمد مری' ملک عبدالرؤف' صاحبزادہ محمد احمد' علامہ مصطفیٰ الازہری' غلام الدین خان مروت' بیگم بلقیس نصرمن اللہ' گوہر یوب' سینیٹر نواب زادہ شیخ محمد عمر' فتح محمد خان' ایم پی بھنڈارا' بیگم سلمیٰ احمد' میاں محمد آصف' سینیٹر مولانا سمیع الحق' راجہ محمد افضل خان' چودھری محمد سرور' مسز فرخ مختار' صاحبزادہ محی الدین' ایم ایوب خان' سینیٹر اسحاق بلوچ' پورول' فضل داد خان' محمد صالح خان خلیل' عارف حسین' صاحبزادہ نور الحسن' رائے صلاح الدین خان' سینیٹر ذوالفقار علی چشتی' مقبول احمد خان' سینیٹر ملک گلاب خان' سینیٹر محمد عبدالقیوم خان'

سینیٹر محمد ہاشم خان' غلام محمد احمد خان' پیر محمد صابر شاہ' سینیٹر عبدالحمید قاضی' سینیٹر ملک سعد اللہ خان' رانا تنویر حسن' مولاداد خان' سینیٹر حسین بخش' سینیٹر یوسف خان ساسولی' سینیٹر شاہ محمد خان' خیر محمد بجرگری' قمر الزمان کھگ' خواجہ محمد صفدر' بیگم سروری صادق' سردار مسعود محمد خان لغاری' سینیٹر غلام محمد خان مہدر' سینیٹر سابق بریگیڈیئر عبدالقیوم' مولانا محمد رحمت اللہ' بھگواس داس چاولہ' گل جی' میر ظفر اللہ خان جمالی' حاجی فضل منان' ڈاکٹر شفیق چودھری' ملک نادر خان' سینیٹر ملک فرید اللہ خان' غلام محمد چشتی' بیگم نسیم مجید' رائے منصب علی' سینیٹر عبدالرحمن جمالی' سینیٹر منیر آفریدی' سینیٹر حبیب اللہ میمن' سینیٹر محمد افضل' ملک محبوب حسین' سینیٹر احمد میاں سومرو' ممتاز احمد تارڑ' چودھری امیر حسین سینیٹر پیر شجاعت حسین قریشی' امان المظفر' انور علی چیمہ' سینیٹر میاں امیر حیدر قریشی' راجہ شاہد سعید' سینیٹر سید خیال میاں' اسلام الدین شیخ' سینیٹر ملک عبدالوحید فہمید' حاجی خیال شاہ' حاجی نور شیر خان' ملک عمر دین بخش' سینیٹر امان اللہ شامل تھے۔

پھر مارچ ۱۹۸۵ء سے مئی ۱۹۸۸ء تک جن ارکان پارلیمنٹ کو قیمتی پلاٹ دیئے گئے اس میں ایس ایس ایم بکس ملکیت نواب محمد یامین خان' میسرز الیکٹرونک سسٹم ملکیت بیگم سلمیٰ محمد' میسرز گلمرگ اینڈ کمپنی ملک شیخ رشید احمد' میسرز کھوکھر کارپوریشن ملکیت محمد نواز کھوکھر' میسرز عمران فوڈ پراڈکٹس ملکیت مہران خان بجارانی اور میسرز پیراماؤنٹ انجینئرنگ سروسز ملکیت کنور قطب الدین خان شامل تھے۔

جونیجو حکومت پر جس طرح بدعنوانیوں' دھاندلیوں اور لوٹ کھسوٹ کا الزام لگا کر جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کی رات کو طول دیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سابقہ حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اسی طرح ضیاء حکومت بھی بدعنوانیوں اور لوٹ کھسوٹ کی ایک داستانیں چھوڑ گئی۔ جس پر آج بھی محب وطن عوام اپنے دل میں اس کی بازگشت سنتے ہیں۔ ضیاء نے ۱۹۷۸ء میں سول کابینہ تشکیل دی۔ اس دور میں کرپشن اپنے عروج پر رہی اور اس تمام تر بدعنوانیوں کے سرپر ضیاء الحق کا ہاتھ رہا۔ یہاں تک کہ مارشل لاء کے احتسابی قوانین بھی اس دور میں پامال کیے گئے اور ان قوانین کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی گئی۔

ضیاء دور میں قوانین مذاق بن گئے۔ وزراء پر مشتمل سول کابینہ کے دور میں اختیارات سے تجاوز' بدعنوانیوں کی نئی راہوں اور قومی خزانے میں لوٹ کھسوٹ کے ایسے ایسے واقعات منظر عام پر آئے کہ "امیر المومنین" کہلائے جانے والے ضیاء الحق پر قوم کا اعتماد متزلزل اور پارہ پارہ ہو گیا۔

۱۹۷۸ء کے دوران ری کنڈیشنڈ کاروں کا ایک سکینڈل منظر عام پر آیا۔ اس سلسلے میں ۵۰ ہزار کاریں جعلی دستاویزات کے ذریعے ایسے لوگوں کے ناموں سے منگوائی گئیں جن کا نام و نشان تک بھی نہیں تھا۔

اس سکینڈل میں ضیاء الحق کابینہ کا ایک وزیر میاں زاہد سرفراز بھی شریک تھا۔ جس میں میاں زاہد سرفراز نے ایک کروڑ روپے وصول کیے۔ کاروں کے سکینڈل میں ملوث افراد کو براہ راست وزراء کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اربوں روپے کی خرد برد کا یہ سکینڈل مارشل لاء حکومت کے دور میں پیش آیا۔

ضیاء کابینہ کے ایک اور وزیر مصطفیٰ گوکل کے حوالے سے پاکستان شپنگ کارپوریشن کے کچھ جہازوں کی فروخت اور دیگر جہازوں کی خریداری کا ایک سکینڈل بڑا معروف رہا۔ کابینہ کے اکثر وزراء مجوزہ سودے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن مصطفیٰ گوکل نے صدر ضیاء سے کسی طرح منظوری حاصل کر لی۔ اس سودے میں بھاری کمیشن لیا گیا۔

ضیاء دور میں کیے جانے والا احتساب ایک مذاق بن گیا۔ اس احتساب کے نعرے کو اپنے اقتدار کے طول کے لیے استعمال کیا گیا۔ دولت لوٹنے والوں سے کروڑوں روپے واپس نہ لیے گئے۔ ۷ سال کے لیے جن افراد کو نااہل قرار دیا گیا' ان کے الزامات اور کرپشن کی تفصیل کو بھی عوام تک نہ پہنچنے دیا گیا۔

عبوری آئین جاری کر کے اعلیٰ سول عدالتوں پر مارشل لاء عدالتیں مسلط کر دی گئیں۔

حکومت میں فوج کا کردار متعین کرنے اور سول اداروں فوجی افسر شاہی مسلط کر دی گئی۔

فوج کی خوشنودی حاصل کی گئی۔ جنرل ضیاء نے سول انتظامیہ' نیم سرکاری

اداروں، سرکاری کارپوریشنوں اور محکمہ خارجہ میں فوج سے ریٹائرڈ اور ریٹائرمنٹ کے قریب فوجی افسروں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔

۸۱ء کے وسط میں ۴۳ پاکستانی سفیروں میں ۱۸ کا تعلق فوج سے تھا۔

۱۹۸۵ء کے دوران ۹۲ فوجی افسروں کو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے افسروں کے لیے چن لیا گیا۔

کرپشن، بددیانتی، رشوت ستانی، سمگلنگ اور منشیات کا کاروبار عروج تک پہنچا۔ ناجائز اسلحہ کا دور دورا ہوا۔ کلاشنکوف کلچر کو فروغ ملا۔ فوج کے بعض اعلیٰ افسر رشوت ستانی کی وبا میں ملوث ہو گئے۔

واپڈا کے ایک جنرل نے ۵۰ کروڑ روپے تک رشوت حاصل کی اور بعد ازاں دوسرے ملک میں سفیر بنا کر بھیج دیئے گئے۔

بعض میجر منشیات سمگل کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ بعض جرنیل تک اس کاروبار میں ملوث ہوئے۔ جنرل فضل الحق منشیات اور اسلحہ کی سمگلنگ میں بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوئے۔ بہت سے فوجی افسروں نے امریکہ اور دوسرے ممالک میں جائیدادیں بنائیں اور دولت کمائی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جنرل ضیاء الحق نے ان تمام باتوں کا اعتراف کیا کہ وہ ملک سے بدعنوانی اور رشوت ستانی ختم نہیں کر سکے۔

اسلام کے ساتھ ضیاء الحق کی وابستگی اتنی ہی مشکوک تھی جتنی سیاست سے ساتھ۔ ضیاء الحق کا اصل مقصد خود کو امیر المومنین کے طور پر مسلط کرنا تھا تاکہ وہ حاکم کل ہو اور انصاف یا قانون اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں بدعنوانی کی انتہا ہو گئی۔ حتیٰ کہ خود ضیاء الحق نے بارہا اس کو تسلیم کیا کہ رشوت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ حتیٰ کہ پاک فوج کے اعلیٰ افسران بھی بدعنوانیوں کی زد میں آ گئے۔ جنرل فضل الحق کی شہرت منشیات اور اسلحہ کی سمگلنگ کے حوالے سے ساری دنیا میں پھیل گئی۔ بہت سے فوجی افسروں نے امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بڑی بڑی جائیدادیں بنا لیں۔

ضیاء الحق نے ۸۵ء میں قائم ہونے والی جونیجو حکومت میں شامل افراد کو اس خوبصورتی کے ساتھ بدعنوانیوں میں دھکیلا کہ جونیجو دور میں ہر سو بدعنوانیاں ہی

بدعنوانیاں نظر آتی ہیں۔ ضیاء الحق نے اپنی پوزیشن مستحکم رکھنے کے لیے نام نہاد سیاست دانوں کو وسیع پیمانے پر کرپشن کی اجازت دی اور خود انھیں پرمٹ جاری کیے اور ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کا اختیار دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ضیاء الحق "جمہوری حکومت" کو عوام کی نظروں میں بدنام کرنا چاہتے تھے اور بین الاقوامی سطح پر اس تاثر کو مضبوط کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان جیسے ملک میں جمہوریت نہیں پنپ سکتی اور اگر اقتدار سیاست دانوں کے سپرد کر دیا جائے تو پھر سوائے بدعنوانیوں کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کی پھیلائی ہوئی بدعنوانیاں اتنی گہری ہو چکی تھیں اور اس طرح پاکستانی سماج میں سرایت کر گئی تھیں کہ جونیجو حکومت کے لیے ان سے چھٹکارا پانا آسان کام نہیں تھا۔ مارشل لاء کی سول چھتری کے نیچے مارشل لاء کی بدعنوانیاں بدستور پھل پھول رہی تھیں۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین سردار زادہ محمد علی شاہ نے بینکوں' ریلوے' بیرونی تجارت اور کئی دوسرے سرکاری شعبوں میں خوفناک بدعنوانیوں کی جو نشاندہی کی تھی' اس کی پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

چیئرمین پبلک اکاؤنٹس کمیٹی سردار زادہ محمد علی شاہ کے بقول پاکستان کے بعض حکام بیرونی سودی کاروبار میں اپنی کمیشن عبادت کی طرح وصول کرتے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کے ذمے کروڑوں روپے کے قرضے معاف کر دیے گئے۔ لیکن ان کے نام اور اصل کوائف ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

اسی طرح صوبائی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور آڈیٹر جنرل آف پاکستان کی رپورٹوں میں بھی سرکاری محکموں میں پائی جانے والی سنگین بدعنوانیوں اور قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی چند انکشافات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ۵۰ ارب روپے کے خرد برد کا انکشاف کیا۔

۲۔ وفاقی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے مطابق ملک کے سرکاری محکموں میں ہر سال ۴۰ ارب روپے کا گھپلا ہو رہا تھا۔

۳۔ ایک سرکاری دستاویز کے حوالے سے سالانہ ایک کھرب روپے کے ٹیکس

چوری ہو رہے تھے۔

۴- ۸۳ ارب روپے کے قرضوں کی مختلف قسم کے دباؤ کی وجہ سے عدم ادائیگی۔

۵- جعلی سرمایہ کار کمپنیوں کا قیام اور ایک ارب روپے کا فراڈ۔

۶- ری بیٹ کی مد اور بینکوں میں کروڑوں کا فراڈ۔

۷- پنجاب کے ۱۷ محکموں میں ۸ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے کا فراڈ

۹- ریلوے کو سالانہ چار ارب روپے کا خسارہ

۱۰- افراط زر کی وجہ سے زیر گردش نوٹوں کی تعداد میں ایک ارب ۱۷ کروڑ روپے کا اضافہ۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار اور حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو صدر ضیاء الحق اپنے گیارہ سالہ دور کی سنگین بدعنوانیوں کے پروردگار کے طور پر سامنے آئے ہیں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مستورا بالا اعداد و شمار ضیاء دور کی مجموعی بدعنوانیوں کی محض ایک اعشاریہ ہے کیونکہ ابھی تک ضیاء دور کی بدعنوانیوں پر بہت بھاری پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بدعنوانیوں کے مجموعی طور پر افشاں ہو جانے سے ایک ایسا قومی ادارہ براہ راست تنقید کی زد میں آتا ہے جس کی بدعنوانیوں کے بارے میں کھل کر لکھنا یا ان بدعنوانیوں کی تحقیق کرنا ابھی تک رواج نہیں پا سکا ہے۔

ضیاء الحق اور اس کے ساتھیوں کی کرپشن کا بہت بڑا حصہ "اس مقدس جہاد" کی رگوں سے پھوٹتا ہے جو پڑوسی ملک افغانستان میں جاری رہا۔ ضیاء الحق اور اس کے ساتھیوں نے افغان جنگ کی پائپ لائن سے اربوں روپے کمائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس "مقدس جہاد" کے ذمے دار افراد کی نسلیں ایشیاء کی امیر ترین شخصیات میں شامل ہیں۔ ضیاء الحق کی شخصی کجروی کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ موصوف کو ایک بار یہ خیال آگیا کہ قوم کو سادہ زندگی اپنانے کا عملی درس دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی ذات کو منتخب کیا اور یہ پلان بنایا کہ وہ روزانہ چند کلومیٹر تک سائیکل چلایا کریں گے۔

انھیں ہر وقت اپنی جان کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ انھوں نے دوران سائیکل سواری اپنے تحفظ کے لیے امریکہ کے انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کی خدمات خریدیں۔ اس طرح محترم ضیاء الحق کی سائیکل سواری ایک ایک پیڈل پر کئی کئی لاکھ روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ کچھ دنوں تک جنرل موصوف کی سائیکل سواری جاری رہی۔ درباری لوگ داد و تحسین کے ڈونگرے بجاتے رہے اور عوامی دولت انتہائی بے دردی کے ساتھ خرچ ہوتی رہی لیکن ان کے محافظ غیر ملکی کمانڈوز نے ان کو بدستور تحفظ دینے سے معذرت کر لی۔ اس طرح ضیاء الحق کی سائیکل سواری اپنے اختتام کو پہنچی لیکن قوم کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ضیاء الحق کی شخصیت کا حاطہ کرنے کے لیے ایک بہت طویل ریسرچ کی ضرورت ہے اور اس شخصیت کا حق ایمانداری کے ساتھ اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس شخصیت کا مزاج' کارناموں اور بدعنوانیوں پر ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی جائیں۔

چودھری ظہور الٰہی

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں گجرات کے چودھری ظہور الٰہی کا نام ایک متحرک اور جاندار سیاست دان کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ چودھری ظہور الٰہی خاندان نے بعد میں اپنا سیاسی قد کاٹھ بہت بڑھایا ہے اور ملک کے کلیدی سیاسی عہدوں تک اس خاندان کے افراد پہنچے ہیں لیکن جو سیاسی روایت ظہور الٰہی سے منسوب ہے' یا جس طرح چودھری ظہور الٰہی نے اپنے طاقتور سیاسی مخالفین کا مقابلہ کیا اور پاکستانی سیاست میں جو کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چودھری ظہور الٰہی کی شخصیت اس وقت تنقید کی زد میں آنا شروع ہوئی' جب انہوں نے رائج الوقت حربے اختیار کر کے اپنے ذاتی کاروبار کو چمکانا شروع کیا۔ پھر چودھری ظہور الٰہی کو اپنی معاشی حالت مضبوط کرنے کا اس قدر چسکا پڑا کہ وہ ہر اس عمل کو جائز سمجھنے لگے جو ان کی جائیداد اور کاروبار میں توسیع کا باعث بنتا۔

چودھری ظہور الٰہی کے مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ چودھری ظہور الٰہی جو پولیس میں سپاہی بھرتی ہوئے تھے' اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل بن گئے تھے' انہیں بدعنوانی کے الزام میں پولیس کی نوکری سے برخاست کیا گیا۔ پولیس کی ملازمت کے خاتمے کے بعد چودھری ظہور الٰہی ۱۹۴۳ء میں امرتسر چلے گئے۔ امرتسر میں ان کے بھائی چودھری منظور الٰہی (پرویز الٰہی کے والد) مقیم تھے اور ایک ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر کی ملازمت کرتے تھے۔ چودھری ظہور الٰہی بھی اسی ٹیکسٹائل

مل میں ملازم ہوگئے۔ تقسیم کے بعد چودھری ظہور الٰہی کو میلا رام مل الاٹ ہوگئی اور یوں ایک دم ان کی زندگی تبدیل ہو کر رہ گئی۔

چودھری ظہور الٰہی پر الزام لگایا جاتا رہا کہ میلا رام مل کی الاٹ منٹ سے پہلے وہ محمد شفیع سمہ کے ساتھ مل کر کاروبار کرتے تھے اور یہ دونوں افراد رات کو چوری چھپے واہگہ کی سرحد سے کپڑا سمگل کیا کرتے تھے۔

میلا رام مل کی الاٹ منٹ سے چودھری ظہور الٰہی کی زندگی نئے سرے سے ایک نئے رنگ سے شروع ہوئی۔ یہ کاروبار ان کے لیے اتنا سودمند ثابت ہوا کہ وہ جلد ہی اپنے علاقے میں اس کاروبار کو پھیلانے میں کامیاب ہوگئے اور درمیانے درجے کے طبقے سے تعلق رکھنے والے چودھری ظہور الٰہی امیر اور کاروباری لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ معاشی آسودگی نے ان کی سماجی زندگی کو سہارا دیا اور وہ رفتہ رفتہ مقامی سیاست میں حصہ لینے لگے۔

چودھری ظہور الٰہی کی پہلی بڑی سیاسی کامیابی مخدوم زادہ حسن محمود کے ہاتھوں ہوئی۔ مخدوم زادہ حسن محمود جو اس وقت مغربی پاکستان کے وزیر بلدیات تھے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کے دورے کے دوران وہ گجرات آئے۔ گجرات آمد پر مخدوم زادہ حسن محمد کا چودھری ظہور الٰہی نے بہت شاندار استقبال کیا۔ جواب میں مخدوم زادہ حسن محمود نے گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور چودھری ظہور الٰہی کے مخالف سیاست دان نواب زادہ اصغر علی خان کو سبکدوش کر کے چودھری ظہور الٰہی کو ایڈمنسٹریٹر لگا دیا۔ اس عہدے کا ملنا تھا کہ چودھری ظہور الٰہی کا گجرات کی سیاست میں رول بہت بڑھ گیا۔ چودھری ظہور الٰہی نے ضلع کی سطح پر اپنی لابنگ شروع کی اور بے شمار مقامی سیاست دانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ چودھری ظہور الٰہی نے مقامی سیاست دانوں کو اپنی وساطت سے بڑھ کر نوازا اور اپنے گروپ کو گجرات کا طاقتور ترین گروپ بنا دیا۔

اس کے بعد قومی سیاست میں چودھری ظہور الٰہی کی کامیابیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ دن بدن مقبول ہوتے گئے۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں ان کے گروپ نے زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ خود چودھری ظہور الٰہی بھی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات کے بعد چودھری ظہور الٰہی ایوب خان کے بہت قریبی ساتھی کے طور پر شمار ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے تعلقات مغربی پاکستان کے گورنر نواب امیر محمد خان نواب آف کالا باغ کے ساتھ بھی بڑھ گئے۔ اسی دوران حکومت نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کر کے میاں افتخار الدین کو بے دخل کر دیا اور اس کی سربراہی چودھری ظہور الٰہی کو سونپ دی گئی۔ یہی وہ موقع تھا جس سے چودھری ظہور الٰہی نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پھر انھوں نے "انڈسٹریاں" قائم کرنے اور قرضوں کے حصول کے ساتھ ان کی معافی کا ایسا "سنہرا" اصول اپنایا کہ ان کا خاندان امیر سے امیر تر ہوتا گیا۔

چودھری خاندان کی مالی توسیع پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ کچھ برس پہلے جب بھی پریس ٹرسٹ کو ختم کر کے اس کے زیر انتظام چلنے والے صحافتی اداروں کو آزاد کرنے کا معاملہ اٹھتا چودھری خاندان کے موجودہ سربراہ چودھری شجاعت حسین (چودھری ظہور الٰہی کے بڑے بیٹے) پروگریسو پیپرز لمیٹڈ اور روزنامہ مشرق پر اپنے حق ملکیت کا دعویٰ لے کر اخباروں میں شور مچانا شروع کر دیتے۔ چودھری شجاعت حسین اپنا یہ دعویٰ اس بنیاد پر کرتے کہ ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران پی پی ایل ان کے والد چودھری ظہور الٰہی کے پاس رہا۔

پروگریسو لمیٹڈ کو حکومت نے اپنی تحویل میں لینے کے بعد عارضی مدت کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ حکومت کی براہ راست تحویل میں رکھ کر جنرل ایوب خاں اپنے منفی مقاصد کو لوگوں کے سامنے ننگا نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اس ادارے کو کسی ایسے شخص کی نام نہاد ملکیت میں دینے کا فیصلہ کیا جو صحافت کے مفہوم اور اس کے اغراض و مقاصد کو جاننے کی بجائے اپنے مالی مفادات کے فروغ کے تقاضوں کو سمجھتا ہو۔ اس کے لیے سب سے پہلے قرعہ فال داؤد گروپ سے انڈسٹریز کے احمد داؤد کے نام نکلا۔ پی پی ایل کے حصص جن کی اس وقت مالیت ۱۰۰ لاکھ روپے کے قریب تھی ان کو ۳۳ لاکھ روپے طے کر کے میاں احمد داؤد کے ہاتھوں بیچ دیا۔ احمد داؤد جلد ہی اس ذمہ داری سے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد ایوب خاں نے مختلف لوگوں کو آزمایا لیکن جب یہ سلسلہ بہت عارضی ثابت ہونے لگا تو ایوب خان

نے نواب آف کالا باغ کی ضمانت سے یہ ادارہ چودھری ظہور الٰہی کے سپرد کر دیا۔

چودھری ظہور الٰہی پی پی ایل کی تمام رام کہانی کو دیکھ رہے تھے اور انہیں اندازہ تھا کہ یہ مسئلہ ایوب خاں کی کمزوری بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا فیصلہ یہی ٹھہرا کہ پی پی ایل چودھری ظہور الٰہی کو عنایت کر دیا جائے۔ نواب آف کالا باغ نے بھی ایوب خان کے اس فیصلے کو سراہا اور چودھری ظہور الٰہی کو "مناسب" شخص قرار دیا۔ چودھری ظہور الٰہی نے پی پی ایل کے حصص خریدنے کی حامی تو بھر لی لیکن ساتھ ہی ایوب خان سے سوال کر دیا کہ وہ اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے ایک پیسہ بھی نہیں نکال سکتے اس لیے پی پی ایل کے حصص خریدنے کے لیے انہیں ۳۳ لاکھ روپے کا بندوبست کر کے دیا جائے۔ چودھری صاحب نے ایوب خان کو تجویز دی کہ اگر نیشنل بنک آف پاکستان انہیں ۳۳ لاکھ روپے قرض دے دے تو وہ یہ ادارہ خرید لیں گے۔ ایوب خان نے فوراً نیشنل بینک کو ہدایت کر دی کہ چودھری صاحب کو ان کا مطلوبہ قرض جاری کیا جائے۔ اس طرح چودھری ظہور الٰہی نے بنک کے تمام قواعد و ضوابط کو روند کر چوبیس گھنٹوں کے اندر ۳۳ لاکھ روپے وصول کر لیے۔

چودھری ظہور الٰہی نے ۳۳ لاکھ روپے کا قرضہ سی پی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام پر لے لیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ چودھری صاحب کی یہ انڈسٹری پہلے ہی نیشنل بینک کے کھاتوں میں ۴۲ لاکھ روپے کی مقروض تھی جبکہ اس کے اثاثے صرف ۱۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں تھے۔ چودھری ظہور الٰہی نے نیشنل بینک سے ۳۳ لاکھ روپے کا قرضہ حاصل کرنے کے لیے جو لاقانونیت اور بے ضابطگی برتی اس کی کچھ مثالیں ذیل میں دی جا رہی ہیں۔

۱۔ نیشنل بینک کو سی پی انڈسٹریز کی جعلی آڈٹ شدہ بیلنس شیٹس مہیا کی گئیں تھیں۔ جس آڈٹنگ کمپنی (ایس ایم اشرف اینڈ کمپنی) کی طرف سے یہ دستاویزات جاری کی گئیں اس کا اصل میں کوئی وجود تک نہ تھا اور چودھری ظہور الٰہی نے صریحاً جعل سازی اور دھوکہ بازی سے کام لیا۔

۲۔ سی پی انڈسٹریز لمیٹڈ کے اثاثوں کی کوئی چھان بین نہ کی گئی۔

۳۔ نیشنل بنک آف پاکستان بذریعہ جعلی دستاویزات یہ بات پوشیدہ رکھی گئی کہ

سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ آئی ڈی بی پی کے پاس لاکھوں روپے کے قرضے کے عوض رہن ہے۔

۴۔ ۳۳ لاکھ روپے کے قرض کی ادائیگی پہلے کی گئی جبکہ اس قرضے کو "محفوظ" کرنے کی غرض سے غلط سلط دستاویزات بعد میں تیار کی گئیں۔

۵۔ سی بی انڈسٹریز کے میمورنڈم میں یہ کلاز درج نہیں تھی کہ یہ کمپنی اخباری ادارہ چلا سکتی ہے۔ جبکہ پی پی ایل کے حصص کے لیے قرضہ دیتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا قانونی طور پر بینک کے لیے لازمی تھا۔

۶۔ نیشنل بنک نے ۳۳ لاکھ روپے کا نیا قرضہ منظور کرتے وقت اس قانونی ضابطے کو یکسر نظرانداز کر دیا کہ سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ نے پہلے سے لیے گئے قرضے کے واجبات میں سے ایک پیسہ بھی کبھی ادا نہیں کیا تھا یعنی یہ کمپنی نادہندہ چلی آ رہی تھی۔

چودھری ظہور الٰہی کو پی پی ایل کا ۱.۱ ؍جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کیے بغیر حاصل ہو گیا اور اس وقت جب لوگ ابھی بد سوانیوں اور بے قاعدگیوں میں الجھتے پھرتے تھے اگر کسی سیاست دان کو ایک بہت بڑا ادارہ مفت میں حاصل ہو گیا تو اس کے مستقبل کے کارنامے کیا نہ ہوں گے؟

چودھری ظہور الٰہی سی بی انڈسٹریز کے نمائندے کی حیثیت سے پی پی ایل کے مینجنگ ڈائریکٹر ضرور بن گئے لیکن ان کو پوری طرح علم تھا کہ یہ ادارہ جنرل ایوب خاں کی صوابدید پر ہے جبکہ دوسری طرف نیشنل بنک آف پاکستان سے حاصل کردہ ۳۳ لاکھ روپے کے قرضے کی شرائط بھی ان کو ناگوار نظر آ رہی تھیں۔ یعنی چودھری صاحب کے پاس وقت کم تھا اور پی پی ایل کے وسیع و عریض اثاثوں کو ہڑپ کرنے کے سنہری موقع کے بے کام بہت زیادہ تھا۔

چنانچہ چودھری صاحب مرحوم نے پی پی ایل کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرنے کی غرض سے جلد ہی تمام اطراف سے اس پر دھاندلی اور بدعنوانی اور لاقانونیت کی یلغار کر دی اور پہلے ہی روز تقریباً پندرہ تجربہ کار صحافیوں کو بیک جنبش قلم فارغ کر دیا۔ چند ہفتوں بعد پی پی ایل کے معروف ہفت روزہ لیل و نہار کو بند کر کے درجنوں

کارکن ملازمت سے محروم کر دیے گئے۔ پی پی ایل کے ملازمین اور کارکنوں کو بے دریغ بے روزگاری کی موت مارنے کا ہاتھ چودھری ظہور الٰہی نے اس مقصد کے لیے دکھایا تھا تاکہ باقی ماندہ کارکن صحافیوں اور ملازمین پر ملازمت سے برطرفی کا مستقل خوف طاری کیا جائے تاکہ ادارے کے اثاثوں کو لوٹنے کے پروگرام پر کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔ جبکہ ان دنوں کوئی بھی چودھری صاحب کے ان اقدامات کے خلاف قانونی تحفظ حاصل نہ ہونے کے سبب عدالتی چارہ جوئی نہ کر سکتا تھا۔ تمام صحافی کارکنوں اور ملازمین کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے اثاثوں پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے لمبے چوڑے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پی پی ایل کا ادارہ حاصل کرنے سے چند ماہ قبل چودھری صاحب نے دیوالیہ قرار دی گئی کمالیہ ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد کی ملکیتی زمین' سکریپ مشینری اور اجازت نامہ ۱۱ لاکھ پچھتر ہزار روپے میں خرید تھا۔ اس کے ساتھ ملحق متروکہ سرکاری ۳۵۰ کنال سرکاری اراضی بھی تھی جو دیوالیہ قرار دی گئی کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے ان اثاثہ جات کے لیے موصوف نے الگ چارہ جوئی شروع کی اور انڈسٹریل انڈر ٹیکنگ کے تحت اس معاہدے کے تحت کہ اس پر صرف صنعت نصب کی جائے گی اور کسی طرح سے بھی اسے کمرشلائز نہیں کیا جائے گا' یہ اراضی صرف دو لاکھ روپے میں حاصل کر لی گئی اور یہ رقم بھی غیر قانونی طور پر لیکویڈیٹر سے مل کر مذکورہ بالا گیارہ لاکھ پچھتر ہزار روپے میں سے ادا کروائی۔ یہ اثاثے سی بی انڈسٹریز کی طرف سے پی پی ایل کے نام ۶۷ لاکھ روپے میں منتقل کر دیے۔ پھر پی پی ایل کے نام پر نیشنل بنک سے ۶۷ لاکھ روپے کا قرضہ لے کر اس میں سے سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام نیشنل بنک آف پاکستان کے واجب الادا "۵۵" لاکھ روپے کے واجبات ایڈجسٹ کروانے کے بعد ۱۲ لاکھ روپیہ نقد جیب میں ڈال لیا۔ یعنی جرم کی حکمت سے اور اپنی آگاہی کی جادوگری سے چودھری صاحب نے قانون و ضابطے کی نرمی کا فائدہ اٹھا کر ایک ہی ہاتھ میں سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے گزشتہ تمام ۴۲ لاکھ روپے کے واجبات سمیت پی پی ایل کے حصص کے لیے بطور قرض حاصل کیے گئے ۴۳ لاکھ روپے واپس ادا کرنے کے بعد ۱۲ لاکھ روپے نقد ہتھیا لیے اور بالآخر پی پی ایل کی ملکیت کی کرسی پر براجمان ہونے کے

علاوہ کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے مذکورہ بالا اثاثوں پھیری کا بوجھ پی پی ایل پر ڈال دیا تاکہ بینک قرضوں کی بھرمار کے نیچے دبے ہوئے اس ادارے پر کوئی کاروباری ہاتھ نہ ڈال سکے حتیٰ کہ خود جنرل ایوب بھی یہ ادارہ ان سے لے کر کسی دوسرے کو دینے کی روایت پر عمل نہ کر سکے۔

چودھری ظہور الٰہی نے پھرپی پی ایل کے اثاثوں پر دوسری طرف سے حملہ کر دیا اور عنایت اللہ مرحوم کو کرتا دھرتا بنا کر روزنامہ مشرق کا اجرا کر دیا اس لیے کہ موصوف سمجھتے تھے کہ پی پی ایل یا تو ان کے اپنے ہاتھ سے ختم ہو جائے گا اور یا ان سے واپس لے لیا جائے گا۔ نسبت روڈ پر ایک بوسیدہ عمارت جو انھوں نے ان ہی دنوں ۱۹ ہزار روپے کے کلیم میں یعنی صرف نقد ۸ ہزار روپیہ میں ایک ضرورت مند ریٹائرڈ میجر سے خریدی تھی۔ اس عمارت کی قیمت ۵۰ ہزار روپے طے کر کے اس رقم سے اپنے عزیزوں کے نام مشرق لیمٹڈ کے حصص حاصل کر لیے اس کے علاوہ چودھری صاحب نے اپنی گرہ سے ایک پیسہ بھی مشرق کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ روزنامہ مشرق کے اجرا کے ضمن میں ہر قسم کے اخراجات کے لیے فنڈز کے حصول کا پائپ پی پی ایل کے وسائل پر لگا دیا گیا۔ روزنامہ مشرق کی پرنٹنگ پی پی ایل کے پریس سے ہونے لگی۔ اس کے ملازمین کی تنخواہوں سمیت تمام تر جملہ اخراجات کی ادائیگی پی پی ایل سے ہوتی تھی۔ چند ہی ماہ میں روزنامہ مشرق کے نام پی پی ایل کے واجبات ۱۸ لاکھ روپے سے تجاوز کر گئے جو بالآخر پریس ٹرسٹ کو قبول کرنا پڑے۔ اس وقت مذکورہ بالا ۸ ہزار روپے میں خریدی گئی بوسیدہ عمارت کی ۵۰ ہزار روپے قیمت لگا کر اس رقم کے حصص جاری کیے گئے وہ بھی چودھری صاحب نے پریس ٹرسٹ سے وصول کر لی تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے فنڈز سے چار لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم اپنی ماڈرن ظفور اینڈ جنرل ملز کے پلانٹ کی تعمیر میں خرچ کی اور ریکارڈ میں یہ دکھایا گیا کہ مذکورہ ظفور ملز کے احاطے میں پی پی ایل کے گودام تعمیر کیے گئے ہیں جبکہ اس وقت تک وہاں نہ تو کسی گودام کا وجود تھا اور نہ ہی قانونی طور پر اس احاطے میں پی پی ایل کے گودام تعمیر ہو سکتے تھے اس لیے کہ یہ زمین متروکہ وقف جائیداد بورڈ کی ملکیت تھی جس کے ساتھ معاہدے میں زمین کا اس قسم کا

استعمال ممنوع تھا۔ اخبارات کی گزشتہ پندرہ سالوں کی تمام فائلیں ردی میں بیچ دی گئیں۔

پی پی ایل کو لوٹ کھانے کی چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی ہوس کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ موصوف نے میاں افتخار الدین کی ایک فرم پاک روز لیمٹڈ کے اثاثوں پر قبضہ کرنے کا بھی منصوبہ بنا لیا تھا میاں صاحب کی باغبانپورہ میں کچھ اراضی اس فرم کے ساتھ وابستہ تھی جس کے حصول کے لیے چودھری صاحب کی رال ٹپکنا شروع ہوگئی تھی۔ علاوہ ازیں چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا یہ منصوبہ بھی تھا کہ سیاسی دباؤ ڈال کر متروکہ وقف املاک بورڈ سے معاملہ کر کے پی پی ایل کی زمین مع ملبہ پانچ لاکھ روپے میں قیمت لگا کر خرید لی جائے اور پھر اسے اس وقت کے حساب سے بھی کروڑوں میں بیچ کر پی پی ایل کا پریس اور اخبارات کے دفاتر کوٹ لکھپت منتقل کر دیے جائیں۔ یعنی اگر موصوف کو کچھ مزید مہلت ملتی تو وہ باقی ماندہ پورے پی پی ایل کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جاتے اور جنرل ایوب خاں سمیت ان کا کوئی کچھ بھی بگاڑ نہ پاتا۔

چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے ساتھ وابستہ بڑے سے بڑے صحافی اور پرانے کارکنوں کو کھڑے کھڑے ملازمت سے باہر نکالنے کی روایت ڈال کر خوف و ہراس کی جو فضا قائم کر دی تھی اس میں شاید ہی کسی کا منہ لوٹ مار کی اس بھرمار کے خلاف کھلتا تھا۔ تاہم پی پی ایل کے ساتھ کچھ افراد کی پرانی وابستگی نے اس ادارے کے ساتھ ان کی خیر خواہی کا پختہ رشتہ قائم کر دیا تھا کچھ صحافی جن کو اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں اکثر و بیشتر حکمرانوں کی محفلوں میں جانے کا موقع ملتا وہ چودھری صاحب کے ہاتھوں پی پی ایل کے لٹنے پر مبنی واقعات کو خاص طور پر نواب آف کالا باغ سے مخفی نہ رکھ سکے۔ نواب صاحب کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو ان کا آگ بگولا ہونا قدرتی تھا۔ دراصل یہی وجہ تھی جو نواب کالا باغ کے چودھری ظہور الٰہی سے فوری طور پر واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے پی پی ایل کو جس طرح سے چودھری صاحب نے قرضوں کی بھرمار سے دیوالیہ پن کے کنارے لا کر کھڑا کر دیا تھا اس کے پیش نظر کوئی کاروباری شخص اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

ان حالات میں پریس ٹرسٹ بنانے کے سوا جنرل ایوب خاں کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ چودھری ظہور الٰہی کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ پی پی ایل کے حصص پریس ٹرسٹ کو واپس کر دیں حکومت کو موصوف کی دو شرائط ماننا پڑیں ایک یہ کہ چودھری صاحب نے پی پی ایل کے اثاثوں کو ہڑپ کرنے کے لیے جن جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی جائے گی اور دوسرے پی پی ایل کے حصص کی پریس ٹرسٹ کو منتقلی کے لیے چودھری صاحب کے تیار کردہ تخمینے کی رقم بغیر چھان بین کے قبول کر لی جائے گی۔ چودھری صاحب نے ۳۳ لاکھ روپے کی رقم کے ساتھ ۱۱ لاکھ روپیہ اضافی لگا کر پریس ٹرسٹ سے ۴۴ لاکھ روپے کی رقم وصول کی۔ ۴۴ لاکھ روپے کی اس رقم کی وصولی چودھری شجاعت حسین کسی صورت پر بھی ظاہر نہیں کر سکتے اس لیے کہ ایسا کرنے سے پی پی ایل اور مشرق وغیرہ پر ان کے دعووں کا جواز ختم ہو کر رہ جاتا۔ چودھری صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی سلسلے میں یحییٰ خاں کے دور میں مشہور زمانہ جنرل رانی کو وسیلہ بنا کر موصوف سے اپنے نام نیشنل بنک کے واجبات میں سے ۲۷ لاکھ روپیہ بھی معاف کروا لیا۔ یاد رہے کہ پی پی ایل کی واپسی کے وقت چودھری صاحب نے کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے ساتھ ملحق ۲۵۰ کنال زمین بھی واپس اپنے نام کروا لی جو بعد میں ان لوگوں نے پلاٹ بنا کر فروخت کی۔

چودھری ظہور الٰہی کے انداز سیاست سے جو اثرات گجرات کی سیاست پر مرتب ہوئے انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر گجرات کی خونیں سیاست کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو یہ اخذ ہوتا ہے کہ کس طرح چودھری ظہور الٰہی نے گجرات میں مسلح گروپوں کی بنیاد رکھی اور ان گروپوں کے ذریعے کس نوعیت کے "سیاسی" کام لیے۔ گجرات کے نیم پسماندہ دیہات میں "چودھراہٹ" کا پہلا تصور چودھری ظہور الٰہی اور ان کے مخالف گروپوں نے دیا۔ چونکہ ضیاء الحق کی مکمل پشت پناہی کی وجہ سے چودھری ظہور الٰہی خاندان گجرات کا بااثر ترین خاندان تصور کیا جاتا تھا اس لیے اس خاندان کے حامی سیاست دانوں نے اپنے مخالفین کو زک پہنچانا شروع کی۔ چودھری ظہور الٰہی جو اپنے گروپ کو گجرات بلکہ پنجاب کا سب سے طاقتور اور بااثر گروپ بنانا

چاہتے تھے' انہوں نے صوبہ بھر کے جرائم پیشہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دیا۔

چودھری ظہور الٰہی جو مالی بدعنوانیوں اور حکمرانوں کی قربت کی وجہ سے اپنے خاندان کے لیے ایک بہت بڑی سٹیٹ تشکیل دے چکے تھے' اپنے مخالفین کو ہر طرح سے شکست دینا چاہتے تھے انہوں نے گجرات میں باقاعدہ مسلح گروپوں کو رواج دیا اور انہیں اپنے مخالفین پر چڑھا دیتے۔ مقامی پولیس کا مکمل تعاون چودھری ظہور الٰہی کو حاصل تھا اس لیے کسی کی جرات نہ ہوتی تھی کہ وہ چودھری خاندان یا اس خاندان کے حامی افراد پر ہاتھ ڈالتا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۱ء میں چودھری ظہور الٰہی کو لاہور میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے قتل کی ذمہ داری مرتضیٰ بھٹو نے قبول کی اور دعویٰ کیا کہ ظہور الٰہی کا قتل ان کی تنظیم الذوالفقار کا کارنامہ ہے۔ جنرل ضیاء الحق کا دور حکومت چودھری ظہور الٰہی کو بہت راس آیا۔ چودھری ظہور الٰہی مرکزی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے مراعات سمیٹتے رہے اور دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو کی دشمنی کی وجہ سے ضیاء الحق نے نہ صرف ان کو اور ان کے خاندان کو بے تحاشہ مراعات سے نوازا بلکہ انہیں لاکھوں روپے کے نئے قرضے دیئے گئے اور ساتھ ہی ۴۰ لاکھ روپے کے پرانے قرضے بھی معاف کر دیئے گئے۔

چودھری ظہور الٰہی نے اپنی پوری سیاسی زندگی "مفادات" سے منسلک رہ کر گزاری اور ہمیشہ حکمرانوں سے تعلقات استوار کر کے مراعات حاصل کرنا چاہیں اور وہ اس عمل میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ چودھری ظہور الٰہی کی اچانک موت کے بعد ان کے بیٹے چودھری شجاعت حسین اور بھتیجے چودھری پرویز الٰہی ان کے سیاسی جانشین کے طور پر ابھرے اور وراثت میں ملی ہوئی سیاسی روایات کے ساتھ انہوں نے اپنا سیاسی سفر اس طرح شروع کیا کہ انہیں قدم قدم پر کامیابیاں حاصل ہوتی گئیں۔ سیاست کے میدان میں بھی یہ لوگ پیچھے نہ رہے بلکہ کلیدی عہدے حاصل کرتے رہے اور کاروبار کے میدان میں بھی ان کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

سردار عارف نکئی

پنجاب کے سابق وزرائے اعلیٰ کی تاریخ میں ایک "باکمال" وزیراعلیٰ کی حیثیت سے سردار عارف نکئی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف اپنے احکامات میں مزاج سے لے کر اپنے عہدے کی بے ضابطگیوں تک اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ سو قیمتی اور جدید ترین گاڑیوں کا بیڑا ہو' سیلاب زدگان کی امداد کے لیے وفاقی حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے ہیلی کاپٹر کا ذاتی استعمال ہو یا اقتدار کی آخری رات صوابدیدی فنڈ کا ذاتی استعمال' سردار عارف نکئی کا ثانی تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ عارف نکئی کی وزارت اعلیٰ کا دورانیہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ اس امر پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ وزارت اعلیٰ کا عہدہ ایک طرح سے "مالک کل" کا عہدہ ہے جس کے ہوتے ہوئے وسائل کا ضیاع نہ کرنا اس منصب سے ناانصافی ہے۔

سردار عارف نکئی کی قسمت اس وقت کھل گئی جب پنجاب میں میاں منظور وٹو پیپلزپارٹی کے لیے قابل قبول نہ رہے۔ وٹو کی وزارت اعلیٰ کے عہدے سے برطرفی کے بعد پی ڈی ایف پنجاب میں پھوٹ پڑنے والے اختلافات کے باعث وزیراعظم بے نظیر پنجاب میں پیپلزپارٹی کا وزیراعلیٰ بنانے میں ناکام رہیں تو انہوں نے اپنی اتحادی جماعت مسلم لیگ (ج) کے ایک نسبتاً گمنام صوبائی وزیر کو وزارت اعلیٰ کے لیے چنا جو ایک درمیانے درجے کا سیاستدان اور کسی حد تک ایک غیر سنجیدہ منظم تھے پنجابیہ

کے وزیراعلیٰ کے طور پر اپنی نامزدگی کا سن کر سردار عارف نکئی نے خوشی سے بے قابو ہو کر جو پہلا کام کیا وہ ڈی ایس پی چونیاں کو فون تھا۔ اس وقت سردار عارف نکئی کے پاس موجود افراد کے مطابق سردار صاحب نے ڈی ایس پی چونیاں کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر نکئی خاندان کے حامیوں پر قائم مقدمات ختم کر دیں اور نکئی خاندان کے مخالف رانا پھول خاندان کے حامیوں کے خلاف مقدمات کا فوری چالان عدالت میں بھیج دیں۔ وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے سے لے کر اقتدار کے خاتمے تک جو کچھ سردار صاحب نے کیا یہ بہت حیران کن اور دلچسپ داستان کی حیثیت رکھتا ہے۔

سردار عارف نکئی ۸ اگست ۱۹۳۰ء میں موضع بھڑوال میں پیدا ہوئے۔ سردار صاحب نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ سردار عارف نکئی کے اسمبلی ریکارڈ میں ان کی تعلیم ایف۔ اے لکھی ہوئی ہے لیکن گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے میٹرک کے بعد سردار عارف نکئی کے تعلیم جاری رکھنے کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء سردار عارف نکئی ضلع کونسل لاہور کے وائس چیئرمین رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۸۔۷۹ء میں بھی سردار عارف نکئی ضلع کونسل کے وائس چیئرمین کے عہدے پر رہے۔ ۱۹۷۷ء میں سردار عارف نکئی نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کرائے لیکن بعد میں بائیکاٹ میں شامل ہو گئے اور انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں انہوں نے آئی جے آئی کے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ سردار عارف نکئی ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی صوبائی اسمبلی کی نشست سے کامیاب ہوئے۔ سردار صاحب ۱۹۸۵ء سے ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء تک مختلف صوبائی محکموں کے وزیر رہے۔ ستمبر ۹۵ء میں وٹو حکومت کے خاتمے کے بعد انہیں صوبائی وزیر صنعت سے اچانک پنجاب کا وزیراعلیٰ بنا دیا گیا اور یوں مسلم لیگی دھڑوں میں شامل ایک نسبتاً غیر معروف نام قومی سطح پر اہمیت اختیار کر گیا۔

نکئی خاندان کی تاریخ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تاریخ کا ایک باب سمجھی جاتی ہے۔ ملتان روڈ پر بھائی پھیرو نام کے قصبہ کے قریب واقع ایک پرانے گاؤں بھڑوال سے اس خاندان کی تاریخ وابستہ ہے۔ پندرہویں صدی کے آخری عشرے

میں آروڑا قوم کے ایک فرد "بھڑ" نے اس گاؤں کو آباد کیا۔ اس گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کی حیثیت سے چوہدری ہیراج کا نام ابھرا۔ اس کے بعد اس خاندان نے سکھ مذہب کے پانچویں گرو شری ارجن دیو جی کے ہاتھ پر ۱۵۹۵ء میں سکھ مذہب قبول کر لیا۔ بعد میں اس خاندان کے ایک طاقتور سردار ہیرا سنگھ نے قریبی علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ ہیرا سنگھ کے مقبوضہ علاقے کو "نکے کا علاقہ" کہا جانے لگا۔ واضح رہے کہ "نکا" پنجابی زبان میں کنارے یا دھارے کو کہتے ہیں۔ یہ علاقہ چونکہ دریائے راوی کا کنارہ تھا' اس لیے اس علاقے کو نکا اور اس علاقے کے حاکم خاندان کو "نکے والا خاندان" کہا جانے لگا۔ نکے والا خاندان آہستہ آہستہ نکئی خاندان بن گیا اور پھر آخر میں صرف خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ نکئی لکھنا شروع ہو گئے۔

نکئی خاندان اس وقت بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا جب پنجاب کی سب سے طاقتور گدی یعنی سوکرچاکیہ مسل کے سربراہ رنجیت سنگھ کی شادی نکئی خاندان کی لڑکی "راج کور" سے ہو گئی۔ رنجیت سنگھ بعد میں پنجاب کا حکمران بنا اور اپنی فتوحات کو آگے بڑھاتا رہا۔ رنجیت سنگھ نے نکئی خاندان کو نقصان پہنچایا اور ان کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا اور پورے خاندان کے لیے ۱۵ ہزار روپے مالیت کی جاگیر پنشن کے طور پر مخصوص کر دی۔

۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ نکئی خاندان کے لیے بہت کٹھن رہا۔ اس وقت نکئی خاندان کی سربراہی سردار عطر سنگھ اور ایشر سنگھ کے پاس تھی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد نکئی خاندان کو اپنی کھوئی ہوئی جاگیریں واپس ملنا شروع ہو گئیں اور اس خاندان کے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے۔ اسی دوران گوجرانوالہ کے نواحی قصبہ "اروپ" کی ایک روحانی شخصیت خواجہ برکت علی کی کرامات دیکھ کر سردار عطر سنگھ اور سردار ایشر سنگھ نے اسلام قبول کر لیا۔ عطر سنگھ کا اسلامی نام عبدالعزیز نکئی رکھا گیا جبکہ ایشر سنگھ سردار خدا بخش نکئی بن گئے۔ ایشر سنگھ جو سردار عبدالعزیز نکئی بن گئے تھے' کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام سردار دین محمد نکئی تھا جو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تحصیل چونیاں بھی رہے۔ دوسرے بیٹے کا نام سردار محمد اکبر نکئی تھا جو آنریری مجسٹریٹ اور ذیلدار ہوئے۔ سردار دین محمد نکئی کے تین بیٹے ہوئے جن میں

سب سے چھوٹے بیٹے کا نام سردار محمد عارف نکئی رکھا گیا۔

۱۹۴۷ء میں نکئی خاندان کے سکھ افراد ہندوستان چلے گئے اور وہاں اعلیٰ حکومتی عہدوں پر پہنچے جبکہ پاکستان کے ضلع قصور کے رہائشی نکئی خاندان' جس نے اسلام قبول کر لیا تھا' باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے لگا اور ساتھ ساتھ اپنی وسیع و عریض جاگیرداروں کو سنبھالنا شروع کیا۔

سردار عارف نکئی چونکی کے چار دیہات میں وسیع و عریض زرعی اراضی کے مالک ہیں۔ موضع واں آدھن جہاں اس وقت سابقہ وزیراعلیٰ سردار عارف نکئی کا خاندان آباد ہے' وہاں سردار عارف نکئی کی ملکیتی ۹ مربع اراضی ہے۔ سردار عارف نکئی کے منشی ناصر حسین کے بقول اس اراضی سے عارف نکئی کو سالانہ ۱۰ لاکھ روپیہ آمدن ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ موضع بوتگ سردار کاہن سنگھ عرف ڈوبا میں سردار عارف نکئی کی ملکیتی ساڑھے چار مربع اراضی ہے اور اس اراضی سے عارف نکئی کو ۲۰ لاکھ روپیہ آمدن ہوتی ہے۔ موضع کوٹ سردار کاہن سنگھ میں عارف نکئی کے پاس ۵ مربع زرعی اراضی ہے جس سے ۱۵ لاکھ روپیہ آمدن ہوتی ہے جبکہ موضع چونیاں کلاں میں سردار عارف نکئی کے پاس ۹ مربع زرعی اراضی ہے' جس میں اعلیٰ درجے کا چاول اور گندم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس اراضی سے سردار عارف نکئی کو ۱۵ لاکھ روپے آمدن ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سردار عارف نکئی موضع واں آدھن میں ۲ مربع اراضی پر مشتمل باغ کے بھی مالک ہیں جہاں سے نکئی کو لاکھوں روپے آمدن ہوتی ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ اس تمام آمدن پر سردار عارف نکئی ایک پیسہ بھی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے وفادار پٹواری ان کی اراضی کو بنجر در ناقابل کاشت ظاہر کر کے معمولی نوعیت کے ٹیکس اور مالیہ وغیرہ بھی بچا لیتے ہیں۔

اگرچہ سردار عارف نکئی نے اپنی "کارروائیوں" کا آغاز ستمبر ۹۵ء سے کیا اور نومبر ۹۶ء تک سردار عارف نکئی وزیر اعلیٰ پنجاب کی حیثیت سے کروڑوں روپیہ کما چکے تھے لیکن سردار عارف نکئی کی باقاعدہ "فتوحات" کا آغاز صوبائی وزیر لائیو

سردار عارف نکئی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے صوبائی وزیر لائیو سٹاک کی حیثیت سے محکمہ کو ملنے والے فنڈز کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا شروع کیا۔ ان کی وزارت کے دوران ایشیائی ترقیاتی بینک نے لائیو سٹاک پراڈکشن ایجوکیشن کے لیے ایک ارب روپے سے زائد مالیت کا ایک تربیتی پروگرام پنجاب کے ■ اضلاع کے لیے منظور کیا۔

اس پروگرام کا مقصد لوگوں کو مال مویشیوں کی پرورش کے سلسلہ میں تربیت دینا تھا تاکہ جانوروں کی بیماریوں وغیرہ کا مناسب تدارک کر کے جانوروں کی شرح اموات کو کم کیا جا سکے۔ وزیر لائیو سٹاک سردار عارف نکئی نے اس سارے تربیتی پروگرام کو نظرانداز کر کے اس رقم میں سے پانچ جدید ترین اور قیمتی گاڑیاں خرید لیں۔

سردار عارف نکئی نے ان گاڑیوں کو اپنے پاس رکھنا مناسب خیال نہ کیا اور پانچوں گاڑیاں بہاولپور کے رہائشی اپنے ایک عزیز افضل جج کے سپرد کر دیں۔ افضل جج ان گاڑیوں کو اپنے زرعی فارم اور پولٹری فارم کے استعمال میں لاتے رہے۔

نکئی خاندان کا صوبائی محکمہ لائیو سٹاک میں باقاعدہ عمل دخل اس وقت شروع ہوا جب سردار محمد عارف نکئی کے بھانجے عامر سلطان چیمہ نواز شریف دور میں اس محکمہ کے وزیر بنے۔ اس کے بعد نکئی خاندان کو اس محکمہ کی وزارت ایسی راس آئی کہ اگلی مرتبہ سردار عارف نکئی نے یہ وزارت خود سنبھال لی۔

الزام ہے کہ سردار عارف نکئی لائیو سٹاک کے لیے خریدی جانے والی ادویات میں سے باقاعدہ کمیشن حاصل کرنے لگے اور لائیو سٹاک کی قیمتی گاڑیاں سردار صاحب کے گھریلو استعمال میں رہیں۔ اس کے علاوہ ۶۴ لاکھ روپے مالیت کی جو گاڑیاں سردار عارف نکئی نے اپنے قریبی عزیز اور دوست اعجاز جج کو صرف اس مقصد کے لیے دی تھیں کہ وہ انھیں اپنے زرعی فارم پر استعمال کریں اور جب وہ خود بہاولپور میں شکار کھیلنے جائیں تو ان کے کام آئیں۔ صرف چار ماہ کے اندر ہی تباہ ہو گئیں۔ جب یہ گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں تو سردار عارف نکئی نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ ان گاڑیوں کے ڈھانچے بہاولپور ڈویژنل آفس میں پہنچا دیں۔ آج بھی ان

گاڑیوں کے بچے کھچے ڈھانچے ڈویژنل آفس بہاولپور کے احاطے میں پڑے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سردار عارف نکئی نے لائیو سٹاک ڈپارٹمنٹ کے لیے صرف "سیوسن" نامی ایک دوا کی خرید میں سے ۲ کروڑ روپے کمیشن وصول کیا۔ سردار عارف نکئی نے اپنے سٹاف افسر وارث واہلہ کے ذریعے بھاری کمیشن کے عوض لیبارٹری کے لیے ویکسین تیار کرنے والا ایک یونٹ خریدا۔ ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ سردار عارف نکئی نے اس یونٹ کی خرید میں ۲۰ لاکھ روپے بطور کمیشن وصول کیے۔

فریز ڈرائر نامی اس یونٹ کی تیاری میں تمام پرزے ایسے استعمال کیے گئے جو انتہائی کم لاگت پر مقامی سطح پر تیار کیے گئے تھے۔ یہ یونٹ شروع دن سے ناکارہ پڑا ہے۔ اس یونٹ کو چالو کرنے کے لیے غیر ملکی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

الزام لگایا جاتا ہے کہ لائیو سٹاک کے لیے ادویات خریدنے کے لیے تشکیل دیے گئے پرچیزنگ سیل نے ۵ کروڑ روپے کی ادویات خریدیں اور چونکہ یہ ادویات وزیر لائیو سٹاک کی رضامندی کے ساتھ خریدی جا رہی تھیں اس لیے ایسی ادویات خریدی گئیں جن کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور اس سودے میں سے صرف سردار عارف نکئی کو سوا کروڑ روپیہ بطور کمیشن پہنچایا گیا۔

اسی طرح سردار عارف نکئی کی سربراہی میں لائیو سٹاک پراڈکٹس ایکسٹینشن پروگرام کے تحت سوا ارب روپے پر بھی ہاتھ صاف کیے گئے۔ صرف اس پراجیکٹ کی رقوم میں سے فوری طور پر ۲۹ عدد قیمتی گاڑیاں خریدی گئیں جن میں سے ۶ گاڑیاں وزیر لائیو سٹاک کے خاندان کے استعمال میں رہیں جبکہ باقی گاڑیاں محکمہ کے اعلیٰ عہدیداروں کے استعمال میں چلی گئیں۔

ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ سردار عارف نکئی نے اس پراجیکٹ میں سے ۳۰ کروڑ روپیہ کمایا اور یہ سارا پراجیکٹ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ بعد میں اس پراجیکٹ میں مالی تعاون کرنے والے بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور مزید فنڈز دینے سے انکار کر دیا۔

صوبائی محکمہ لائیو سٹاک میں سردار عارف نکئی کے "اثر و رسوخ" کا اندازہ

اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سردار عارف نکئی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے تو بھی لائیو سٹاک کے اعلیٰ عہدیدار ان کا پورا پورا "خیال" رکھتے۔ جب سردار عارف نکئی کی وزارت اعلیٰ ڈانواں ڈول تھی' اس وقت بھی لائیو سٹاک اور جنگلی حیات کے محکمہ کے اعلیٰ افسران نکئی کو خوش کرنے کے لیے بھاری رشوت ان تک پہنچاتے رہے۔ اکتوبر ۹۶ میں لائیو سٹاک سے نکئی کو بھاری کمیشن دیا گیا جبکہ محکمہ تحفظ جنگلی حیات کے ڈائریکٹر جنرل میاں محمود احمد نے اپنی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کے گاؤں آدھن میں تین عدد پنجرے بنوا دیئے۔ ان پنجروں میں لاہور چڑیا گھر سے اعلیٰ نسل کے ہرنوں کے تین جوڑے منتقل کیے گئے جن کی مالیت لاکھوں روپے تھی۔ چڑیا گھر سے غائب ہونے والے ان ہرنوں کے جوڑوں کے بارے میں جب انکوائری کی گئی تو اس وقت یہ رپورٹ تیار کی گئی کہ ہرنوں کے ان جوڑوں کو چھانگا مانگا کے جنگل میں چھوڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈائریکٹر جنرل جنگلی حیات نے لاہور چڑیا گھر کے محدود بجٹ میں سے تین نئے پنجرے وزیر اعلیٰ ہاؤس کے کلب روڈ میں رکھوائے جن کے لیے پرندے چڑیا گھر سے بھیجے گئے۔

۳ فروری ۹۷ کے انتخابات کے لیے بھی صوبائی محکمہ لائیو سٹاک کے اعلیٰ عہدیداروں نے سردار عارف نکئی کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نکئی کی انتخابی مہم کو کامیاب اور موثر بنانے کے لیے محکمہ کی ملکیتی قیمتی گاڑیاں اور دیگر وسائل جھونک دیئے۔ لائیو سٹاک کے ڈائریکٹر جنرل محمد شفیع گل اور ڈائریکٹر لائیو سٹاک پراڈکشن ایکسٹینشن میجر (ر) یوسف گل نے ایشیائی ترقیاتی بینک کے قرضے سے خریدی گئی چھ عدد ڈبل کیبن گاڑیاں سردار عارف نکئی کی لاہور میں رہائش گاہ واقع کیولری گراؤنڈ پہنچا دیں جبکہ تین دیگر نئی گاڑیاں سابق وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کے آبائی گاؤں واں آدھن میں بھیج دیں۔ یہ ۹ گاڑیاں سرکاری خرچ سے سابق وزیر اعلیٰ کی انتخابی مہم چلاتی رہیں اور جب مہم کے خاتمے پر محکمہ لائیو سٹاک کو واپس بھیجی گئیں تو ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ یہ محکمہ کے کام آ سکتیں۔ لہٰذا انہیں "گراؤنڈ" کر دیا گیا۔

سردار عارف نکئی نے وزیر اعلیٰ پنجاب بننے کے بعد بھی محکمہ لائیو سٹاک

میں اپنی مداخلت جاری رکھی اور محکمہ کا ادویات کا سالانہ بجٹ جو ۳ کروڑ روپے تھا' اسے بڑھا کر ۵ کروڑ روپے کر دیا۔ الزام ہے کہ انھوں نے ساتھ ہی ادویات کی خریداری پر ۳۵ فیصد کمیشن بھی حاصل کرنا شروع کر دیا۔ سردار عارف نکئی نے نہ صرف محکمہ لائیو سٹاک میں اپنی برادری کے لوگوں کو تنگے مانے کے جتن کیے بلکہ درجنوں ایسے افراد کو آؤٹ آف ٹرن ترقی دے دی جو یا تو ان کے عزیز تھے یا پھر وہ "باقاعدگی" کے ساتھ انھیں کمیشن پہنچاتے رہے تھے۔

سردار عارف نکئی نے وزیر اعلیٰ پنجاب کا عہدہ سنبھالتے ہی پنجاب بینک کے اعلیٰ افسران پر دباؤ ڈال کر انھیں مجبور کر دیا کہ وہ ان کے عزیز عبدالحمید نکئی کی ملکیتی "حمید ٹیکسٹائل مز" کو دی جانے والی قرض کی رقم کو دگنا کر دیں۔ واضح رہے کہ حمید ٹیکسٹائل ملز پہلے ہی نادہندہ تھی اور اس کے باوجود اس کو ملنے والی ساڑھے چار کروڑ روپے قرض کی رقم کو وزیر اعلیٰ کی شدید خواہش پر ۹ کروڑ روپے کر دیا گیا۔

نکئی کے وزیر اعلیٰ پنجاب ہونے کا بھرپور فائدہ ان کے عزیز رکن قومی اسمبلی سردار طالب حسن نکئی نے اٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے وزیر اعلیٰ ہاؤس میں اثر و رسوخ کے بل پر لاہور میں نئے تعمیر ہونے والے جناح ہسپتال کے لیے بھرتیاں شروع کر دیں۔ بعض ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ سردار طالب حسن نکئی نے وزیر اعلیٰ عارف نکئی کی ایماء پر جناح ہسپتال کے لیے ۲۰۰ افراد کو بھرتی کروایا۔ اس موقع پر دو دیگر بھرتی کنندگان بھی میدان میں کود پڑے۔ پنجاب کے سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان اپنے طور پر جناح ہسپتال کے لیے بھرتیاں کرنا چاہتے تھے جبکہ چودھری بدر الدین صوبائی وزیر صحت ان بھرتیوں کو اپنا ازلی حق قرار دیتے تھے۔ ملک مشتاق اعوان اور بدر الدین چودھری نے بھی بھرتی کے خواہش مند ڈاکٹروں اور دیگر عملے کو تقرر نامے جاری کرنا شروع کر دیئے۔ لیکن آخری فتح سردار طالب حسن نکئی کو نصیب ہوئی اور ان کے بھرتی شدہ سٹاف کو جناح ہسپتال میں رکھ لیا گیا۔ وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی چونکہ بھرتیوں وغیرہ کو "معمولی کام" سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس نوعیت کے زیادہ تر اختیارات اپنے فرزند سردار آصف نکئی کے حوالے کر رکھے تھے۔

سردار عارف نکئی نے ہمیشہ اپنے عزیز و اقارب کی سہولت کو اولیت دی اور اپنی صوبائی وزارت اور وزارت اعلیٰ کے دوران لاتعداد ایسے احکامات جاری کیے جو صرف ان کے عزیز و اقارب کو فائدہ پہنچانے کے لیے تھے۔ مثال کے طور پر وزارت اعلیٰ سنبھالنے کے دو ماہ بعد وزیر اعلیٰ نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا کہ پنجاب کی تمام ڈویژنیں فوری طور پر وی وی آئی پی شخصیات کے لیے جدید ترین لینڈ کروزر اور پجارو گاڑیاں خریدیں۔ حکم نامے میں تمام ڈویژنوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر ایک ایک گاڑی ضرور خرید لیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ کے سپوت سردار آصف نکئی اپنے دوستوں کے ہمراہ بہاولپور میں شکار کے لیے گئے تھے کہ ان کے قافلے میں گاڑیاں کم پڑ گئیں۔ سردار آصف نکئی نے فوری طور پر مقامی انتظامیہ سے رابطہ کیا تو جواب ملا کہ انتظامیہ کے پاس ایسی کوئی گاڑی نہیں جو "پسر اعلیٰ" کو پیش کی جاسکے کیونکہ تمام گاڑیاں دو سال پرانے ماڈل کی ہیں۔

سردار آصف نکئی نے فوراً اپنے والد سے رابطہ کر کے اس "بدانتظامی" کی شکایت کر دی۔ بیٹے کی شکایت سن کر سردار عارف نکئی نے اپنے سیکرٹری جلیل عباس کو طلب کیا اور یہ حکم جاری کر دیا کہ فوری طور پر تمام ڈویژنیں ایک ایک جدید ترین گاڑی خریدیں۔ پنجاب کی تمام ڈویژنوں نے جاری ترقیاتی کاموں سمیت دیگر ضروری منصوبے روک کر وزیر اعلیٰ کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔

وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی اس وقت برہم ہو گئے جب وہ لاہور میں صوبے کے تمام اعلیٰ پولیس افسروں اور کمشنروں کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے معمول کی کارروائی روک کر تمام کمشنروں کو مخاطب کیا اور "اڑا دینے" کی دھمکی دے کر کہا کہ تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی بھی ڈویژن نے گاڑی نہیں خریدی۔ سردار صاحب نے تمام کمشنروں کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دی اور قبل از وقت اجلاس ملتوی کر دیا۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد تمام ڈویژنوں نے ۴۰ سے ۴۲ لاکھ روپے مالیت کی جدید ترین گاڑیاں خریدیں اور فوری طور پر وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری جلیل عباس کو مطلع کر دیا کہ گاڑیاں خرید لی گئی ہیں اور وزیر اعلیٰ کے صاحبزادہ یا کوئی دوسرا

عزیز انھیں کسی بھی وقت استعمال کر سکتا ہے۔ ان گاڑیوں پر پنجاب کے آٹھوں ڈویژنوں نے ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ صرف کیا لیکن وزیر اعلیٰ کے صاحبزادے پوری طرح ان گاڑیوں سے مستفید نہ ہو سکے تھے کہ ان کے والد بہادر کی حکومت جاتی رہی۔

سردار صاحب کے مزاج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارچ ۹۶ء میں انھوں نے ایک دن اپنے سیکرٹریٹ کو حکم جاری کر دیا کہ ان کی ڈیوٹی فری مرسڈیز گاڑی جو اس وقت کراچی ڈرائی پورٹ پر کسٹم کلیرنس کے انتظار میں کھڑی تھی' ہر صورت میں شام کو ریس کورس میں منعقدہ پھولوں کی نمائش میں جا ہیے۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ یہ سن کر کانپ اٹھا کہ صرف ۶ گھنٹے میں کراچی ڈرائی پورٹ سے بغیر کسٹم کلیر کرائے گاڑی کس طرح لاہور کے پارک ریس کورس میں لائی جا سکتی ہے؟

وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری نے ایس ایڈ جی اے ڈی کے کسٹم کلیرنس سیکشن کو حکم دے دیا کہ وہ ہر صوت میں گاڑی کلیر کرا کے شام چھ بجے ریس کورس میں پہنچائیں۔ بصورت دیگر اپنی نوکریوں کا بندوبست کرلیں۔ اگر قانونی تقاضے پورے کیے جاتے اور گاڑی کراچی ڈرائی پورٹ سے کلیرنس کے بعد لاہور پہنچتی تو اس کے لیے ایک ہفتہ درکار تھا۔ کلیرنس سیکشن نے فوری طور پر کراچی ڈرائی پورٹ رابطہ کیا اور استدعا کی کہ سردار صاحب کا غصہ عروج پر ہے اس لیے گاڑی کو آج ہی لاہور لے جانے کی اجازت دی جائے اور جو کسٹم کلیرنس کراچی ڈرائی پورٹ پر لازمی ہے' وہ لاہور ڈرائی پورٹ پر کر لی جائے گی۔

کراچی ڈرائی پورٹ سے اجازت کے بعد سردار عارف نکئی کے صاحبزادے آصف نکئی نے سیکرٹریٹ کے ایک ڈپٹی سیکرٹری کو ساتھ لیا اور وفاقی حکومت سے فوری طور پر مانگے گئے ایک چھوٹے جہاز میں کراچی روانہ ہوگئے۔ واپسی پر گاڑی کو لاہور ڈرائی پورٹ پر نہ روکا گیا بلکہ ۵ بجے شام ہی گاڑی ریس کورس پارک میں منعقدہ پھولوں کی نمائش میں پہنچا دی گئی۔ شام چھ بجے سردار عارف نکئی ریس کورس پہنچے اور گاڑی کے پچھلے حصے پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے دیہاتی بھینس خریدتے ہوئے اس پر پھیرتے ہیں۔ کلیرنس سیکشن کا جو عملہ لاہور ڈرائی پورٹ پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھا تھا' اس کو اعلیٰ کسٹم حکام نے روک لیا اور گاڑی کا مطالبہ کر دیا۔ وزیر

اعلیٰ گاڑی پر اپنی "پسندیدگی" کا ہاتھ پھیر کر ریس کورس سے تشریف لے جا چکے تھے اور آصف نکئی کینٹ کی سڑکوں پر گاڑی چیک کرنے میں مصروف تھے۔ کسٹم حکام نے کلیرنس سیکشن کو ڈرائی پورٹ پر روک لیا اور سی بی آر کے چیئرمین سے بات کر کے مقدمہ درج کرانے کی دھمکی دے دی۔ رات ۲ بجے کے قریب سیکرٹری جلیل عباس نے وزیر اعلیٰ سے رابطہ کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو انھوں نے اسلام آباد میں وزیر اعظم سے بات کر کے کسٹم حکام کو ٹھنڈا کیا۔

سردار عارف نکئی پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ تھے جو بیک وقت پنجاب حکومت کی سو سے زائد قیمتی گاڑیاں استعمال کرتے رہے۔ ۷۰ کے قریب جدید ترین گاڑیاں سردار عارف نکئی کے رشتہ داروں اور دوستوں کے استعمال میں رہیں جن پر روزانہ ۵۰ سے ۶۰ ہزار روپیہ حکومت پنجاب تیل اور مرمت وغیرہ کی مد میں خرچ کرتی رہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق نکئی کے پورے دور میں ۴ کروڑ روپے سے زائد اخراجات نئی گاڑیوں کی خرید اور مرمت پر ہوئے۔

سردار صاحب نے "وزیر اعلیٰ ترقیاتی پیکج" کا ایک ارب روپیہ صرف اپنے دوست ارکان اسمبلی میں بانٹ دیا۔ ذرائع یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ سردار صاحب نے اس "ترقیاتی پیکج" سے ۲۰ کروڑ روپے کمیشن کے طور پر کمائے۔

الزام ہے کہ سردار عارف نکئی نے پنجاب کے دیگر ترقیاتی منصوبوں میں سے بھی کروڑوں روپے کمیشن وصول کی۔ صرف ضلع قصور میں چالو ترقیاتی کاموں سے ۲۰ فیصد کمیشن سردار عارف نکئی کو ملتی رہی۔ الزام ہے کہ فیصل آباد، ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرانوالہ، گجرات کے اضلاع میں بھی جاری ترقیاتی منصوبوں میں سے وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کو ۱۰ فیصد کمیشن موصول ہوتا رہا۔

سردار عارف نکئی واحد وزیر اعلیٰ تھے جو تقریباً ہر ہفتے سرکاری خرچ پر شکار کھیلنے جاتے۔ سردار صاحب کی پسندیدہ شکارگاہ بہاولپور کا علاقہ تھا جہاں ان کے عزیز رشتہ دار افضل جہ شکار کا بندوبست کرتے۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے ذرائع کے مطابق سردار عارف نکئی شکار کا ارادہ کرتے تو سیکرٹریٹ کے موٹر ٹرانسپورٹ ونگ کو ایک دن پہلے بتا دیا جاتا کہ تمام جدید ترین گاڑیاں بالکل تیار رکھی جائیں۔ سردار صاحب

عموماً ہیلی کاپٹر کے ذریعے بہاولپور روانہ ہو جاتے جبکہ ان کے ساتھ جانے والا کارواں ان سے ایک دن پہلے شکارگاہ پر موجود ہوتا۔ سیکرٹریٹ کے ذرائع کے مطابق وزیراعلیٰ کا ایک دن کا شکار حکومت پنجاب کو تقریباً ۱۰ لاکھ روپے میں پڑتا۔ وزیر اعلیٰ اس موقع پر اپنے سیکرٹری جلیل عباس کو ساتھ رکھتے اور ساتھ ساتھ "شاہی احکامات" کا سلسلہ بھی جاری رکھتے۔

بہاولپور میں خصوصی طور پر مقامی انتظامیہ ہروقت الرٹ رہتی اور ضلعی انتظامیہ کے تمام اعلیٰ افسران موقع پر موجود رہتے۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے ذرائع کے مطابق اس موقع پر لاہور سے گئے ہوئے باورچی انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتے جبکہ ایک مقامی ہوٹل کی گاڑی "شرکائے شکار" کے لیے "مشروبات" کے کریٹ لیے ساتھ ساتھ پھرتی رہتی۔ واضح رہے کہ وزیر اعلیٰ نے خصوصی طور پر اپنے میزبان افضل جج کو حکومت پنجاب کی پانچ جدید ترین گاڑیاں عنایت کر رکھی تھیں جو شکار کے دنوں میں "شکاریوں" کے زیر استعمال ہوتیں اور عام دنوں میں افضل جج کے زرعی فارم اور پولٹری فارم پر "ڈیوٹی" دیتیں۔

۱۹۹۲ء کے سیلاب کی تباہ کاریوں کا معائنہ کرنے کے لیے وفاقی حکومت نے خصوصی طور پر ایک جدید ترین ہیلی کاپٹر وزیر اعلیٰ پنجاب سردار عارف نکئی کو دے دیا تو سردار عارف نکئی سیلاب میں ڈوبے ہوئے افراد کی خبرگیری کے بجائے اس ہیلی کاپٹر کو بہاولپور لے جاتے اور شکار کھیلتے رہے۔ جبکہ وفاقی حکومت کو اس ہیلی کاپٹر کے استعمال کی جو رپورٹ بھیجی جاتی' اس میں ہیلی کاپٹر کا سارا سفر سیلاب زدہ علاقوں میں ظاہر کیا جاتا رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سردار صاحب نے اس ہیلی کاپٹر کے ناجائز استعمال پر ۴۳ لاکھ روپے خرچ کر دیے۔ سردار صاحب اکثر اوقات حکومت پنجاب کے "وی وی آئی پی" فلائٹ کا ہیلی کاپٹر بھی استعمال کرتے۔

سردار صاحب کو ہیلی کاپٹر کا "جھوٹا" اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے اپنے سیکرٹریٹ کو حکم دے دیا کہ فوری طور پر پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کے خراب ہیلی کاپٹر کو ٹھیک کرایا جائے۔ جیسے ہی ابتدائی خرابیوں کی نشاندہی کے بعد معلوم ہوا کہ تقریباً ایک کروڑ روپے کی لاگت سے وہ پرزے خریدے جائیں گے جو پاکستان میں

دستیاب نہیں۔ پرزوں کی خریداری اقساط میں ہوئی اور ابھی ۴۰ لاکھ روپے کے پرزے خریدے جا سکے تھے کہ نکئی صاحب کی حکومت ختم کر دی گئی اور یوں فالتو" وزیر اعلیٰ کی خواہش پر ۶۰ لاکھ روپے خرچ کر دیے گئے۔

سردار عارف نکئی کی خصوصیت یہ رہی کہ وہ اپنے سیاسی حواریوں کو اندھا دھند فوائد پہنچانے کا بندوبست کرتے رہے۔ اس سلسلے کی واضح مثال سیالکوٹ کا "وریو خاندان" تھا۔ سردار عارف نکئی نے چوہدری اختر وریو کی خواہش پر ان کے بیٹے خوش اختر سبحانی کو ہاؤسنگ کا وزیر بنا دیا۔ خوش اختر سبحانی نے وزیر اعلیٰ کی آشیرباد سے بہت فائدہ اٹھایا اور سیالکوٹ میں سینکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی۔

سردار نکئی نے اپنے اقتدار کی آخری رات جو عمل کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ سردار صاحب نے ۲ نومبر کی رات اپنے سیکرٹری جلیل عباس کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" کی تمام رقم ان لوگوں کے نام جاری کر دیں۔ وزیر اعلیٰ نے اپنے حکم نامے کے ساتھ درجنوں افراد کی وہ لسٹ بھی بھیج دی۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کا عملہ ساری رات اس لسٹ کے مطابق چیک جاری کرتا رہا اور بالآخر صبح ہونے تک تمام رقم جاری کر دی گئی۔ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے ذرائع کے مطابق اس وقت "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" کے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ روپے سے زائد رقم تھی۔ اس واردات کا علم اس وقت ہوا جب عدالت عالیہ سے بحال ہونے کے بعد وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو نے اپنے پہلے سرکاری عمل کے طور پر ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایک دوست کے نام ۵۰ ہزار روپے کے چیک جاری کرنے کا حکم دیا۔ جب میاں منظور وٹو کا جاری کردہ چیک وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ پہنچا تو وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ سے جواب دیا گیا کہ "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" کے اکاؤنٹ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ یہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔

اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں سردار عارف نکئی نے اپنے دوستوں کو پلاٹ الاٹ کرنا شروع کر دیئے۔ تقریباً ایک درجن سیاسی حواریوں کو اس سلسلے میں کروڑوں روپے کے پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ سردار عارف نکئی ان دنوں ان الاٹ منٹس کے حوالے سے ریفرنسوں کا سامنا کر رہے ہیں۔

سردار عارف نکئی کے اقتدار کے آخری دنوں کا ایک دلچسپ اور حیران کن واقعہ بھی ملاحظہ کریں۔ ایک شام سردار صاحب کا بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ مری کے فائیو سٹار ہوٹل پی سی بھوربن پہنچا اور ہوٹل انتظامیہ سے فوری طور پر ۵ کمرے طلب کیے۔ اتفاق سے اس وقت صرف ۲ کمرے دستیاب تھے۔ ہوٹل انتظامیہ نے "پسر اعلیٰ" سے فوری طور پر پانچ کمروں کی معذرت کر لی۔ جواب میں وزیر اعلیٰ کے سپوت نے کھچا کھچ بھرے ہوٹل کی لابی میں کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے ایک گملے میں پیشاب کر دیا۔ موقع پر موجود ایک اسسٹنٹ کمشنر نے اس بات کا نوٹس لینے کی کوشش کی تو اسے چند منٹوں میں لاہور سے ایک اعلیٰ عہدے دار کا فون آ گیا جس میں اسے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو معطل تصور کریں۔ اے سی نے فوراً معذرت کی اور اپنی جان بخشی کرائی۔

سید عبداللہ شاہ

۹۳ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلزپارٹی دوبارہ برسر اقتدار آئی تو پارٹی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو سندھ میں وزارت اعلیٰ کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھیں جو نہ صرف سندھ میں پی پی پی کی گرتی ہوئی ساکھ کو بہتر بنائے بلکہ پارٹی کے "محروم" وفاداروں کو سرکاری سطح پر فائدہ پہنچائے اور ساتھ ہی پی پی پی مخالفوں کو عبرت ناک سزا بھی دے۔ پیپلزپارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کے اس معیار پر دادو کے صوبائی حلقہ ۵۹ سے رکن اسمبلی منتخب ہونے والے سید عبداللہ شاہ اترے اور انھیں صوبہ سندھ کا وزیراعلیٰ بنا دیا گیا۔

اس سے پہلے سید عبداللہ شاہ کوئی اہم انتظامی عہدہ نہ حاصل کر سکے تھے اور نہ ہی عبداللہ شاہ سندھ کی سیاست میں کوئی اہم جگہ رکھتے تھے۔ ان کی اولین پہچان بھٹو خاندان کے ساتھ وفاداری اور بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ دوستی تھی۔ سید عبداللہ شاہ کی وزیراعلیٰ کے طور پر نامزدگی سے پہلے سندھ کے بااثر سیاستدانوں نے بے نظیر پر دباؤ ڈالا لیکن عبداللہ شاہ نے کامیابی کا "بہترین" راستہ تلاش کیا اور بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری سے منظوری حاصل کر لی۔ بعض حلقے یہ الزام لگاتے ہیں کہ عبداللہ شاہ نے سندھ کی وزارت اعلیٰ کے حصول کے لیے آصف علی زرداری سے باقاعدہ "ڈیل" کی اور صوبے کے منافع بخش اداروں میں آصف علی زرداری کا باقاعدہ کمیشن طے کیا۔

عبداللہ شاہ نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ

مل کر نہ صرف صوبے کے تمام اداروں میں کرپشن کی مثالیں قائم کیں بلکہ آصف علی زرداری کے دوستوں کو بھی پوری طرح نوازا۔ آصف علی زرداری کے کہنے پر پی پی پی کے جیالوں کو اندھا دھند کرپشن کی اجازت دی۔ بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر صوبے میں اعلیٰ ملازمتیں پی پی پی کے جیالوں اور جیالیوں میں بانٹی گئیں بلکہ خود عبداللہ شاہ نے اربوں روپے کی سرکاری زمینوں کو بے دریغ طریقے سے کوڑیوں کے بھاؤ الاٹ کیا اور ذاتی مفادات حاصل کیے۔ عبداللہ شاہ نے اپنی کرپشن کے دائرہ کار کو اتنی زیادہ وسعت دے دی کہ ان کے ساتھیوں میں مسلح افواج کی اعلیٰ شخصیات بھی شامل ہوگئیں۔ جس کی واضح مثال پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل منصور الحق تھے' جنھوں نے عبداللہ شاہ کے ساتھ مل کر سرکاری اراضی کی الاٹ منٹ سے کروڑوں روپے کمائے۔

عبداللہ شاہ نے اپنی وزارت اعلیٰ سے لے کر بے نظیر حکومت کے خاتمے تک اقربا پروری' اختیارات کے ناجائز استعمال' مالی کرپشن اور بے ضابطگیوں کے ریکارڈ قائم کیے۔ حکومت کے خاتمے کے بعد عبداللہ شاہ پر محترمہ بے نظیر بھٹو کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کا الزام بھی لگایا گیا۔ بعد ازاں عبداللہ شاہ کو پلاٹوں کی غیر قانونی الاٹ منٹوں کے الزامات کے تحت ایف آئی اے نے گرفتار کر لیا لیکن عبداللہ شاہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ احتساب سیل میں عبداللہ شاہ کی بدعنوانیوں پر ڈیڑھ درجن کے قریب ریفرنس دائر کیے گئے اس دوران عبداللہ شاہ لانچ کے ذریعے بحیرہ عرب کے راستے فرار ہو کر پہلے دوبئی گئے اور پھر وہاں سے لندن پہنچ گئے۔

عبداللہ شاہ نے جہاں اپنے سیاسی ساتھیوں کو بے شمار فوائد پہنچائے وہاں اپنے سیاسی حریفوں پر سندھ کی زمین تنگ کر دی۔ عبداللہ شاہ پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے کراچی میں مہاجروں کی نسل کشی میں اہم کردار ادا کیا۔ عبداللہ شاہ کی ایماء پر سینکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' حتیٰ کہ عبداللہ شاہ کی شخصیت کراچی کی قتل و غارت کے سلسلے میں اتنی زیادہ متنازعہ ہوگئی کہ ان کے سگے بھائی اور ایک رشتہ دار کو کراچی میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد الطاف حسین کے بھائی اور بھتیجے کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ ان دونوں ہلاکتوں کا براہ راست الزام عبداللہ شاہ پر عائد

کیا گیا۔ عبداللہ شاہ نے پولیس میں اپنی پسند کے لوگوں کو اعلیٰ پوسٹیں دیں اور ان کے ذریعے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کی۔

یوں تو عبداللہ شاہ پر بدعنوانیوں کے بے شمار الزامات سامنے آئے مگر ان پر سب سے بڑا الزام کراچی کی قیمتی زمینوں کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنے کا تھا۔ اس طرح عبداللہ شاہ نے اربوں روپے کی مالیتی زمین نہایت کم قیمت پر پیپلزپارٹی حکومت کے چہیتوں اور بعض اعلیٰ سرکاری عہدیداروں میں بانٹ دی' جس سے ملکی خزانے کو بھاری معاوضے سے محروم ہونا پڑا۔

عبداللہ شاہ نے وزارت اعلیٰ سنبھالتے ہی پلاٹوں کی الاٹ منٹ پر پابندی عاید کر دی۔ اس طرح کراچی شہر میں واقع تمام سرکاری پلاٹ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی بجائے براہ راست وزیراعلیٰ کے قبضے میں آ گئے۔ وزیراعلیٰ نے دوسرا حکم یہ دیا کہ تمام سرکاری پلاٹ مارکیٹ ریٹ کی ایک چوتھائی قیمت پر الاٹ کیے جائیں۔

عبداللہ شاہ کو کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اعلیٰ حکام نے ایک گوشوارہ پیش کیا جس کے مطابق کراچی کی قیمتی زمین سرکاری زمین کے ڈی اے (KDA) سکیم نمبر A-I تھی۔ اس زمین کی قیمت ۱۵ ہزار روپے فی مربع گز تھی جبکہ وزیراعلیٰ سید عبداللہ شاہ نے اس زمین کو ۲ ہزار روپے فی مربع گز کے حساب سے الاٹ کر دیا۔

اسی طرح گلشن اقبال کے بلاک نمبر ۲ میں واقع کھیل کے میدان میں سے ۲۰۰۰ مربع گز کا پلاٹ پی ایس ایف کے سابق مرحوم صدر نجیب احمد کے بھائی نجمی عالم کو صرف ۳۰۰۰ روپے فی مربع گز کے حساب سے الاٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ کے حکم پر سابق وفاقی وزیر قانون پروفیسر این ڈی خان کے بھائی شاکرداد خان کو گلستان جوہر کی سکیم نمبر ۳۶ میں ۴۰۰ گز کا پلاٹ دیا گیا۔ بیگم اشرف عباسی کو کلفٹن میں سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی بیٹی کے نام پر "بختاور گرلز سکول" بنانے کے لیے ۱۰ کروڑ ۵۲ لاکھ روپے کا پلاٹ صرف ۳۶ لاکھ ۳۰ ہزار روپے میں دے دیا گیا۔ عبداللہ شاہ نے اس پلاٹ کی الاٹ منٹ کا خصوصی حکم دے رکھا تھا کیونکہ بیگم اشرف عباسی نے وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو جب یہ داستان سنائی کہ وہ ان کی بیٹی بختاور کے نام پر سکول کھولنا چاہتی ہیں اور یہ سکول کراچی کا سب سے معیاری سکول

ہوگا' تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے فوری طور پر اسلام آباد سے وزیراعلیٰ ہاؤس کراچی فون کر کے عبداللہ شاہ کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر بیگم عباسی کو ان کی مطلوبہ جگہ پر بہت تھوڑی قیمت پر پلاٹ دیا جائے۔

عبداللہ شاہ جنہوں نے کراچی میں پلاٹوں کی الاٹ منٹ کی "سیل" لگا رکھی تھی' اپنے دوستوں میں بہت فیاضی کے ساتھ سرکاری خزانہ لٹاتے رہے۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں اس وقت کے وزیر ہاؤسنگ جام صادق علی نے بھی کراچی کی تقریباً آدھی زمین بیچ کھائی تھی اور مجبوراً ذوالفقار علی بھٹو کو مزار قائد پر جام صادق علی کو طنزاً یہ کہنا پڑا تھا "جام صاحب کسی کو مزار قائد نہ الاٹ کر دینا ورنہ قوم میرے پیچھے پڑ جائے گی"۔ حیران کن بات یہ ہے کہ کراچی شہر میں زمینوں کی لوٹ سیل دوبارہ پیپلزپارٹی کے دور حکومت میں ہی لگائی گئی اور بھٹو نے جام صادق علی کو اس کی کرپشن سے روکنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی صاحبزادی نے ان کے برعکس وزیراعلیٰ کو خود حکم دے کر زمینوں کی فروخت میں اپنا کردار ادا کیا۔

عبداللہ شاہ نے اپنے قریبی دوست محمد فہیم کو گلستان جوہر میں ۴۰۰ گز کا قیمتی پلاٹ کوڑیوں کے مول الاٹ کر دیا۔ اس الاٹ منٹ کے بعد عبداللہ شاہ کے ایک اور دوست محمد بلال نے بھی عبداللہ شاہ سے سفارش کی کہ انہیں بھی محمد فہیم جتنا پلاٹ عنایت کیا جائے۔ عبداللہ شاہ نے اپنی روایتی "فیاضی" کا مظاہرہ کیا اور محمد بلال کو بھی گلستان جوہر میں ۴۰۰ گز کا پلاٹ نہایت معمولی داموں الاٹ کر دیا۔ اسی طرح عبداللہ شاہ نے ۱۰۰۰ گز کا ایک نہایت قیمتی پلاٹ ایم کیو ایم کے منحرف ایم پی اے شمیم احمد کو بھی الاٹ کر دیا۔

عبداللہ شاہ نے پی پی پی کے جیالوں' اپنے دوستوں' رشتہ داروں اور کے ڈی اے کے اعلیٰ عہدیداروں کو بھی قواعد و ضابط کو نظرانداز کرتے ہوئے قیمتی پلاٹ الاٹ کیے۔ ان پلاٹ حاصل کرنے والوں میں کے ڈی اے کے ڈائریکٹر پلاننگ غلام حیدر میمن' سیکرٹری کے ڈی اے آفتاب احمد اور خالد حسین میمن سمیت کئی دوسرے اعلیٰ افسران کو گلستان جوہر میں ۴۰۰ گز کے پلاٹ انتہائی سستے داموں الاٹ کر دیئے گئے۔

کے ڈی اے نے کورنگی انڈسٹریل ایریا میں بے روزگار نوجوانوں کے لیے پلاٹ مختص کر رکھے تھے مگر ان پلاٹوں کو بھی وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ کے حکم پر پیپلز پارٹی کے جیالوں میں بانٹ دیا گیا۔ یہ پلاٹ ان جیالوں کو الاٹ کیے گئے جو پیپلز پارٹی صوبہ سندھ کے عہدیدار تھے۔ پلاٹ حاصل کرنے والوں میں خالد علی' عبدالرحمٰن' عبدالخالق' عادل لودھی ایڈووکیٹ' غلام قادر' بیگم غلام قادر' خلیل قریشی' عبدالقادر پٹنی' فرید انصاری اور سہیل انصاری وغیرہ شامل تھے۔

اس کے علاوہ وزیراعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ کے حکم پر کے ڈی اے کی سکیم نمبر ۳۳ میں سے الطاف احمد' ناصر اقبال' لیاقت اللہ' طارق مشتاق' محسن مشتاق' نعیم احمد' ایس ایم تقی کلیار وغیرہ کو ۱۰۰ گز فی کس کے حساب سے پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ رکن صوبائی اسمبلی بہادر خان ڈاہری کو وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ کے حکم پر ۱۰۰۰ گز کا پلاٹ نہایت سستے داموں الاٹ کیا گیا۔ اسی طرح وزیراعلیٰ کی منشاء پر سابق وزیر ہاؤسنگ کے سالے افتخار احمد بھی ۴۰۰ گز کا ایک پلاٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی دوست فائزہ قریشی کو وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ نے ۱۰۰۰ گز کا پلاٹ انڈسٹریل ایریا میں سے کورنگی ٹاؤن شپ کے علاقے میں تحفتاً" دے دیا۔ اسی طرح عبداللہ شاہ نے چوہدری خلیق الزمان کی بہو اور بیٹی کو ۱۰۰۰ گز کے دو پلاٹ کورنگی انڈسٹریل ایریا کے سیکٹر 30-A میں انتہائی سستے داموں الاٹ کر دیئے۔

ڈپٹی کمشنر میرپور خاص اے کے عباسی اور اس کی بیوی کو بھی عبداللہ شاہ نے ۶۰۰ گز کے دو پلاٹ کوڑیوں کے مول الاٹ کر دیئے۔ عبداللہ شاہ نے ایک خصوصی حکم کے ذریعے جے سندھ کے مرکزی رہنما گل محمد جکھرانی کو گلستان جوہر میں ۴۰۰ گز کا پلاٹ الاٹ کیا۔

اسی طرح عبداللہ شاہ کی خصوصی ہدایت پر کورنگی کے قیمتی ترین سیکٹر 30-A میں ۱۲۰۰۰ گز کا پلاٹ ظہور احمد اور ان کی بیگم اور ان کی بہن نصرت وحید' انور وحید' امان اللہ' ظفر اللہ' شمیم بیگم' غزالہ متین' ظفر احمد اور امیر نامی افراد کو نہایت کم قیمت پر الاٹ کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ عبداللہ شاہ کے حکم پر کلفٹن میں ۶۰۰ گز کا پلاٹ قاضی عبدالمجید اور میر محمد حسین کو بھی ۶۰۰ گز کا پلاٹ کلفٹن میں الاٹ کیا گیا۔ طارق قاضی نامی ایک شخص کو ۱۰۲۹ گز کا پلاٹ قیمتی ترین علاقے میں الاٹ کیا گیا۔ ۵۸۴۸۸ گز کا پلاٹ غنی بلڈرز کو کلفٹن میں دیا گیا۔ اسی طرح غنی بلڈرز کو ۵۲۲۲ گز کا ایک اور پلاٹ کراچی کے قیمتی ترین علاقے میں کوڑیوں کے بھاؤ الاٹ کر دیا گیا۔ ایک اور قیمتی پلاٹ ہاکس بے کے علاقے میں ایم مصطفیٰ کو الاٹ کیا گیا۔ گلستان جوہر میں شیریں غوری نامی عورت کو ۶۰۰ گز کا پلاٹ انتہائی کم قیمت پر الاٹ کیا گیا۔ محمد علی نامی شخص کو ۴۰۰ گز کا پلاٹ دیا گیا۔ جبکہ ۱۲۰۰ گز کے دو پلاٹ محمد کامل اور محمد افضل آغا کو سستے داموں الاٹ کیے گئے۔ غنی بلڈرز کو نارتھ کراچی میں بھی ۵۰۰۰ مربع گز کا ایک بڑا پلاٹ دیا گیا جبکہ علی بخش نامی ایک شخص کو ۱۰۸۲ گز کا پلاٹ بخش دیا گیا۔ یہ تو وہ کرپشن تھی جو وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ نے کے ڈی اے کے پلاٹ غیر قانونی طور پر الاٹ کرکے کی اور ان الاٹمنٹوں کے طفیل کروڑوں روپے کمائے۔

۱۹۹۶ء کے آغاز میں سید عبداللہ شاہ حکومت نے کراچی میں تعینات مختلف سرکاری محکموں کے گریڈ ۱۷ کے اوپر کے افسران' سندھ سیکرٹریٹ کے سٹاف' ڈی ایم جی گروپ' پی ایس سی' اے پی یو جی اور دیگر سروسز سے تعلق رکھنے والے افسران کو ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں پلاٹ دینے کے لیے ایک سرکلر جاری کیا" جس میں پلاٹوں کے حصول کے لیے درخواست دہندگان کے لیے جو شرائط رکھی گئیں وہ درج ذیل ہیں۔ (۱) سندھ کا ڈومیسائل یافتہ ہو۔ (۲) کم از کم عرصہ ملازمت ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء تک ۱۰ سال ہو۔ (۳) درخواست دہندہ اور اس کے زیر کفالت کسی فرد کے نام پاکستان میں کہیں پلاٹ نہ ہو۔ (۴) درخواست دہندہ ایک حلف نامہ پر کرے جس میں اوپر دی گئی ہدایات پوری کرنے کا حلف ہو۔

مگر یہ محض ایک رسمی کارروائی تھی جبکہ اس سرکلر کے بعد نہ صرف غیر سندھی افراد کو نوازا گیا بلکہ غیر مستحق افراد کے ایک پورے انبوہ کو تقریباً ۵۰ کروڑ روپے مالیت کے پلاٹ صرف ۱۰ کروڑ روپے میں الاٹ کر دیئے گئے۔ اس سکیم کے تحت پلاٹ حاصل کرنے والے افسران کا تعلق پولیس' ضلعی انتظامیہ' تعلیم' سندھ

سیکرٹریٹ، وفاقی سیکرٹریٹ، پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد، پنجاب پولیس، ایف آئی اے، محکمہ صحت، لیاری ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور بورڈ آف ریونیو سے تھا۔ اس کے علاوہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے عبداللہ شاہ کے ذریعے اپنے قریبی دوستوں کو بھی پلاٹ الاٹ کرائے۔ بے نظیر کے جن قریبی اعلیٰ عہدیداروں نے اس سکیم میں سے پلاٹ حاصل کیے ان میں وفاقی سیکرٹری کامرس سلمان فاروقی، ایڈیشنل سیکرٹری وزیراعظم سیکرٹریٹ سراج سلیم شمس الدین، وزیراعلیٰ کے پرلیس سیکرٹری قاضی جان محمد، سیکرٹری رسول بخش بلوچ، قائم علی شاہ کی صاحبزادی، ڈپٹی سیکرٹری ہوم مسز ناہید شاہ وغیرہ شامل تھے۔

عبداللہ شاہ کی دیدہ دلیری اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے مالی بدعنوانیوں کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے فوجی اداروں کو بھی نہ معاف کیا۔ اس سلسلہ کی واضح ترین مثال کیپ مونز سکینڈل تھا۔ کیپ مونز سکینڈل عبداللہ شاہ اور پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل منصور الحق کے ذہن کی اختراع تھی۔ دونوں افراد نے ملی بھگت سے ایک حساس اور مہنگی ترین زمین آصف علی زرداری کے دوست طفیل شیخ اور ان کی اہلیہ منزہ شیخ کو فائیو سٹار ہوٹل بنانے کے لیے الاٹ کر دی۔ اس طرح یہ زمین جس کی مارکیٹ قیمت تقریباً ۳۰ کروڑ روپے تھی، صرف ۳۰ لاکھ میں فروخت کر دی گئی۔

وزیراعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ نے کئی دیگر غیر قانونی و غیر آئینی اقدامات کیے اور اپنے قریبی دوستوں کے بچوں اور عزیز و اقارب کو مختلف محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا۔ عبداللہ شاہ نے اپنی بیٹی، سابق وزیر قانون و انصاف پروفیسر این ڈی خان کے بیٹے اور وفاقی شرعی عدالت کے جج شفیع محمدی کے بیٹے کو بھی اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرا دیا۔

عبداللہ شاہ نے اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے ان کے خلاف سنگین نوعیت کے اقدامات کیے اور انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ عبداللہ شاہ نے پارٹی فنڈ کے لیے کراچی کے مضبوط مالیاتی اداروں سے زبردستی چندہ وصول کیا۔ عبداللہ شاہ نے کراچی کے بلڈرز میں سے معروف نام فیروز گھنو (ڈولمین گروپ والے) کے ذریعے پارٹی فنڈ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا اور پہلے مرحلے میں ۲۰ لاکھ روپیہ جرمانہ

کرلیا۔ اگلے مرحلے میں عبداللہ شاہ نے کراچی کے ۱۴۳ بلڈروں کے خلاف آپریشن شروع کردیا۔ اس آپریشن کے دوران مظلوم بلڈروں کو اس طرح ذلیل و خوار کیا گیا کہ چند دنوں میں ان کی جیبوں سے اڑھائی کروڑ روپے کی رقم نکلوالی گئی۔

عبداللہ شاہ کو پی پی پی کی حکومت کے خاتمے کے بعد کے پی ٹی کی زمین کوڑیوں کے مول فروخت کرنے کے الزام میں ایف آئی اے نے گرفتار کیا مگر عدالت نے عبداللہ شاہ کی ضمانت لے لی۔ عبداللہ شاہ سندھ کے واحد سیاستدان تھے جن کے خلاف احتساب سیل نے سب سے زیادہ ریفرنس وصول کیے۔ ابتدائی تحقیقات کے بعد انکشاف کیا گیا کہ عبداللہ شاہ نے صرف زمینوں کی غیر قانونی الاٹ منٹ سے قومی خزانے کو ۱۲ ارب روپے کا نقصان پہنچایا۔

عثمان فاروقی

پاکستان' جہاں ہر شعبہ میں کرپشن کا کھیل "پسندیدہ" قرار دیا گیا ہے' ہر شعبہ چاہے اس کا تعلق کتنی ہی مضبوط آرگنائزیشن سے ہو' یا اس کا رول کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو گزشتہ تین دہائیوں سے اتنی بری طرح کرپشن کی زد میں آیا ہے کہ اب اس کے وجود کو بھی خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ یہ چاہے ملک کی سرحدوں کا تحفظ کرنے والا کوئی ادارہ ہو یا ملکی معیشت کا اہم ترین جزو ہو یا اس کا تعلق ملک کی نظریاتی اساس سے ہو' اس وقت تاریخ کے نازک ترین بحران سے گزر رہا ہے۔

ملک کے اداروں میں جتنی بھی کرپشن کی گئی ہے اس کا اگر معروضی طریقے سے کھوج لگایا جائے تو اس کرپشن کا سب سے بڑا اور طاقتور محرک ہمارا سیاستدان ہے جو اداروں کی یا تو سربراہی کے نام پر اپنی ذاتی لوٹ مار کا بازار گرم کرتا ہے یا پھر برسراقتدار حکومت سے اپنی قربت کے بل بوتے پر اداروں میں کرپشن کو اپنا "حکومتی حق" سمجھتا کرتا ہے۔ ظاہر ہے جب ایک خاص مدت کے لیے حکومت میں آنے والا بااثر طاقتور کسی ادارے میں کرپشن کے منصوبے بناتا ہے تو اس کی پہلی ترجیح اس ادارے کے اعلیٰ افسران ہوتے ہیں' جن کی وساطت سے اس نے کرپشن کرنا ہوتی ہے۔

شاید آدھ دہائی پہلے برسراقتدار آنے والا سیاستدان اپنی "حکومتی کرپشن" کا بازار گرم کرنے کے لیے اتنے زیادہ "سخت اصول" نہیں اپناتا تھا جتنے گزشتہ پانچ

برسوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ پہلے ادارہ جاتی کرپشن کے لیے سیاستدان صاحبان "مظلوم ادارے" کی انتظامیہ کو ہی دباؤ میں رکھ کر ذاتی فوائد کشید کرتے تھے اور بظاہر ایسا کوئی واضح ثبوت نہیں چھوڑتے تھے' جس سے یہ مترشح ہوتا کہ مذکورہ ادارہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن گزشتہ پانچ برسوں سے اس کرپشن کے لیے جو "زریں اصول" اپنائے گئے ہیں' ان کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ سب سے پہلے ادارے کی اعلیٰ انتظامیہ کو اکھاڑو اور اس کی جگہ اپنے "خاص آدمی" تعینات کرو اور خصوصاً اس موقع پر اس بات کا پورا پورا خیال رکھو کہ کہیں اس طرح کی فوری تعیناتی کے دوران میرٹ کا خیال نہ آنے پائے کیونکہ اگر آپ نے میرٹ کو مدنظر رکھا تو شاید آپ کی لائی ہوئی انتظامیہ آپ کی بھیانک کرپشن سے ڈرنا شروع ہو جائے اور کرپشن کی روانی کے دوران آپ کا "بھرپور" ساتھ نہ دے سکے اور یوں خدشات بڑھ سکتے ہیں۔

اس داستان میں' میں ایک ایسی سیاسی شخصیت کے حوالے سے ابھرنے والی کرپشن کے تناظر میں اس "نہ کار" کا ذکر کر رہا ہوں جس کو ایک بڑی بھاری سیاسی شخصیت اپنی ذاتی کرپشن کے لیے ملکی صنعت کے ایک حساس ترین یونٹ میں تعیناتی کے لیے لے کر آئی۔ مذکورہ بالا "بھاری سیاسی شخصیت" نے تو اپنا "کاروبار" جاری رکھا لیکن اس دوران جس شخصیت کو میرٹ کی دھجیاں اڑا کر تعینات کیا گیا اس نے بھی پر پرزے نکالے اور مذکورہ سیاسی شخصیت کے بالکل متوازی اس طرح کی کرپشن شروع کی کہ یہ شخصیت "مثال" بن گئی۔

اس "شاندار مثال" کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس شخصیت کا ذکر "متنازعہ شخصیات" کے اس سلسلے میں شامل کروں۔ قارئین' یہ شخصیت پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین عثمان فاروقی کی تھی اور میٹرک پاس اس شخصیت کو پاکستان اسٹیل ملز میں بطور چیئرمین سابقہ وزیراعظم کے شوہر آصف علی زرداری لے کر آئے اور اس کی وساطت سے کرپشن کی ایک بھیانک مثال قائم کی۔ اگرچہ بعد میں میاں نواز شریف حکومت' جو سابقہ حکومت کے خلاف احتساب کے نام پر تحریک چلائے ہوئے تھی' زرداری کے بارے میں حقیقی دستاویزی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہی

اور احتساب سیل نے عثمان فاروقی کی منت سماجت کی کہ اس کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور وہ اس کے بدلے میں محترم آصف علی زرداری کی پاکستان اسٹیل ملز میں کی جانے والی کرپشن کے تمام ثبوت حکومت کو فراہم کر دے۔ ثبوت تو عثمان فاروقی شاید مہیا نہیں کر سکے لیکن ٹی وی پر آ کر انھوں نے اس ساری کرپشن کا بوجھ آصف علی زرداری کے سر لادھ دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس نے تمام کرپشن آصف علی زرداری کے دباؤ پر کی اور اس میں خود اس کا کوئی قصور نہیں بلکہ وہ زرداری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ نہ تو احتساب سیل یہ سوال عثمان فاروقی سے کر سکا کہ اس نے اپنی بہت معمولی تعلیمی قابلیت کے باوجود اسٹیل ملز کی چیئرمین شپ کیوں قبول کی اور کیا اس کو معلوم نہیں تھا کہ آصف علی زرداری اس کی تعیناتی کن مقاصد کے لیے کر رہے ہیں۔

جب صدر فاروق لغاری نے نومبر ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کی تو بے نظیر حکومت کے خلاف جو چارج شیٹ جاری کی گئی اس میں بھی پاکستان اسٹیل ملز کی کرپشن کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا' جس کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے کیس کی سماعت کے دوران سنا اور صحیح تسلیم کیا اور جب بے نظیر حکومت توڑنے کے صدارتی فیصلے کو برحق قرار دیا تو اس میں یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ واقعی حکومت کے زیر سایہ اسٹیل ملز میں بھاری کرپشن کی گئی ہے۔

عثمان فاروقی اور ان کے بھائی سلمان فاروقی جو بے نظیر حکومت کے دوران زرداری کے "کارخاص" تھے' ان دونوں کو بے نظیر حکومت کے بدعنوان ترین افراد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ دونوں حضرات نے جس "تابعداری" کا ثبوت دیا اور جس ذہانت کے ساتھ برسراقتدار لوگوں کی کرپشن کے لیے راستے کھولے اور نئے مواقع پیدا کیے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عثمان فاروقی کی سربراہی کے دوران جس سرعت کے ساتھ پاکستان اسٹیل ملز میں پیداواری انحطاط شروع ہوا' اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان اسٹیل ملز جو پاکستان میں فولاد سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہے' تاریخ کے بدترین مالی بحران کا شکار ہوگیا۔ ماہانہ ۳۵ کروڑ روپے کا فولاد فروخت کرنے والا

ادارہ ایک دم ۹ ارب روپے کے خسارے میں چلا گیا۔ فولاد سازی کے اس کارخانے میں بدعنوانی کا سلسلہ اتنا وسیع ہوگیا کہ اس پر قابو پانا آسان نہ رہا۔ جب اس ادارے کی تباہی کے ذمہ دار لوگوں کی حکومت ختم کر کے نگران حکومت قائم کی گئی تو بھی اس ادارے کی بدعنوانیوں کو کم نہ کیا جا سکا اور فولاد سازی کی ماہانہ شرح اتنی زیادہ گر گئی کہ بہت سارا کام بند کرنا پڑا۔ نگران حکومت کے پہلے ماہ میں اس کی فولاد سازی کی ماہانہ شرح بھی بہت گر گئی۔ دسمبر ۱۹۹۶ء میں فولاد فروخت کرنے کی ماہانہ شرح ۹۴ کروڑ روپے تھی، جنوری ۱۹۹۷ء میں یہ شرح ۷۳ کروڑ رہ گئی اور فروری میں فولاد کی فروخت کی شرح صرف ۵۵ کروڑ رہ گئی اور آخری شرح پاکستان اسٹیل ملز کی تاریخ کی سب سے کم شرح فروخت تھی۔

بے نظیر حکومت کے خاتمے پر پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین عثمان فاروقی کو سات ارب روپے کی کرپشن کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ لیکن تفتیشی ادارے خاطرخواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بالآخر عثمان فاروقی کو بیماری کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا اور موصوف ایک طویل عرصے تک ہسپتال کے آرام دہ بستروں پر استراحت فرماتے رہے۔ جب عثمان فاروقی سے تفتیش کار کچھ بھی نہ اگلوا سکے تو پھر اس کو دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے اپنی کرپشن کے ثبوت فراہم نہ کیے تو پھر وہ اور اس کا خاندان بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ عثمان فاروقی پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر میں نواز شریف حکومت کے احتساب سیل نے فیصلہ کیا کہ عثمان فاروقی سے آصف علی زرداری کے خلاف محض بیان دلوا لیا جائے اور اس کی اپنی کرپشن کی تفتیش کا سلسلہ "روایتی انداز" میں چلتا رہے۔ اسی طرح ہوا اور حکومتی ادارے عثمان فاروقی کو اس بات پر "راضی" کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ احتساب سیل کی مرضی کے مطابق ٹی وی پر آ کر آصف علی زرداری کے خلاف بیان دے دے اور پھر اپنے خلاف چلنے والی "کارروائی" سے محفوظ ہو تا رہے۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں بے نظیر حکومت نے بدعنوانیوں کے الزامات پر غور شروع کیا۔ وزیراعظم سیکرٹریٹ کی طرف سے وزارت پیداوار کو ایک رپورٹ ارسال کی گئی جس میں ملک کے اس سب سے بڑے صنعتی ادارے میں جاری بدعنوانیوں کا تذکرہ

ہوا تھا۔ اس وقت اسٹیل ملز قائم مقام چیئرمین سجاد حسین کے زیر اثر تھی۔ سجاد حسین جنرل صبیح الزمان کی ریٹائرمنٹ کے بعد قائم مقام چیئرمین کے طور پر معاملات چلاتے رہے تھے۔ سجاد حسین کو ڈائریکٹر فنانس کے عہدے سے ترقی دے کر آصف علی زرداری کی مرضی سے قائم مقام چیئرمین بنایا گیا تھا۔ جب حکومت کی طرف سے بدعنوانیوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا تو سجاد حسین نے آصف علی زرداری سے رابطہ کیا اور زرداری کو "خوش" کر کے اس بات پر راضی کر لیا کہ ان کو مکمل چیئرمین بنا دیا جائے۔ چیئرمین بننے کے بعد سجاد حسین نے آصف علی زرداری کا "مکمل ساتھ" دینا شروع کیا اور زرداری کے حکم پر ان ڈیلروں کو بھی مال دینا شروع کر دیا جن کی اسٹیل ملز میں بطور ڈیلر رجسٹریشن بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان بدعنوانیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسٹیل ملز کو سال ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران مجموعی پیداوار میں ۴۴ ہزار ٹن فولاد سے ہاتھ دھونا پڑے' جس کا براہ راست اثر ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر پر پڑا اور ملکی ضروریات پورا کرنے کے لیے ۲۰ ارب روپے کا فولاد بیرون ملک سے منگوانا پڑا۔

جب بدعنوانیوں کے سیلاب کے باعث حالات بہت زیادہ خراب ہونے لگے اور کراچی سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل نے پاکستان اسٹیل ملز میں بدعنوانیوں کا تذکرہ جلی سرخیوں کے ساتھ کرنا شروع کر دیا تو ارباب اقتدار نے سجاد حسین کو پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین کے عہدے سے ہٹا کر دوبارہ ڈائریکٹر کے عہدے پر تعینات کر دیا۔ اس فیصلے کے فوری بعد ۵ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو اسلام آباد سیکرٹریٹ کے ایک طاقتور بیوروکریٹ سلمان فاروقی کے بھائی عثمان فاروقی کو پاکستان اسٹیل ملز کا قائم مقام چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔ عثمان فاروقی کا استقبال اسٹیل ملز کی آڈٹ رپورٹ نے کیا' جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ ۹۴ء میں مجموعی طور پر پاکستان اسٹیل ملز میں ایک ارب روپے کرپشن کی نذر ہوئے۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق یہ کرپشن جعلی کمپنیوں کو سپلائی کیے جانے والے مال کے نتیجہ میں واقع ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ یہ مال ڈائریکٹر مارکیٹنگ محمد حبیب کی وساطت سے جعلی کمپنیوں کو دیا گیا تھا' جن کو عثمان فاروقی نے آتے ہی دوبارہ مارکیٹنگ مینیجر تعینات کر دیا۔ گزشتہ دور میں ہونے والی بدعنوانیوں میں شامل سجاد حسین کی "شفاف سیلز پالیسی" بھی تھی جس کو

دس (۱۰) میں سے صرف تین (۳) ڈائریکٹروں نے منظور کیا تھا لیکن اس کو غیر قانونی طور پر لاگو کر دیا گیا۔ اس سیلز پالیسی کے عقب میں اسٹیل ملز کا وہی مافیا تھا' جس نے سال ۹۶ء میں اس کو ایک ارب کا خسارہ پہنچایا تھا۔ "شفاف سیلز پالیسی" کے تحت ۵ فیصد کی رعایت دے دی گئی جس سے ملز انتظامیہ نے کروڑوں روپے کما لیے۔

عثمان فاروقی اسٹیل ملز کے تمام معاملات پر پوری طرح قابض ہو گئے اور اپنے پسندیدہ افراد کو نوازنے لگے۔ عثمان فاروقی کے ساتھ وزیراعظم بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری بھی شامل تھے اس لیے اسٹیل ملز کے معاملات دن بدن بگڑتے چلے گئے اور اس کی پیداوار بری طرح گرنے لگی۔ عثمان فاروقی کی تقرری کے پہلے آٹھ ماہ میں ۱۷۵۰ ڈیلروں کی چھٹی کرا دی گئی اور ان کو فوری طور پر مال کی سپلائی بند کر دی گئی۔ فارغ ہونے والے ڈیلروں کو اس بات کی سزا دی گئی کہ وہ میاں نواز شریف حکومت میں رجسٹرڈ کیے گئے تھے اور ان کی اکثریت نئے چیئرمین اور آصف علی زرداری کی مداخلت سے نالاں تھی اور نئے اور عجیب فیصلوں پر تنقید کرتی تھی۔

پاکستان اسٹیل ملز کی مصنوعات کی فروخت کے لیے ۹۶ء کے مالی سال کے دوران پندرہ (۱۵) ارب روپے کی فروخت کا ہدف مقرر کیا گیا لیکن یہ ہدف پورا کرنا تو کجا' اس کا نصف بھی پورا نہ کیا جا سکا اور اسٹیل ملز کو بدعنوان عناصر نے آن گھیرا۔ ماہانہ فولاد کی فروخت کی شرح ایک ارب ۲۵ کروڑ سے گرنا شروع ہوئی اور اس کی سب سے کم شرح ۵۵ کروڑ رہی۔ اس ہدف کو پورا کرنا اس وقت مزید مشکل ہو گیا' جب مرکز میں وزیراعظم کے شوہر کو سرمایہ کاری کا وفاقی وزیر مقرر کر دیا گیا اور موصوف نے اسٹیل ملز میں ڈیرے ڈال دیئے اور پاکستان اسٹیل ملز میں بدعنوانی کی ایسی تاریخ رقم کی گئی' جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صرف فولاد کی فروخت میں کمی کے باعث پاکستان اسٹیل ملز کو (۳۰) کروڑ روپے کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

عثمان فاروقی نے "شفاف سیلز پالیسی" کے تحت پاکستان اسٹیل ملز کے ان آرڈروں کو بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کر دیا جو سینکڑوں ڈیلروں کی طرف سے موصول ہوتے تھے اور ان کی جگہ ایک نئی پالیسی "سپاٹ سیلز پالیسی" کے تحت بعض اس مال کی خریداری کے لیے جو نرخ دیئے گئے

اس بدعنوانی سے مجموعی طور پر ۲۰ کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ ذرائع کے مطابق یہ سارے چلڈ رولز خواجہ قادر نامی ایک لوہے کے تاجر نے خریدے اور ان کے مختلف سودوں میں خواجہ قادر نے بار بار اپنا نام تبدیل کیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہی خواجہ قادر پاکستان سٹیل ملز کو نئے چلڈ رولز جو بازار میں ۱۳۰ سے ۱۵۰ روپے فی کلو تھے' اور مبینہ طور پر سٹیل ملز سے ۲ روپے فی کلو خرید لیے گئے' دوبارہ نئے ظاہر کر کے سٹیل ملز کو ۱۶۰ روپے فی کلو کے حساب سے بیچ دیے گئے اور اس مد میں ہونے والے نقصان کا گراف ۴۰ کروڑ روپے تک پہنچ گیا۔ یہ تمام بدعنوانیاں عثمان فاروقی کے حکم سے کی گئیں اور وہ ان سے بھاری کمیشن حاصل کرتے رہے۔

پاکستان سٹیل ملز کی مصنوعات میں امونیا سلفیٹ بھی شامل ہے۔ مارچ ۹۶ء میں پاکستان سٹیل ملز نے ۵۰۰ ٹن امونیا سلفیٹ کی لاٹیں ۸۰۳ روپے فی ٹن کے حساب سے فروخت کر دیں۔ جن کی بازار میں قیمت ۲۵۰۰ روپے فی ٹن ہے۔ اس طرح سٹیل مل کو مجموعی طور پر ۵۰ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

پاکستان سٹیل ملز نے مارچ ۹۶ء میں بھی ہاٹ رول اور جی پی کوائل فروخت کرنے کے لیے نیلامی کا اعلان کیا۔ سٹیل ملز کی ان مصنوعات کے لیے مقررہ نرخ ۳۰۰۰ سے ۲۲۰۰۰ روپے فی ٹن اور ۳۵۰۰۰ روپے سے ۲۸۰۰۰ روپے فی ٹن تھے لیکن نیلامی میں ہاٹ رول کی زیادہ سے زیادہ بولی ۱۷۰۰۰ روپے فی ٹن سامنے آ سکی۔ اس دوران سٹیل ڈیلرز بھی نیلامی کے مقام پر پہنچ گئے اور انہوں نے ہاٹ رول کی اتنی کم قیمت نیلامی پر احتجاج کیا۔ جس کے نتیجے میں نیلامی روک دی گئی اور سٹیل ملز ۵ کروڑ کے ایک گھاٹے سے بچ گئی۔ لاہور کے تقریباً ۵۰ ڈیلر ہر ماہ سٹیل ملز سے ۴۰ کروڑ روپے کا سٹیل خریدتے تھے۔ ان کو بلاوجہ فارغ کر دیا گیا اور عثمان فاروقی نے ۸۵ نئے ڈیلر مقرر کیے جن سے ۲ لاکھ روپے فی کس کے حساب سے رشوت وصول کی گئی۔ پاکستان سٹیل نے ۹۶ء کے مالی سال کے دوران پیداواری ہدف ۹ لاکھ ۲۶ ہزار ٹن یعنی کل پیداواری گنجائش کا ۸۵ فیصد مقرر کیا تھا لیکن پورے سال کے دوران سوا سات لاکھ ٹن پیداوار حاصل ہو سکی۔

اگر گزشتہ ۶ برسوں کے دوران ہونے والی پیداوار کی تفصیل میں جایا جائے تو خاطر بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں ملتے۔ پاکستان سٹیل کی پیداواری گنجائش ۱۱ لاکھ ٹن سالانہ تھی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۰ء کو اس میں چار لاکھ ٹن پیداوار اضافے کے لیے ڈیڑھ ارب روپے کی لاگت سے پلانٹ میں توسیع کی منظوری دی گئی۔ اس سلسلہ میں وزارت پیداوار نے ایک برطانوی کمپنی (ATKIN) سے رپورٹ تیار کرائی۔ یہ رپورٹ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کو چیئرمین جنرل صبیح الزمان کے چارج سنبھال لینے کے بعد سرد خانے کی نذر ہو گئی۔ تاہم انہوں نے اپنے دور میں چار لاکھ ٹن کی بجائے ۲ لاکھ ٹن پیداوار کے اضافے کے لیے ایک نئے پروگرام پر عملدرآمد شروع کرا دیا اور اس مقصد کے لیے وزارت پیداوار سے منظوری حاصل نہ کی گئی۔ اس منصوبے پر جنوری ۹۲ء سے جنوری ۹۶ء تک کل ایک ارب ۷۰ کروڑ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ عثمان فاروقی نے بھی اس منصوبے کو روکے رکھا اور ابھی تک اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

مالی سال ۹۶-۱۹۹۳ء میں پاکستان سٹیل نے پہلی بار اپنا پیداواری ہدف ۹۵ فیصد یعنی ۱۰ لاکھ ٹن مقرر کیا اور یہ ہدف حاصل بھی کر لیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان سٹیل نے اس سال ۸۷ کروڑ روپے کا منافع حاصل کیا۔

یہی وہ سال تھا جس میں جنرل صبیح الزمان فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد پاکستان سٹیل ملز کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کے بعد سجاد حسین اور سابق چیئرمین عثمان فاروقی کے ادوار میں پاکستان سٹیل کی تاریخ کے تاریک ترین ادوار گزرے اور وہ سٹیل ملز جو کہ ایک برس میں ایک ارب روپے کا منافع دیتی تھی' بتدریج خسارے کا شکار ہو گئی اور اس کے بہت بڑے حصے میں فنی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

بے نظیر دور حکومت کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی پاکستان سٹیل ملز کے چیئرمین عثمان فاروقی کو بھی فارغ کر دیا گیا لیکن عثمان فاروقی اپنی "کارکردگی" سے پاکستان سٹیل ملز کی پیداواری صلاحیت سے جس طرح ارب پتی بنے اور پھر انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ مل کر اس قومی اہمیت کے ادارے میں بدعنوانیوں کا جو سلسلہ شروع کیا اور جس طرح تمام شعبوں میں بدعنوانیاں شامل کر

دیں "ماضی میں اس نوعیت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عمران خان

عمران خان واحد پاکستانی سیاست دان ہیں جو اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے متنازعہ شخصیت کا روپ دھار گئے اور کرکٹ ورلڈ کپ سے شروع ہونے والی زبردست عوامی پذیرائی کو اپنے کینسر ہسپتال کی چندہ مہم میں خوبصورتی سے استعمال کرنے کے بعد پاکستان میں اقتدار کے خواہش مندوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ عمران خان کی یہ خواہش اس وقت دم توڑ گئی جب ان کی قائم کردہ سیاسی جماعت "تحریک انصاف" کو فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں عبرت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ عمران خان جن کی شہرت کا بنیادی عنصر کرکٹ کا کھیل تھا' کینسر کے باعث اپنی والدہ کی وفات کے سانحے کے نتیجے میں خدمت خلق کے میدان میں آ گئے۔ والدہ کی وفات کے پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کے اس فیصلے کو یقیناً ایک جذباتی فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جذباتی فیصلے پر عمل درآمد کو ممکن بنانے کے حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے انہیں "نظام سے ناراض" جذباتی نوجوانوں کی ایک ٹیم بھی میسر آ گئی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کی قائم کردہ تنظیم "پاسبان" عمران خان کی چندہ مہم میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ عمران خان کو چندہ جمع کرنے کے لیے رضاکاروں کی ضرورت تھی اور پاسبان کو مایوسی کے حصار سے نکلنے کے لیے ایک نئے قائد اور نئی مہم کی تلاش تھی۔

"ظالمو قاضی آ رہا ہے" کا نعرہ ایجاد کرنے والے جذباتی نوجوانوں نے چندہ مہم کے دوران نہ صرف "وزیراعظم عمران خان" کے نعرے لگائے بلکہ پوسٹر بھی چھپوا

دیئے۔ پاسبان کی قیادت قاضی حسین احمد کی طرح عمران خان کو بھی میڈیا کے دوش پر سوار کر کے شہرت اور قیادت کی بلندیوں پر اڑانے کے لیے بے تاب تھی۔ چند مہم کی کامیابی کے بعد عمران خان "پاسبان" کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ عمران خان کے "مشیروں" کا خیال تھا کہ پاسبان کا پس منظر چونکہ خالصتاً مذہبی ہے اور عمران خان پر اگر اس حوالے سے کوئی چھاپ لگ گئی تو پھر شاید وہ انتخابات میں اسی طرح کی "کامیابیاں" حاصل کریں گے جیسی جماعت اسلامی کرتی آئی ہے۔

پاسبان کی صحبت نے عمران خان کو بھی قاضی حسین احمد کی طرح ملک کے سیاسی نظام اور سیاسی قیادت کے خلاف بولنے کا حوصلہ دیا اور ان کے دل میں بھی "نظام کی اصلاح" کرنے کی خواہش دن بدن زور پکڑتی گئی۔ ساتھ ہی عمران خان نے مغرب کے خلاف اپنا محاذ کھول لیا اور اخبارات میں کالم نویسی شروع کر دی۔ اگرچہ عمران خان پر الزام لگایا جاتا رہا کہ پاکستانی اخبارات میں شائع ہونے والے اس کے کالم لاہور کے ایک اخبار نویس لکھتے تھے۔

عمران خان کی کایا کلپ اس وقت اور زیادہ واضح ہوتی چلی گئی جب انھوں نے مغربی معاشرت اور ملک میں مغربی سیاسی نظام اور پاکستان کے امیر طبقہ کی مغربی طرز زندگی پر بڑھ چڑھ کر حملے شروع کر دیئے۔ عمران خان بذات خود ایک بہت ماڈرن اور پرتعیش زندگی کے دلدادہ کرکٹر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کی یورپی ممالک کی ماڈل گرلز اور امیر طبقہ کی عورتوں سے معاشقے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ولایت کے اکثر اخبارات عمران خان کی ان گرل فرینڈز کے ساتھ تصاویر شائع کرتے رہے ہیں لیکن یکایک عمران خان نے مشرقی اقدار اور مذہبی اخلاقیات کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔

اس دوران عمران خان پاکستانی قوم کے ایک مہم جو جرنیل اور آئی ایس آئی کے متنازعہ ڈائریکٹر جنرل حمید گل کے چرنوں میں جا بیٹھے۔ حمید گل ان دنوں ملک میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ حمید گل اس سے پہلے ایک نئی تحریک اور پریشر گروپ تشکیل دینے کی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ عمران خان کا سہارا حاصل ہو جانے کے بعد حمید گل کے اخباری بیانات میں تیزی آ گئی اور وہ برسر اقتدار

لوگوں کو عمران کے حوالے سے دھمکیاں دینے لگے۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ تیزی کے ساتھ مذہبی رجحان کی طرف مائل عمران خان کو حمید گل کے سیاسی نظریات نے بہت متاثر کیا اور عمران خان حمید گل کے ساتھ "شراکت" پر آمادہ ہوگئے۔ حمید گل سمجھتے تھے کہ عمران خان کی مقبولیت اور ان کی حکمت عملی مل کر بہت شاندار کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر مغربی ممالک میں اپنا امیج برقرار رکھنے کے لیے عمران خان کھل کر حمید گل کی سیاسی تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ نہ کر سکے۔

اسی دوران عمران خان کو ایک اور "ساتھی" مل گیا۔ یہ قومی اسمبلی کے سابق سپیکر (جو بعد میں نگران وزیراعظم بھی بنے) ملک معراج خالد تھے۔ معراج خالد خاصے عرصے سے پیپلز پارٹی کی قیادت سے خفا الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ عمران خان کی کتاب "غیرت مند مسلمان" کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے ملک معراج خالد نے عمران خان کو تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ انھیں سیاست میں ضرور آنا چاہیے اور قوم کے کینسر کا علاج کرنا چاہیے۔

معراج خالد کا یہ بیان بھی بہت مضحکہ خیز تھا کہ جب سے بے نظیر حکومت نے عمران خان کے خلاف مہم چلائی ہے' میں ان کا مداح ہوگیا ہوں۔

اس عرصہ میں عمران خان کوئی ایک فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک نے انھیں "تعلیمی انقلاب" برپا کرنے کا مشورہ دے دیا۔ عمران خان غلام مرتضیٰ ملک کی اس تجویز پر راضی ہوگئے اور ایک کمرہ ایک استاد پر مشتمل سکول کی تعلیمی سکیم پیش کر دی۔ اس سکیم پر عمل کرنے کے لیے ایک بار پھر "پاسبان" نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ لیکن عمران خان کسی طرح بھی "پاسبان" کے سرپرست اعلیٰ بننے پر راضی نہ ہوئے۔ ساتھ ہی عمران خان کے اخباری کالموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان کالموں میں پاکستانی "براؤن صاحبوں" کے کوٹ پتلون پر تنقید کی گئی تھی۔ عمران کے کالموں سے اس کی "قبائلی سوچ" عیاں ہوتی تھی۔ عمران نے "جرگہ سسٹم" کی تجویز بھی پیش کر دی جس کی وہ اپنی کتاب میں حمایت کر چکے تھے۔ ادارہ سازی اور تقسیم کار کے اس جدید دور میں عمران خان بالکل ابتدائی قبائلی معاشرے کے علمبردار بن کر سامنے آئے جہاں معاملات کا فیصلہ قبائلی روایات' جرگے اور بندوق کی گولی سے کیا

جاتا ہے۔

عمران خان انہی الجھنوں کا شکار تھے اور ہوس اقتدار کے مارے سیاست دانوں' جرنیلوں اور ملاؤں کی زد میں تھے کہ برطانوی باشندے اور امیر کبیر سیاسی شخصیت سر گولڈ سمتھ کی بیٹی جمیما گولڈ سمتھ کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔ عوام کو استحصالی نظام کے شکنجے سے نجات دلانے کی باتیں کرنے والا اور مغربی تہذیب کے چند مظاہر پر تنقید کرنے والا عمران خان پوری دنیا کو اپنے سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کی گرفت میں لینے والے سرمایہ دار طبقے کے ایک گھرانے کا داماد بن گیا۔ اس دامادی کے لیے عمران خان نے اپنے معاشرے کی روایات' ثقافت اور دینی اقدار کسی بھی شے کا پاس نہ کیا۔ پہلے عوام کو بتایا گیا کہ عمران خان نے ایک بہت بڑے یہودی گھرانے کی لڑکی کو مسلمان کر کے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے لیکن پھر عمران نے خود اپنی زبان سے اس "خدمت دین" کی تردید کر دی۔ عمران خان نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اسلام ایک مسلمان کو یہودی عورت کے ساتھ شادی کی اجازت دیتا ہے۔ اگر پانچ سال تک میرے ساتھ رہنے کے باوجود اس نے اسلام قبول نہ کیا تو ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی۔

نظام کو بدلنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے مقتدر طبقے کی مذمت نے عمران خان کو اس طبقے کا مدمقابل بنا کر کھڑا کر دیا جو ہسپتال کے لیے فنڈز فراہم کرنے کی استطاعت رکھتا تھا اور اس مہم میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ عمران خان کو اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر سے شکایت تھی کہ انہوں نے کینسر ہسپتال کی چندہ مہم کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ مثلاً ریاست کی ملکیت میں چلنے والا ٹی وی زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لیے عمران خان کے اشتہار دکھانے پر رضامند نہیں۔ حکومت بنکوں سے جو زکوٰۃ زبردستی جمع کرتی ہے اس میں سے کینسر ہسپتال کو کچھ دینے پر تیار نہیں۔

عمران خان نے بے نظیر حکومت پر اپنی تنقید جاری رکھی۔ شوکت خانم میموریل ہسپتال میں دھماکے کے بعد وزیراعظم بے نظیر بھٹو فوری طور پر پشاور سے لاہور آئیں اور ہسپتال پہنچیں تو عمران خان نے وزیراعظم کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ کرکٹ کی دنیا سے نکلنے کے بعد عمران خان نے عملی زندگی میں کینسر ہسپتال کی

تعمیر سے لے کر جمیما گولڈ سمتھ سے شادی تک جو کچھ کیا' اس میں جذباتیت' تلون مزاجی اور قول و فعل کے تضاد کے پہلو بہت نمایاں رہے۔ ان تضادات کا سبب ذاتی مزاج' خاندانی پس منظر' ناتجربہ کاری اور جلد از جلد نمبر بنی تبدیلی کی معصومانہ خواہش بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

عمران خان کی چندہ مہم پر بھی بے تحاشہ الزامات لگائے گئے حتیٰ کہ لاہور کے ایک وکیل نے اس چندہ مہم کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ عمران خان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے چندہ مہم سے حاصل ہونے والے کروڑوں روپے خود استعمال کر لیے۔ عمران خان ان الزامات کی تردید تو کرتے رہے لیکن کوئی ٹھوس جواب نہ دے سکے۔ البتہ عمران خان کے "سیاسی بیانات" کا سلسلہ پوری شد و مد کے ساتھ جاری رہا اور وہ برسر اقتدار سیاست دانوں اور اپوزیشن رہنماؤں کو بدعنوان قرار دیتے رہے۔

بے نظیر حکومت توڑی گئی تو عمران خان نے صدر فاروق لغاری کے اس عمل کو سراہا اور پوری شدت کے ساتھ پاکستان بھر کے دورے کرنے لگے۔ انھوں نے نواز شریف کو بھی للکارا اور واشگاف الفاظ میں انھیں بدعنوان ترین فرد قرار دیا۔ جواب میں مسلم لیگی سیاست دانوں نے عمران خان کو یہودی ایجنٹ اور "چندہ چور" کے القابات دینا شروع کیے۔ عمران خان نے ۳ فروری ۹۷ء کے انتخابات کے لیے اپنی سیاسی جماعت "تحریک انصاف" کا اعلان کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئے تو ملک کے تمام کرپٹ سیاست دانوں کو چوراہوں میں پھانسیاں دیں گے۔ انھوں نے اپنی انتخابی مہم میں سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو چور قرار دیا اور عوام سے مطالبہ کیا کہ وہ ان دونوں کو رد کر دیں۔ عمران خان نے انھی دنوں لاہور میں مقیم ایک عالم دین علامہ جاوید احمد غامدی سے درس لینا شروع کیا اور اخبارات میں ایسے بیانات دینے لگے کہ وہ ایک مکمل مذہبی شخصیت بن چکے ہیں اور ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی انقلاب کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ پارسائی کے انھی دعوؤں کے ساتھ عمران خان نے میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پر ذاتی حملے شروع کر دیے۔ جواب میں عمران خان کو ایسے شدید ترین حملوں کا سامنا کرنا پڑا کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

انتخابی مہم کے دوران یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی اور عمران کو اپنے ماضی کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟ اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ تھی کہ عمران خان نے سیاست میں خود کو نمایاں کرنے کے لیے باقاعدہ سیاسی جماعت بنائے بغیر یہ یقین کر لیا کہ شوکت خانم ہسپتال کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم چلانے والے کھلنڈرے نوجوان جب وزیراعظم عمران خان کا نعرہ لگاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے عوام سے ملک کا وزیراعظم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جوں جوں یہ تصور ان کے ذہن میں راسخ ہوتا گیا' عمران اس کے نشے میں ڈوبتے چلے گئے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ عمران خان نے شوکت خانم ہسپتال کو تعمیر کرنے کے بعد ایک بڑے تعلیمی پروگرام کا اعلان کیا اور شوکت خانم ہسپتال میں انہوں نے باقاعدہ ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے اس میں اقوام متحدہ کے کسی ادارے سے فارغ ہونے والے ایک پاکستانی ماہر کو اس پروگرام کے انچارج کی حیثیت سے روشناس کرایا۔

عمران خان نے اس تعلیمی پروگرام کو جلد ہی بند کر دیا اور شارٹ کٹ راستوں سے ایوان اقتدار تک جانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ شوکت خانم میں ہونے والے بم دھماکے کو عمران خان نے خوب کیش کرایا اور اس کی ذمہ داری حکومت وقت پر ڈالی۔ میاں نواز شریف اس موقع پر ہسپتال پہنچے تو عمران خان نے اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کہا کہ وہ بہت جلد پاکستان میں احتساب کی تحریک شروع کرنے والے ہیں جس پر میاں نواز شریف نے ان کو اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی لیکن عمرن خان کے مشیر انہیں میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو دونوں سے بیک وقت لڑنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ عمران خان کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ عوام ملک کی موجودہ سیاسی قیادت سے تنگ آ چکے ہیں۔ عمران خان اگر خود کو متبادل قیادت کے طور پر پیش کریں گے تو وہ ان کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ چنانچہ عمران خان نے بلا تخصیص سیاست دانوں کو چور لٹیرے کہنا شروع کر دیا۔

مسلم لیگ نے عمران کے حملوں سے تنگ آ کر جواب دینے کا فیصلہ کیا اور عمران خان کی مبینہ طور پر ناجائز بیٹی "ٹیریان" اور جیمز گولڈ اسمتھ سے انتخابی مہم کے لیے کروڑوں روپے حاصل کرنے کا الزام عائد کر دیا۔ عمران کے خلاف ابھی یہ مہم

اپنے ابتدائی دنوں میں تھی کہ عمران خان نے اپنا لہجہ مزید سخت کر دیا۔ انتخابی مہم کے دوران ملتان میں خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا "میں قومی خزانہ لوٹنے والے چور سیاست دانوں کو سرعام پھانسی پر لٹکا دوں گا تاکہ آئندہ کوئی آصف زرداری' نواز شریف اور بے نظیر پیدا نہ ہو۔ نواز شریف جن کی اقتدار میں آنے سے قبل صرف ایک فیکٹری تھی' آج ۲۰ فیکٹریوں کے مالک بن گئے"۔ نواز شریف اور بے نظیر کو مخاطب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا کہ وہ گھٹیا اور بے ہودہ الزامات کی سیاست سے گریز کریں اور اپنے گریبانوں میں جھانکیں جہاں انہیں اندھیرے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ عوام انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگر میرا منہ کھل گیا تو پھر یہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔ میں نواز شریف اور بے نظیر کو چیلنج کرتا ہوں کہ ایک روپیہ بھی یہودیوں کا ثابت کر دیں تو میں سیاست تو سیاست' ملک ہی چھوڑ دوں گا۔

عمران خان کے میاں نواز شریف پر سیاسی حملوں کے جواب میں مسلم لیگ نے برطانیہ کے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی داستانوں کو عام کرنا شروع کر دیا جن کا تعلق عمران خان کی بدکاریوں سے تھا۔ عمران خان جب پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے تو ایما سارجنٹ اور اس جیسی بہت سی خواتین عمران خان کے ساتھ برطانیہ میں رہتی تھیں۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کے سابق سیکرٹری کرنل رفیع نسیم نے اس حوالے سے ایک آرٹیکل لکھا تھا اور اس میں متعدد خواتین کے نام لے کر یہ استفسار کیا تھا کہ یہ خواتین پاکستان آ کر عمران خان کے کمرے میں کیوں رہتی تھیں۔ کیا رات کو عمران خان ان کی پوجا کرتا تھا؟

عمران خان کی دوست خواتین میں سیتا وائٹ کا نام زیادہ شہرت اختیار کر گیا جس نے دعویٰ کیا کہ اس کی بیٹی ٹیریان عمران خان کی ناجائز بیٹی ہے۔ سیتا وائٹ کے مطابق عمران خان سے دوستی کی وجہ سے اس کی شادی ٹوٹ گئی تھی اور جب اس نے عمران خان کے بچے کی ماں بننے کی خواہش ظاہر کی تو عمران نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ سیتا وائٹ کے بقول جب اس نے عمران خان کو اطلاع دی کہ اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ جو کہ عمران خان کا ہے لڑکا نہیں لڑکی ہے تو عمران خان بہت افسردہ ہو گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ "وہ کرکٹ نہیں کھیل سکے گی"۔

عمران خان پر مصر کے ایک اخبار نے اپنے سسر سر گولڈ سمتھ سے انتخابی مہم کے لیے بھاری رقم وصول کرنے کا الزام بھی لگایا لیکن اس اخبار نے کچھ دنوں کے بعد معافی مانگ لی۔ عمران خان نے اپنی سیاسی جماعت "تحریک انصاف" کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں بہت سے ایسے ناکام سیاست دانوں کو ٹکٹ دیئے جنہیں ان کی سیاسی جماعتیں رد کر چکی تھیں۔ انتخابات میں تحریک انصاف کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا جبکہ خود عمران خان بھی ہزاروں ووٹوں کے ساتھ شکست سے دو چار ہوئے۔ عمران خان کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور وہ بڑے آرام کے ساتھ لندن روانہ ہو گئے۔

غلام اسحاق خان

غلام اسحاق خان پاکستان کے سابقہ صدور مملکت میں ضیاء الحق کے بعد دوسری متنازعہ ترین شخصیت تھے۔ غلام اسحاق خان کی شخصیت کا متنازعہ پن اس وقت پوری طرح ابھر کر سامنے آیا جب اس نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی اور غلام مصطفیٰ جتوئی کو ملک کا نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ یہی عمل غلام اسحاق خان نے ایک بار پھر دہرایا اور ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو میاں نواز شریف کی حکومت بھی تقریباً انہی الزامات کے تحت ختم کر دی جو اس سے پہلے اس نے بے نظیر بھٹو کی حکومت پر لگائے تھے۔

غلام اسحاق خان ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کو صوبہ سرحد کے شہر بنوں کے ایک گاؤں اسماعیل خیل میں پیدا ہوئے۔ سول سروس کے امتحان میں کامیابی کے بعد انہیں سیکریٹریٹ سروس میں لے لیا گیا۔ غلام اسحاق خان آہستہ آہستہ اپنی ملازمت کا سفر طے کرتے ہوئے آب پاشی اور برقیات کے سیکرٹری بنے۔ غلام اسحاق اس وقت انتظامی سطح پر بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئے جب انہیں ۱۹۶۱ء میں واپڈا کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ غلام اسحاق خان کی ملازمت کا "بہترین اصول" یہ رہا کہ وہ کبھی بھی اعلیٰ افسران اور برسر اقتدار سیاست دانوں کی "خوشنودی" کو فراموش نہ کرتے۔ سرکاری آفیسر کی حیثیت سے غلام اسحاق خان ہمیشہ مستعد اور مقتدر لوگوں کے قریب رہتے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے کہ وہ کس طرح اپنے اعلیٰ حکام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

اس کی "روشن مثال" ان کے سیکرٹری خزانہ کے طور پر کیے گئے اقدامات تھے جو انھیں مقتدر حلقوں کے مزید قریب لے آئے۔ غلام اسحاق خان نے ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے "عشرہ اصلاحات" کے دوران سیکرٹری خزانہ کی حیثیت سے ایوب خان کے لیے خزانے کے منہ کھول دیئے۔ غلام اسحاق خان پر الزام لگایا جاتا رہا کہ انھوں نے بھاری رقم صرف ایوب خان کو خوش کرنے کے لیے سرکاری خزانہ سے ایوب خان کے حواریوں میں تقسیم کر دیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے غلام اسحاق خان ہمیشہ اپنے منصب کا "استعمال" اپنے مقتدر لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کرتے۔ جو اصول غلام اسحاق خان نے ایوب کی ملازمت کے دوران اپنایا تھا اس کو جاری رکھا اور پھر یحییٰ خان کی مدد کرنے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں غلام اسحاق خان کو کابینہ ڈویژن کا سیکرٹری لگا دیا گیا اور انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں یحییٰ خان کے اقتدار کی استقامت اور یحییٰ خان کے ساتھیوں کے لیے وقف کر دیں۔ غلام اسحاق خان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے یحییٰ خان کے حواریوں کو حکومتی ایوانوں میں داخل کیا اور انھیں غیر قانونی طور پر مالی فوائد بہم پہنچائے۔

یحییٰ خان کی رخصتی کے بعد غلام اسحاق خان نے اپنی توانائیاں ذوالفقار علی بھٹو کے لیے وقف کر دیں۔ صلہ کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو نے غلام اسحاق خان کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کا گورنر بنا دیا اور غلام اسحاق خان نے ذوالفقار علی بھٹو کے اشاروں پر چلنا شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے نیشنلائزیشن کا عمل شروع کیا تو غلام اسحاق خان ان کے لیے ایک بہترین اور موثر وسیلہ ثابت ہوئے۔ اس سارے عمل میں بھٹو نے غلام اسحاق خان کو وفاداری کا انعام دیا اور ۱۹۷۶ء میں سیکرٹری دفاع بنا دیا۔

بھٹو کا تختہ الٹ کر فوجی حکمران ضیاء الحق بنا تو غلام اسحاق نے بھی اپنی وفاداریوں کا رخ ضیاء الحق کی طرف موڑ دیا اور ایک بار پھر حاکم وقت کی مقدور بھر خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے غلام اسحاق کے لیے سیکرٹری جنرل انچیف کا عہدہ پیدا کیا۔ غلام اسحاق اپنی تنزلی کے

ساتھ ضیاء الحق کا ساتھ دیتا رہا اور اس کے اقتدار کو استحکام بخشتا رہا۔ ۱۹۷۸ء میں ضیاء الحق نے غلام اسحاق خان کو ترقیات اور منصوبہ بندی کے بارے میں اپنا مشیر مقرر کر لیا۔ غلام اسحاق خان پر الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے صدر ضیاء الحق کو اس طرف مائل کیا کہ وہ ملکی سیاست دانوں کو "ترقیاتی فنڈز" کا چارہ ڈال کر اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں غلام اسحاق خان نے ضیاء الحق کو ایک پلان تیار کر کے دیا تھا کہ وہ کس طرح سرکاری خزانہ کو اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ جس پر بعد میں ضیاء الحق نے صدق دل کے ساتھ عمل کیا اور ملک کے بدعنوان سیاست دانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اربوں روپیہ بہا دیا۔ اگر ضیاء الحق دور کا معروضی جائزہ لیا جائے تو ضیاء الحق کی بدبختی پر مبنی اکثر پالیسیوں کے پیچھے غلام اسحاق خان کا متحرک دماغ نظر آتا ہے کہ کس طرح اس ملک کے بے ضمیر سیاست دانوں کو مفادات اور اقتدار کی قربت کا چارہ ڈال کر اپنے قرب میں رکھتا ہے۔ ضیاء الحق نے بھی غلام اسحاق کی "خدمات" کے اعتراف کے طور پر انھیں صلہ دیا کہ ۱۹۸۵ء میں غلام اسحاق خان کو سینٹ کا رکن بنوا دیا۔ اس کے بعد ضیاء الحق نے اپنی اثر و رسوخ استعمال کر کے غلام اسحاق خان کو سینٹ کا چیئرمین بنا دیا۔

ضیاء الحق دور میں فوج کے ساتھ بننے والے تعلقات کو غلام اسحاق خان اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرنا شروع کیا اور جس طرح غلام اسحاق خان نے فوج کو سیاست کے میدان میں داخل کیا اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ غلام اسحاق خان پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے براہ راست جی ایچ کیو سے ہدایات لینے کا وطیرہ اپنایا اور فوج کی خفیہ ایجنسیوں کو لامحدود فنڈز دے کر طاقت کی آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ بالآخر غلام اسحاق خان کی طویل ترین ریاضت رنگ لائی اور ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ضیاء الحق کی اچانک موت کے بعد انھیں ملک کا عبوری صدر بنا دیا گیا۔

غلام اسحاق خان نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اپنے سابقہ تجربات کو دہرانا شروع کر دیا اور ایسے لوگوں کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا جو ضیاء دور میں ان کی وساطت سے وسیع پیمانے پر مفادات حاصل کر چکے تھے۔ غلام اسحاق خان نے وفاق کی علامت کا دعویدار ہونے کا نعرہ لگا کر جماعتی وفاداریاں تبدیل کرانے' لالچ اور دھمکیوں کے

ذریعے کابینہ اور اسمبلیوں سے استعفیٰ دلوانے جیسے اعمال کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ صدر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد غلام اسحاق خان نے بارہا یہ تاثر دیا کہ وہ صاف ستھری سیاست اور آئین کی مکمل بالادستی پر یقین رکھتے ہیں۔ ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء میں غلام اسحاق نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "جمہوریت کا وسیع تر مفاد اور وفاق کا استحکام تقاضا کرتے ہیں کہ عوام کے مینڈیٹ کا احترام کیا جائے اور ایک دوسرے کو برداشت اور قبول کرنے کا حوصلہ اور بقائے باہمی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ یہی وفاقیت کے لازمے ہیں اور یہی قوت وحدت کے تقاضے ہیں"۔ جمہوریت کے بارے میں غلام اسحاق خان کے لب و لہجے اور اصل کردار میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایوب خان' یحییٰ خان' بھٹو اور ضیاء الحق کے دست راست رہے اور ان کے تمام فیصلوں میں برابر کے شریک رہے تھے۔ ان کی تمام "ملازمت" نے ان کے دل و دماغ میں جمہوریت اور جمہوری رویوں کے لیے نرم گوشہ یا احترام سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ غلام اسحاق خان ہمیشہ ان کوششوں میں معروف رہتے کہ کس طرح عوامی پذیرائی کے حامل سیاست دانوں کو نیچا دکھانا ہے اور ان کی حکومتوں کو ناکام کرنا ہے۔

غلام اسحاق خان ایک غیر مستحکم شخصیت تھے۔ ان کے اقوال سرکاری احکامات کی طرح لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتے رہتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اقتدار کی آخری ساعت تک اپنے تمام ہتھ کنڈوں کی مدد سے اقتدار سے چمٹے رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ غلام اسحاق کی تقریروں اور بیانات کا معروضی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے اخلاقی' سیاسی اور فکری معیار ہمیشہ تغیرپذیر رہے۔ کبھی وہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو ایک تعلیم یافتہ' مہذب' شائستہ اور باصلاحیت سیاسی رہنما قرار دیتے رہے بلکہ یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کو غلام اسحاق خان نے بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم نامزد کرتے ہوئے کہا "محترمہ بے نظیر ایک جواں سال' تعلیم یافتہ' مہذب' شائستہ اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ وہ بہترین قائدانہ صلاحیتیں اور مدبرانہ بصیرت رکھتی ہیں۔ ان کے دل میں ملک سے محبت اور عوام کی خدمت کا قابل قدر جذبہ موجزن ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عوام کی پسند اور قوم کا انتخاب ہیں۔ میں پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدے کے لیے نامزدگی پر انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی

کامیابی کے لیے دعاگو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی قیادت ملک اور قوم کے لیے عظمت و افتخار کی نوید ثابت ہوگی"۔

جب ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو غلام اسحاق خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کی تو اس موقع پر غلام اسحاق خان نے جو تقریر کی تو یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کی تقریر کا الٹ تھی۔ غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت پر جو الزامات لگائے' ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ آئینی اور انتظامی اداروں کو مفلوج کر دیا گیا۔

۲۔ قومی دولت بے رحمانہ طریقے سے لوٹی گئی۔

۳۔ سیاسی وفاداریاں منڈی میں مویشیوں کی طرح خریدی اور بیچی گئیں۔

۴۔ لالچ اور دھمکیوں کے ذریعے لوگوں کے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے سے روکا گیا۔

۵۔ عدالتوں جیسے محترم ادارے کا مذاق اڑایا گیا۔ وغیرہ۔

محترمہ بے نظیر کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب مقتدر قوتوں اور غلام اسحاق خان نے فیصلہ کر لیا کہ اقتدار میاں نواز شریف کو سونپا جائے گا اور ایک متنازعہ انتخابات کے بعد جب میاں نواز شریف وزیراعظم کے لیے مضبوط ترین امیدوار قرار دیئے گئے تو غلام اسحاق خان نے اپنی ایک تقریر میں کہا "نئی حکومت کے ولولے جوان اور اس کا عزم صمیم ہے۔ وہ عوام میں بے پناہ مقبولیت اور ملک گیر حمایت کا وہ سرمایہ لے کر میدان میں اتری ہے جو حکمرانوں کا سب سے قیمتی اثاثہ اور ان کی قوت کا حقیقی سرچشمہ ہوا کرتا ہے۔ حکومت کی قیادت ایک شریف النفس' حلیم الطبع' مخلص' پرعزم' روشن خیال اور محنتی نوجوان کے ہاتھ میں ہے جو قائدانہ صلاحیتیں بھی رکھتا ہے اور خدا کا خوف اور ملک و قوم کا درد بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی لیڈر کی کامیابی کے لیے یہ زاد راہ بہت ہے"۔

ایک بار پھر غلام اسحاق خان کی طبیعت نے جوش مارا اور ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو اس نے میاں نواز شریف کی حکومت بھی ختم کر دی۔ میاں نواز شریف پر بھی تقریباً وہی الزامات لگائے گئے جو وہ اس سے پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو پر لگا چکے تھے۔ انہوں

نے اپنی تقریر میں بار بار اپنی آئینی ذمہ داری' اپنے جمہوری فرائض اور اللہ کے حضور جواب دہی کے "شدید ترین احساس" کا تذکرہ کیا۔ غلام اسحاق خان نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے فوج کو ساتھ ملا کر نواز شریف کی حکومت ختم کر دی بلکہ جب سپریم کورٹ نے میاں نواز شریف حکومت بحال کر دی تو اسحاق خان اس دورانیئے میں اپنے تمام پلان پورے کر چکے تھے۔ اگرچہ بعد میں غلام اسحاق خان کو خود بھی اقتدار چھوڑنا پڑا لیکن جس طرح انہوں نے راولپنڈی کے کور کمانڈر کے ذریعے میاں نواز شریف کی سبکی کرائی اس کی بھی پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

غلام اسحاق خان پر کرپشن اور بدعنوانیوں کے لاتعداد الزامات لگائے گئے لیکن کوئی بھی ان کے خلاف ٹھوس ثبوت مہیا نہ کر سکا۔ البتہ اس بات پر ایک طرح سے مکمل اتفاق رائے موجود رہا کہ غلام اسحاق خان کے قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں نے غلام اسحاق کی رضامندی سے وسیع پیمانے پر بدعنوانیاں کیں اور وسیع جائیدادیں بنا لیں۔ اس سلسلے میں سرحد کے سیف اللہ برادران پر بھی الزام لگایا گیا کہ انہوں نے صدر غلام اسحاق خان کی وساطت سے کروڑوں روپیہ کمایا۔ جبکہ غلام اسحاق خان کو اپنے ایک قریبی عزیز عرفان اللہ مروت کی وجہ سے بھی خاصی خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض ذرائع غلام اسحاق خان پر براہ راست یہ الزام بھی لگاتے رہے کہ غلام اسحاق خان کی ایماء پر عرفان اللہ مروت نے ایک مشہور مسلم لیگی لیڈر کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ اس کے علاوہ فنانس کمپنیوں کے فراڈ میں بھی غلام اسحاق خان کو ملوث کیا جاتا رہا لیکن اس حوالے سے کسی نوعیت کا کوئی ثبوت پیش نہ کیا جا سکا۔

غلام حیدر وائیں

پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں (مرحوم) کو مسلم لیگی حلقوں نے ان کی زندگی میں ہی "درویش" کا درجہ دے دیا تھا جبکہ آج بھی مسلم لیگ(ن) کے قائدین جب غلام حیدر وائیں کی شخصیت اور ان کی وزارت اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو اس حوالے سے جس نوعیت کی مبالغہ آمیزی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے' اپنی مثال آپ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غلام حیدر وائیں کی اپنی سیاسی جماعت کے ساتھ مکمل اور والہانہ وابستگی تھی اور وہ ایک معمولی ورکر سے ترقی کرتے ہوئے پنجاب کی وزارت اعلیٰ تک پہنچے تھے لیکن ان کی اس تنظیمی ترقی کو ان کی شخصیت اور مزاج میں گڈمڈ نہیں کیا جاسکتا۔ غلام حیدر وائیں پر ان کی وزارت اعلیٰ کے دوران بے تحاشہ بدعنوانیوں کے الزامات لگائے گئے۔ پنجاب میں مسلم لیگی افراد کو اعلیٰ ملازمتیں دلوانے میں بھی غلام حیدر وائیں کا کردار اہم رہا جبکہ اس کے علاوہ ان کے دور حکومت میں اعلیٰ سطح کی کئی بے ضابطگیاں روا رکھی گئیں۔

مثال کے طور پر غلام حیدر وائیں جو ہر وقت اس بخار میں مبتلا رہتے کہ مسلم لیگی دھڑے انھیں قائداعظم کے بعد آنے والے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ مسلم لیگ کا درد دل رکھنے والا قرار دیتے ہیں۔ اسی وہم کے زیر اثر موصوف انتظامی سطح پر اپنی نظریاتی برتری کو قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے منصوبے بناتے رہے اور ان منصوبوں کے لیے اربوں روپے مختص کرتے رہے۔

غلام حیدر وائیں جو نظریہ پاکستان کی "محافظت" کے لیے ہر وقت سرکاری سطح پر کوشاں رہتے' ان کی نظر ایک دن مال روڈ پر واقع فائیو سٹار ہوٹل پرل کانٹی نینٹل کے ساتھ خالی پڑی زمین پر ٹھہر گئی۔ وزیراعلیٰ بہادر نے فوری فیصلہ کیا کہ اس جگہ کا کوئی فوری اور متبرک "مصرف" نکالا جائے لہٰذا چند گھنٹوں بعد وزیراعلیٰ ہاؤس پہنچ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ۳ کنال پر واقع کروڑوں روپے مالیت کی اراضی پر "نظریہ پاکستان ٹرسٹ" قائم کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ اراضی حکومت پنجاب کے تین علمی و ادبی اداروں کی ملکیت تھی اور اس کا کل رقبہ ۱۸ کنال پر مشتمل ہے۔ وزیراعلیٰ موصوف نے ان اداروں کو مطلع کرنے کی زحمت نہ کی اور نہ ہی اصولی طور پر ان اداروں سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس کی اور حکم نامہ جاری کر دیا۔ پنجاب میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری شخصیت کی جرات نہیں تھی کہ وہ اس "مقدس" مشن کی راہ میں رکاوٹ بنتے یا کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اسی طرح وزیراعلیٰ وائیں نے مسلم لیگ کے منشور کے مطابق یہ اعلان کر دیا کہ وہ سابقہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں پھنسے ہوئے بہاری مہاجروں کو پاکستان لائیں گے جہاں ان کو حکومت گھر اور باعزت روزگار فراہم کرے گی۔ وزیراعلیٰ کے اس پلان کے تحت ۱۰ جنوری ۱۹۹۳ء کو ۶۳ بہاری خاندانوں پر مشتمل پہلا قافلہ طیارے کے ذریعے ڈھاکہ کی آدم جی جیوٹ مل کے مضافات سے روانہ ہوا۔ صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ ان مہاجروں کو پہلے تو اوکاڑہ میں تعمیر شدہ ایک کالونی میں بسائے گی۔ واضح رہے کہ یہ کالونی سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے بے گھر لوگوں کے لیے ایک سکیم شروع کی تھی اور یہ مکانات اسی سکیم کا حصہ تھے۔ لیکن جونیجو حکومت کے خاتمے کے بعد نامعلوم وجوہات کے باعث یہاں پر بے گھر لوگوں کو بسایا نہیں جا سکا تھا۔ صوبائی حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ یہاں پہنچنے والے بہاری خاندانوں کو اٹھارہ ماہ تک ۱۲۰۰ روپیہ فی کس کے حساب سے ماہوار وظیفہ بھی دیا جائے گا۔ اس کالونی کو "عارضی بہاری کیمپ" کا نام دیا گیا تھا۔

بہاریوں کی اس قافلے کی آمد کے ساتھ ہی وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں نے ایک فوری حکم جاری کر دیا جس کے تحت ان کے آبائی شہر میاں چنوں سے پانچ کلومیٹر

کے فاصلے پر "مصوئی ورک" میں ماڈل ٹاؤن کے نام سے بہاری کالونی تعمیر کی جانے گی۔ واضح رہے کہ غلام حیدر وائیں نے اپنے قائد اور وزیر اعظم میاں نواز شریف کے آبائی علاقے ماڈل ٹاؤن کے نام پر اس کالونی کا نام تجویز کیا تھا۔

غلام حیدر وائیں کا پلان یہ تھا کہ بنگلہ دیش میں قائم ۶۶ بہاری کیمپوں میں مقیم ۷۰ ہزار سے زائد بہاریوں کو پنجاب کے ان اضلاع میں بسایا جائے، جہاں سے مسلم لیگ کو پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ۳ سے ۷ کر ۱۰ ہزار ووٹوں تک شکست ہوئی تھی۔ وائیں کا خیال تھا کہ اس آباد کاری سے ایک تو قومی سطح پر "نیک عمل" کا اضافہ ہو گا اور دوسرا مسلم لیگ کو انتخابی سیاست کے حوالے سے بہت بڑا فائدہ ہو گا۔

غلام حیدر وائیں نے جلد ہی ایک اور بہاری کالونی کی تعمیر کا بھی حکم جاری کر دیا اور اس کی بھی فوری تعمیر شروع کر دی گئی۔ وزیر اعلیٰ وائیں نے دونوں کالونیوں کی تعمیر کے لیے فوری طور پر ۵۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کر دی۔ غلام حیدر وائیں کے مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ غلام حیدر وائیں نے ۵۰ کروڑ روپے کی اس خطیر رقم میں سے ایک جدید ترین پجیرو خرید لی اور میاں چنوں میں ایک عالیشان گھر تعمیر کر لیا جبکہ ۱۵ کروڑ روپے کی رقم میاں چنوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی افراد میں بانٹ دی۔ وائیں کی شروع کردہ یہ بہاری کالونیاں ابھی زیر تعمیر تھیں کہ مسلم لیگ کی حکومت ختم کر دی گئی اور نئے وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو نے ان کالونیوں کی تعمیر روک دی اور ان پر بھی الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے اس مد میں سے ۱۰ کروڑ روپے خود ہضم کر لیے۔

غلام حیدر وائیں اور میاں منظور وٹو کی بدعنوانیوں کے باعث ان لاچار بہاریوں کے لیے مختص کی گئی رقم میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ بچا اور نہ ہی ان کی رہائش گاہیں پوری طرح تعمیر ہو سکیں۔ نہ ان بہاریوں کو وعدے کے باوجود کوئی روزگار ہی میسر آ سکا۔ بہاری خاندان کچھ عرصہ تک تو ان کالونیوں میں دھکے کھاتے رہے لیکن پھر انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ کراچی جا بسیں۔ جو خاندان کراچی نہ جا سکے، ان میں سے اکثر نے لاہور کا راستہ لیا اور یہاں پہنچ گئے۔ ان اجنبیوں کو لاہور میں بھی کوئی کاروبار میسر نہ آ سکا تو انہوں نے لاہور کے شاہی محلے میں ڈیرے

ڈال لیے۔ یوں ایک وزیر اعلیٰ کی خواہش اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔

غلام حیدر وائیں چونکہ ایک "پکے مسلم لیگی" کا لقب اختیار کیے ہوئے تھے اور پنجاب کی مکمل کمانڈ ان کے ہاتھ میں تھی' لہٰذا انہوں نے صوبائی خزانے کی تقسیم کو اپنا لیا اور جس بے دردی کے ساتھ غلام حیدر وائیں نے سرکاری دولت کو اپنے خاص لوگوں میں تقسیم کیا' اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صرف وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ میں سے غلام حیدر وائیں نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران ۷ اگست '۹۱ سے ۲۵ اپریل ۱۹۹۳ء تک ۹ کروڑ ۲۷ لاکھ ۴۶ ہزار ۲۵۸ روپے خرچ کر دیے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں وزیر اعلیٰ وائیں کے دور میں صوابدیدی فنڈ کی رقم ۴ کروڑ ۵۶ لاکھ ۶۷ ہزار ۸۵۰ روپے تک پہنچ چکی تھی اور اس میں سے ۳ کروڑ ۱۳ لاکھ' ۸۱ ہزار ۲۲ روپے وائیں نے صرف ایک سال میں خرچ کر دیے۔

غلام حیدر وائیں نے ۷ اگست ۱۹۹۱ء سے ۲۵ اپریل ۱۹۹۳ء تک جہیز فنڈ سے ۴ کروڑ ۳۹ لاکھ ۱۷ ہزار روپے استعمال کیے۔ غلام حیدر وائیں نے اپنی صوابدیدی رقم میں اضافہ کے لیے بیت المال کو بھی اپنے تصرف میں لانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۹۲ء میں بیت المال کا قانون منظور کیا گیا۔ اس فنڈ کو چلانے کے لیے ۱۵ رکنی کونسل مقرر کی گئی جس کا سربراہ ایک "امین" تھا۔ کونسل کے پانچ سرکاری ارکان تھے جو محکمہ سماجی بہبود آبادی' خزانہ' صحت' تعلیم اور زکوٰۃ کے سیکرٹری اور سماجی بہبود کے ڈائریکٹر جنرل تھے جبکہ باقی ارکان غیر سرکاری افراد تھے۔

"درویش" وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں نے ۹ اگست ۱۹۹۲ء بیت المال کے سیکرٹری کو ایک خط لکھوایا جس میں بیت المال کے سیکرٹری کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ کو ایک کروڑ روپے کی رقم منتقل کر دے۔ تاکہ اس رقم کو وزیر اعلیٰ کی صوابدید پر غریب اور مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ بیت المال کی کونسل نے یہ رقم فوری طور پر وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کو بھیج دی لیکن بعض وجوہات کے باعث یہ رقم "استعمال" نہ ہو سکی۔

اسی طرح ۸ ستمبر ۱۹۹۲ء کو وزیر اعلیٰ ہاؤس کے سیکرٹری نے بیت المال کونسل کو ہدایت کی کہ سیلاب زدگان کی مدد کے لیے بیت المال سے ۱۰ کروڑ روپے کی رقم

وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ کو منتقل کر دی جائے۔ ۲ ستمبر ۱۹۹۳ء یعنی اگلے روز ہی بیت المال کونسل نے ۹ کروڑ ۵۲ لاکھ ۲۶ ہزار ۹۰۸ روپے وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ کو منتقل کر دیے۔ واضح رہے کہ اس فنڈ کے لیے بیت المال کے ڈپازٹ میں صرف اتنی ہی رقم موجود تھی جو فوری طور پر وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ کے حوالے کر دی گئی۔ واضح رہے کہ یہ رقم غیر قانونی طور پر وزیراعلیٰ وائیں کے حوالے کی گئی کیونکہ اتنی بڑی رقم صرف ایک ہدایت نامے پر اور اس مد کے لیے وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ کو قانوناً نہیں دی جا سکتی تھی لیکن اس وقت کے بیت المال کے "امین" شیخ منظور الٰہی جو بعد میں نگران وزیراعلیٰ بھی بنائے گئے' انہوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے یہ رقم وزیراعلیٰ تک پہنچا دی۔

"درویش" وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں نے اس خطیر رقم کا "استعمال" اپنے مسلم لیگی ارکان اسمبلی اور کابینہ کے ارکان کے ذریعے کیا اور تمام رقم متاثرین کی بجائے ان ارکان میں تقسیم کر دی گئی۔ رقم وصول کرنے والوں نے جدید ترین پجارو گاڑیاں خرید لیں اور باقی رقم بیرون ممالک اپنے اپنے اکاؤنٹس میں جمع کرا دی۔ بعد میں شیخ منظور الٰہی عدالت کے سامنے اپنے اس عمل کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔

غلام حیدر وائیں نے ۱۹۷۵ء کے ایکٹ کے تحت صوابدیدی فنڈ میں موجود تقریباً ۱۰ کروڑ روپیہ اپنے "منظور نظر" افراد میں تقسیم کر دیا۔ اس کے علاوہ غلام حیدر وائیں نے بیت المال فنڈ میں موجود ۸ کروڑ ۹۸ لاکھ ۳۲ ہزار ۳۰ روپے میں سے ایک کروڑ ۸۷ لاکھ روپے اپنے منظور نظر افراد میں بانٹ دیے اور ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے قومی و صوبائی اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کر دیے۔

غلام حیدر وائیں نے میاں چنوں میں واقع اپنے ہی ادارہ میں بیت المال فنڈ سے ۳۰ لاکھ روپے دے دیئے۔ اسی طرح وائیں نے وزیراعظم میاں نواز شریف کے نامزد کردہ افراد کو ۸ لاکھ ۸۴ ہزار روپے بانٹ دیئے۔ اس رقم میں سے غلام حیدر وائیں نے ایک ڈپٹی کمشنر ندیم حسن آصف کے ذریعے گورنر ہاؤس کو ۵ لاکھ روپے کی عیدی بھیج دی جہاں وزیراعظم نواز شریف لوگوں سے عید ملنے آ رہے تھے۔ غلام حیدر وائیں نے اس کے علاوہ بھی ایک لاکھ روپیہ سیکرٹری گورنر ہاؤس کو عیدی کے طور پر

بھیج دیا۔ غلام حیدر وائیں نے بڑی شاہانہ انداز میں عید ملنائی اور ۷ کلب روڈ' ۹۰ شاہراہ قائداعظم لاہور' پنجاب ہاؤس راولپنڈی' اسلام آباد' مری اور کراچی اور میاں چنوں میں صرف عیدی کے طور پر مختلف افراد میں ۲۹ لاکھ روپے بانٹ دیے گئے۔

غلام حیدر وائیں کی وزارت اعلیٰ کا دورانیہ شدید نوعیت کی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کی نذر میں رہا۔ غلام حیدر وائیں مسلم لیگی ارکان اسمبلی اور اپنے رشتہ داروں کو جھولیاں بھر بھر کر نوازتے رہے جبکہ وزیراعظم میاں نواز شریف بھی وائیں کو اپنے منظور نظر افراد کی فہرستیں پہنچاتے رہتے اور غلام حیدر وائیں سچے پیارے قائد نواز شریف کے بھیجے ہوئے افراد کو کبھی مایوس نہ لوٹاتے بلکہ انھیں وائیں کے "دربار" سے توقع سے بھی زیادہ ملتا رہا۔

وائیں کی شخصیت میں ایک طرح کی "نظریاتی بددیانتی" کا عنصر بہت زیادہ نمایاں تھا۔ وائیں ہمیشہ مسلم لیگ کو "مقدس" جماعت قرار دیتے رہے اور اپنے آپ کو قائداعظم کے مشن کو آگے بڑھانے والا کہتے رہے اور اسی نظریے کی آڑ میں قومی دولت کا بے جا اور غیر قانونی اسراف کرتے رہے۔ وائیں نے ارب روپے سے زائد لاگت کے ایک منصوبے کا آغاز کر دیا تھا جس کو "باب پاکستان" کا نام دیا گیا لیکن ان کی حکومت کو ایوان صدر سے اور فوج کی طرف سے مہلت نہ مل سکی ورنہ یہاں بھی ان کی کرپشن کے عجیب و غریب انداز سامنے آتے۔

گورنر جنرل غلام محمد

ملک غلام محمد ۱۹ گست ۱۸۹۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے تک تعلیم کپورتھلہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے ایم۔ اے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں انڈین آڈٹ اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کے لیے امتحان دیا اور کامیاب قرار پائے۔ ۱۹۲۴ء میں غلام محمد حکومت ہندوستان کے پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف محکمہ کے ڈپٹی اکاؤنٹ جنرل بنائے گئے۔ اس عہدے کے بعد ان کی خدمات سپلائی ڈیپارٹمنٹ نے مستعار لے لیں اور جنگِ عظیم دوم کے دوران حکومت ہند کے سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں بطور ایڈیشنل سیکرٹری کام کرتے رہے۔ ملازمت کا کچھ عرصہ ٹاٹا کمپنی کے ڈائریکٹر کے طور پر گزارا۔

شعبہ مالیات میں غلام محمد کا نام ایک معتبر حوالے کے طور پر لیا جاتا رہا۔ ۱۹۴۱ء میں غلام محمد دولت آصفیہ کے وزیر مالیات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں نظام دکن حیدر آباد کے وزیر مالیات بھی رہے۔ تقسیم کے بعد غلام محمد کو پاکستان کی مرکزی کابینہ میں وزیر مالیت کا عہدہ دیا گیا۔ وزیر مالیات کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان سٹیٹ بینک' زرعی مالیاتی کارپوریشن اور صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔

پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملک غلام محمد کو پاکستان کا تیسرا گورنر جنرل بنا دیا گیا انہوں نے بطور گورنر جنرل پاکستان ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اپنے عہدے کا

حلف اٹھایا۔ یہی غلام محمد کا آخری عہدہ تھا جسے انہوں نے شدید بیماری اور سیاسی کھنچاؤ کے باعث چھوڑ دیا۔ اسی عہدے پر رہتے ہوئے انہوں نے بعض ایسے اقدامات کیے جو ان کی شخصیت میں پنہاں آمریت کو سامنے لائے اور انہیں شروع پاکستان کی سب سے متنازعہ شخصیت قرار دیا گیا۔

ملک غلام محمد نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ تحلیل شدہ اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے گورنر جنرل غلام محمد کے اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کر دیا۔ مولوی تمیز الدین نے موقف اختیار کیا کہ آزادی ہند کے ایکٹ مجریہ ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۸ کی ذیلی دفعہ ۸ کے تحت قانون سازی کے لیے گورنر جنرل کی منظوری ضروری نہیں۔ چنانچہ آئین ساز اسمبلی توڑنے کا اقدام غیر قانونی اور غیر آئینی ہے اس لیے اسمبلی بحال کی جائے۔ چیف کورٹ آف سندھ کے فل بینچ نے متفقہ طور پر گورنر جنرل کے اقدام کو غیر قانونی و غیر آئینی قرار دیا۔ عدالت کے اس فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کی گئی جس نے اپنے فیصلے میں چیف کورٹ آف سندھ کے فیصلے کو غلط قرار دیتے ہوئے گورنر جنرل کے اقدام کو قانونی و آئینی لحاظ سے درست قرار دے دیا۔

ملک غلام محمد اس دوران فالج کے شدید حملے کے باعث تقریباً مفلوج ہو گئے اور ان کی قوت گویائی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ ان کا یہ مرض اتنا بڑھا کہ مجبوراً وہ ۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ۲۹ اگست ۱۹۵۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

پاکستان کی جمہوری روایات پر پہلا مہلک اور کاری وار گورنر جنرل غلام محمد نے کیا۔ غلام محمد نے نہ صرف پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو توڑا بلکہ یکے بعد دیگرے خواجہ ناظم الدین' محمد علی بوگرہ اور چودھری محمد علی کی حکومتیں ختم کیں۔ ابھی چودھری محمد علی کی وزارت آخری سانسیں لے رہی تھی کہ غلام محمد کے اقتدار کو ایک سابق آئی سی ایس آفیسر اور سابق گورنر مشرقی پاکستان اسکندر مرزا نے ختم کر دیا۔ غلام محمد نے اگست ۵۵ سے اکتوبر ۵۸ تک کے ۳۸ ماہ میں پانچ وزرائے اعظم کی حکومتیں فارغ کیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ غلام محمد اور سکندر مرزا کی تعریف میں متعدد ابن

الوقت اور خود فروش سیاست دانوں نے قصیدے پڑھے حتیٰ کہ اس وقت سپریم کورٹ نے بھی دستور ساز اسمبلی توڑے جانے کے حق میں فیصلہ دیا۔

غلام محمد ایک معروف ماہر اقتصادیات تھے۔ غلام محمد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خوشامد و سازش کے تمام رموز سے مکمل آشنا تھے اور اسی مہارت کے توسط انہوں نے ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کا خصوصی قرب حاصل کیا اور ن سے پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر خزانہ کا عہدہ حاصل کر لیا۔ واضح رہے کہ غلام محمد سابق سی ایس پی آفیسر بھی رہ چکے تھے۔ لیاقت علی خان کی موت کے بعد غلام محمد نے وزیراعظم بننے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ مسلم لیگ کی مرکزی کونسل نے غلام محمد کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا اور ان کی خواہش کو روندتے ہوئے خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کا وزیراعظم نامزد کر دیا۔ خواجہ ناظم الدین مشرقی پاکستان کے گورنر تھے اور قائداعظم کی وفات کے بعد ۱۹۴۸ء میں انہیں پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ غلام محمد وزارت عظمیٰ پر قابض نہ ہو سکے تو انہوں نے گورنر جنرل کے عہدے کے لیے مسلم لیگ کی ہائی کمان کو راضی کر لیا۔ گورنر جنرل بننے کے بعد غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین اور محمد علی بوگرہ کی حکومتیں ختم کر دیں۔ ایک دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ غلام محمد نے بعد میں چودھری محمد علی کی حکومت میں دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے کہ خود ان کو اسکندر مرزا نے اقتدار سے نیچے پھینک دیا۔ غلام محمد کا نشانہ بننے والوں میں خواجہ ناظم الدین' محمد علی بوگرہ' چودھری محمد علی' حسین شہید سہروردی' اسماعیل ابراہیم چندریگر اور ملک فیروز نون شامل تھے۔

ملک میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک پارلیمانی نظام رہا۔ بیشتر سیاست دانوں اور سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ پاکستان میں غلام محمد اور سکندر مرزا جیسی شخصیات کی وجہ سے بہتر اور موثر پارلیمانی نظام کبھی بھی ملک میں رائج نہیں رہا۔ غیر ملکی مبصرین کے مطابق بھی پاکستان میں پارلیمانی نظام بری طرح ناکام رہا ہے۔

اسی طرح ملکی و غیر ملکی مبصرین اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ غلام محمد کو گورنر جنرل بنانا شدید ترین غلطی تھی کیونکہ غلام محمد کی پرورش سیاست دانوں کی

طرح نہیں ہوئی تھی اور وہ پارلیمانی آداب و اطوار سے قطعی نا آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پارلیمانی نظام کو ایک اجنبی اور غیر ضروری چیز سمجھتے رہے۔ غلام محمد پارلیمانی نظام کی بجائے صدارتی نظام کے حامی تھے اور ان کے ذہن میں گورنر جنرل کی آئینی حیثیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ غلام محمد نے اپنے اقتدار کے دوران برطانوی دور کے گورنر جنرل کو نمونہ بنائے رکھا اور اپنے فرائض کو انہی خطوط پر رواں رکھنے کی کوشش کی۔

جب قائداعظم، لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین سیاسی جدوجہد میں معروف تھے، ملک غلام محمد ریاست حیدر آباد میں وزیر خزانہ تھے۔ ان کی شہرت ایک ماہر اقتصادیات کی تھی اور امور خزانہ میں ان کی مہارت کی تعریف کی جاتی تھی۔ مگر ان کے مزاج اور طرز فکر کے بارے میں بہت کم معلومات موجود تھیں۔ یہ بھی ایک سوال ہے کہ ایک سرکاری افسر آزادی کے بعد وزیر خزانہ کے عہدے تک کیسے پہنچا؟ اگرچہ سیاسی مبصرین غلام محمد کی گورنر جنرل کے عہدے پر تقرری کو مختلف حوالوں سے دیکھتے ہیں اور ان میں سے اکثر کا یہی خیال ہے کہ غلام محمد کو ایک بنگالی وزیراعظم کے ساتھ گورنر جنرل اس لیے بنایا گیا کہ ملک کے دونوں حصوں میں طاقت کا توازن موجود رہے اور ملک کے ابتدائی حالات میں اس نوعیت کی کوئی بدگمانی نہ پیدا ہونے پائے کہ کون شخص اور کس علاقے کا نمائندہ کس قدر مقتدر ہے۔ اس کے علاوہ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ غلام محمد کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر یہ تصور کیا گیا کہ وہ خزانہ کے پیچیدہ اور محنت طلب امور کو شاید صحیح طور پر نبھا نہ سکیں اس لیے انہیں گورنر جنرل بنانا مناسب سمجھا گیا۔

دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے سے متعلق قانون کی منظوری دی تو وہ اس وقت کراچی سے باہر تھے۔ جبکہ وزیراعظم اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر کے امریکہ روانہ ہو گئے تھے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ مولوی تمیز الدین اور دوسرے سینئر لیڈروں نے انہیں ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی یہی مشہور تھا کہ ملک غلام محمد آسانی سے ایسی حرکت برداشت کرنے والے نہیں۔ اس وقت وہ سخت بیمار تھے اور گفتگو کرنے سے بھی قاصر تھے۔ الطاف گوہر کے بقول

بڑھا غصے سے بے قابو ہو رہا تھا کہ اسمبلی کو ایسا کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ گورنر جنرل نے اہم شخصیات سے مشورے شروع کر دیئے اور وہ حسین شہید سہروردی سے ایک بیان لینے میں بھی کامیاب ہو گئے جو ۱۹ اکتوبر کے اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ بیان تین نکات پر مشتمل تھا:

○۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔ جمہوری تقاضہ تھا کہ اسے توڑ کر نئی اسمبلی بنائی جائے۔

○۔ نئے آئین میں زیادہ صوبائی خود مختاری کے لیے کوششیں ہونی چاہئیں۔

○۔ مشرقی پاکستان کو وحدت مغربی پاکستان کی کوششوں کی حمایت کرنی چاہیے۔

"ملک غلام محمد کے اپنے صوبے پنجاب میں صدائے احتجاج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ نئے آئین میں مشرقی پاکستان کو زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ نیز مشرقی پاکستان کے اراکین اسمبلی وزیراعظم اور اسمبلی کو ان پر گورنر راج مسلط کرنے پر لعن طعن کر رہے تھے۔ انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے غلام محمد نے اندازہ کر لیا تھا کہ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

گورنر جنرل نے زمام حکومت سنبھال لی اور وزیراعظم سے کہا کہ اگر تم تعاون نہیں کرو گے تو پھر فوج اقتدار سنبھال لے گی۔ گورنر جنرل نے محمد علی بوگرہ سے کہا کہ یا تو دستور ساز اسمبلی کی برطرفی سے متفق ہو جاؤ اور گورنر جنرل اور فوج سے تعاون کرو۔ ورنہ مستعفی ہو جاؤ۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی بوگرہ نے درشت لہجے میں کہا کہ "اگر میں انکار کر دوں تو؟"

غلام محمد نے جواب میں سخت لہجے میں کہا کہ "انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" اور واقعی انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ محمد علی بوگرہ کو نظر آ رہا تھا کہ گورنر جنرل کو ایوب خان اور اسکندر مرزا کی حمایت حاصل ہے۔ ایوب خان گورنر جنرل غلام محمد کے احسان مند بھی تھے کیونکہ ۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے ان کی معیاد عہدہ بڑھا کر پانچ سال کر دی تھی۔ محمد علی بوگرہ کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ وزیراعظم سے نپٹنے کے بعد گورنر جنرل پاکستانی عوام کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں ہنگامی حالت کے سپرد کر دیا۔ ایسا کرنے کے بعد گورنر جنرل نے سکھ کا سانس لیا اور اپنی کامیابی پر فخر کرنے لگا۔

اسمبلی توڑنے کا گورنر جنرل کا یہ اقدام پاکستان کے کمزور اور نیم مردہ پارلیمانی نظام پر ایک کاری ضرب تھی جس سے آئینی اور سیاسی بحران پیدا ہوا۔ اکتوبر ۵۴ء کی ایک رات ایسا وقت بھی آیا جب ایک اس نیم پاگل گورنر جنرل نے ایک فوجی جرنیل کو دائیں اور دوسرے کو بائیں کھڑا کر کے ایک زیر حراست وزیراعظم پر دستور ساز اسمبلی توڑنے کا فیصلہ مسلط کر دیا اور اس طرح عملی طور پر ایک نیم آمرانہ حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔

گورنر جنرل غلام محمد دائمی مریض تھے اور ان کو بلڈ پریشر کا شدید عارضہ لاحق تھا۔ غلام محمد کی طبیعت میں ہٹ دھرمی اور ضد کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی بھی نوعیت کا اختلاف رائے ان کی برداشت سے باہر تھا۔ ان کی شخصیت اور خیالات نے اعلیٰ سرکاری حکام کو سیاست دانوں پر غلبہ حاصل کرنے میں مدد دی۔ ایوب خان کے بقول غلام محمد نے انہیں پاکستان میں دو مرتبہ فوجی حکومت قائم کرنے اور اقتدار سنبھالنے کی پیشکش کی تھی۔

محمد علی بوگرہ کی وزارت کے زمانے میں اہم اور نازک امور پر تمام تر فیصلے غلام محمد ہی کیا کرتے تھے جبکہ وزیراعظم کو اس کی رسمی اطلاع ہی دی جاتی تھی۔ بغداد پیکٹ اور سیٹو میں شمولیت کا فیصلہ غلام محمد کی منظوری سے اور وزیراعظم یا کابینہ سے اس ضمن مشورہ طلب کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ محمد علی بوگرہ نے گورنر جنرل غلام محمد سے بدظن ہو کر سیاست دانوں کے ساتھ غلام محمد کے خلاف گٹھ جوڑ کرنا شروع کر دیا۔

کابینہ کی تشکیل کا مجاز وزیراعظم ہوتا ہے لیکن گورنر جنرل غلام محمد نے یہاں بھی پارلیمانی روایت کو تہہ و بالا کیا اور محمد علی بوگرہ کو ایسی کابینہ اپنے ساتھ رکھنا پڑی جو تمام کی تمام غلام محمد کی منتخب کردہ تھی۔ اور ان میں سے کئی لوگ محمد علی بوگرہ کو جانتے تک نہ تھے۔ بلکہ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گورنر جنرل غلام محمد کی وساطت سے محمد علی بوگرہ کی ان کی کابینہ کے لوگوں کی ملاقات ہوئی۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی اور اس شکست نے پاکستانی سیاست میں

ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کا مطالبہ کر دیا۔ وزیر اعظم اور دوسرے بنگالی سیاست دانوں نے صوبے کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ مطالبہ منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ اردو کے ساتھ بنگالی بھی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں زبان کی شق میں ترمیم کر دی گئی۔ پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں نے محمد علی فارمولہ کو تسلیم تو کر لیا مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو شکست ہو۔ ان کی خواہش تھی کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ قائم ہو جائے۔ مشرقی پاکستان کے نئے رہنما جن میں حسین شہید سہروردی اور دوسرے شامل تھے' اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ محمد علی بوگرہ نے جب بنگالی زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے کے لیے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں ترمیم کی تو پنجابی سیاست دانوں کو ون یونٹ کا مطالبہ دہرانے کا موقعہ مل گیا۔ انہوں نے اپنے مقصد کی خاطر مغربی پاکستان کے صوبوں پر مشتمل ایک زونل فیڈریشن بنانے کی تجویز پیش کر دی۔ بنگالی سیاست دانوں پنجابیوں کے اس رویے پر بڑے سیخ پا ہوئے اور زونل فیڈریشن کی تجویز کی مخالفت کر دی۔

گورنر جنرل غلام محمد نے زونل فیڈریشن کے قیام کے مخالفین کو دھمکیاں دیں اور کہا کہ انہوں نے اگر اس کی مخالفت ترک نہ کی تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ یہ دھمکی خان قیوم خان' حسن محمود' عبدالستار پیرزاد کے علاوہ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو دی گئی۔ وزیر اعظم نہیں چاہتے تھے کہ ان کا حشر بھی خواجہ ناظم الدین جیسا ہو۔ لہٰذا وہ عملی طور پر سیاست دانوں سے جا ملے جو گورنر جنرل غلام محمد کے خلاف تھے۔ اس گروپ کی دستور ساز اسمبلی میں اکثریت تھی۔ لہٰذا اسمبلی نے ۱۹۵۴ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو پاس کرنے کے علاوہ نہایت ڈرامائی انداز میں ایسا قانون پاس کیا جس کے تحت گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی ہو گئی اور گورنر جنرل سے وزیر اعظم کو برطرف کرنے کا حق چھین لیا گیا۔ جب اسمبلی نے گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا قانون پاس کیا' گورنر جنرل غلام محمد دارالخلافہ موجود نہ تھے۔ اسی دوران وزیر اعظم بوگرہ امریکہ چلے گئے۔

امریکہ کو روانگی سے قبل وزیراعظم نے اعلان کیا کہ وہ مجوزہ آئین کو حتمی شکل دینے کے لیے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو منعقد کیا جائے گا۔ وزیراعظم جب امریکہ سے آئے تو ایئرپورٹ سے انھیں گورنر جنرل ہاؤس لایا گیا اور غلام محمد نے انھیں بتایا کہ انھوں نے دستور ساز اسمبلی توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وزیراعظم نے احتجاج کیا لیکن گورنر جنرل نے اپنی ہٹ دھرمی دکھائی اور بالآخر غلام محمد گورنر جنرل کے فیصلے کے سامنے وزیراعظم کو سرتسلیم خم کرنا پڑا اور نئی کابینہ کا سربراہ بننا بھی قبول کر لیا۔ لہٰذا دستور ساز اسمبلی کے اجلاس سے ۳ روز قبل ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔

دستور ساز اسمبلی جسے پاکستان کی مرکزی مقننہ کی حیثیت بھی حاصل تھی کے ٹوٹ جانے کے بعد کوئی مرکزی قانون ساز ادارہ نہ رہا۔ قانون سازی گورنر جنرل غلام محمد کے نافذ کردہ آرڈیننس کے ذریعے ہی ہونے لگی۔ محمد علی بوگرہ کے لیے جو نئی کابینہ تشکیل دی گئی اس میں کچھ غیر مسلم لیگی سیاست دان اور سرحدی ملازمین بھی شامل تھے۔ ان میں تین نے سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جن میں میجر جنرل اسکندر مرزا، جنرل محمد ایوب خان اور ڈاکٹر خان صاحب شامل تھے۔ ایوب خان کو وزیر دفاع بنایا گیا۔ میجر جنرل سکندر مرزا وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے چند یوم بعد ہی ایسے بیانات دینے شروع کر دیئے کہ پاکستان کے عوام پارلیمانی نظام یا جمہوریت کے اہل نہیں ہیں لہٰذا ملک میں کنٹرولڈ ڈیمو کریسی ہونی چاہیے۔ عوامی لیگ کے رہنما ایچ ایس سہروردی ان دنوں علاج کے سلسلے میں باہر تھے۔ گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ کر ان کا ایک مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ غلام محمد کی اب خواہش یہ تھی کہ سہروردی اور ان کی حمایت گورنر جنرل کی پالیسیوں اور حکومت کی حمایت کریں۔ اس مقصد کے لیے غلام محمد نے عوامی لیگ کے دو لیڈروں محمود الحق عثمانی اور عطاء الرحمن خان سے رابطہ پیدا کر لیا اور انھیں کہا کہ وہ سہروردی کو پاکستان کا وزیراعظم نامزد کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ عوامی لیگی رہنما ایک ایسا آئین نافذ کرائیں جو کہ گورنر جنرل کے گروپ کے سیاست دانوں کو قابل قبول ہو۔ گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ فی الحال سہروردی کو محمد علی بوگرہ کے ماتحت وزیر قانون کا عہدہ سنبھالنا ہوگا۔ یہ

بات آج تک حیران کن ہے کہ سہروردی جیسے جمہوری عمل پر یقین رکھنے والے لیڈر نے ایک غیر جمہوری عمل سے آئین سازی کا طریقہ کیسے قبول کر لیا اور ایک غیر جمہوری نظام میں وزیر قانون بنا کیسے پسند کیا؟

کہا جاتا ہے کہ سہروردی صاحب کو یہ باور کروا دیا گیا کہ اگر انہوں گورنر جنرل غلام محمد سے تعاون نہ کیا تو وہ ملک نظم و نسق فوج کے حوالے کر دیں گے۔ گورنر جنرل غلام محمد نے سہروردی سے وعدہ تو کر لیا کہ وہ انھیں وزارت عظمیٰ بخشیں گے لیکن سرحدی حلقوں میں سہروردی کے جنرل کے اس فیصلے سے متفق نہ تھے۔ آئی ایچ اصفہانی نے بھی کوشش کی کہ غلام محمد سہروردی کو وزیر اعظم بنانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ غلام محمد پر جنرل ایوب خان' سکندر مرزا اور اصفہانی کے مشورہ کا کس حد تک اثر ہوا کہ جب محمد علی بوگرہ کے جانشین کی تقرری کا لمحہ آیا تو غلام محمد شدید علالت کے باعث سیاست سے علیحدہ ہو گیا اور جبراً رخصت پر بھیج دیا گیا۔

پہلی دستور ساز اسمبلی کی برطرفی سے ۱۹۵۵ء تک محمد علی بوگرہ پاکستان کے برائے نام وزیر اعظم رہے۔ دوسری دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے بعد مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے انھیں قائد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور چودھری محمد علی کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ اسی وجہ سے غلام محمد کے جانشین نئے گورنر جنرل سکندر مرزا نے انھیں ایک مخلوط وزارت بنانے کی دعوت دی۔

پارلیمانی نظام کے کسی بھی دور میں کابینہ روایتی اصولوں اور معیار پر پورا نہ اتری۔ مسلم لیگ کے زوال کے علاوہ غلام محمد اور اسکندر مرزا کا کردار بھی پارلیمانی اداروں کی تباہی اور ناکامی کا سبب بنا۔ اگر پاکستان کے سیاست دان بے اصولیاں نہ کرتے اور آپس میں جھگڑے کی فضا پیدا نہ کرتے تو غلام محمد بھی اپنی من مانیاں نہ کر سکتے تھے۔ غلام محمد ور اسکندر مرزا کو اقتدار کی ہوس اس قدر زیادہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف سیاست دانوں کو چکمے دیئے' انھیں آپس میں لڑایا بلکہ ملک و قوم کی بھی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ محلاتی سازشوں کے ذریعے پارلیمانی نظام کو تباہ کر دیا۔

غلام مصطفیٰ کھر

ملک غلام مصطفیٰ کھر پاکستان کا واحد سیاست دان اور جاگیردار ہے جس کا نہ تو
کسی دوسرے سیاست دان سے اور نہ ہی کسی جاگیردار کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا
ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر کی شخصیت میں بیک وقت ایک چالاک سیاست دان' ایک متنازعہ
ترین گورنر اور وزیر اعلیٰ اور ایک عجیب و غریب رومانوی شخص کے اوصاف موجود
ہیں۔ اپنے دور اقتدار میں ملک غلام مصطفیٰ کھر کرپشن اور بدعنوانیوں کے الزامات کی
زد میں رہے۔ نارنگ منڈی میں سینکڑوں ایکڑ پر پھیلی ان کی جاگیر اور شکار گاہ بھی ان
کی شخصیت میں جاگزیں بدعنوانیوں اور موقع پرستی کی دلیل قرار دی جاتی رہی۔ نارنگ
منڈی کے علاقے میں چھپے ہوئے جرائم پیشہ عناصر کی پشت پناہی کا الزام بھی غلام
مصطفیٰ کھر کی ذات پر لگا اور ان جرائم پیشہ عناصر کے ایک گروہ کی دشمنی کے سبب
نوبت یہاں تک بھی پہنچ گئی کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے ڈیری فارم
اور کتوں کو بھی دیکھنے جاتے تو انہیں ہمت نہ ہوتی کہ وہ کالا خطائی روڈ پر سفر کر سکیں'
بلکہ غلام مصطفیٰ کھر بے نظیر حکومت سے استدعا کر کے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اپنے فارم
کے محفوظ ہیلی پیڈ پر اترتے۔ غلام مصطفیٰ کھر پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے بے
نظیر دور میں وفاقی وزیر بجلی و پانی کی حیثیت سے واپڈا کے ملکیتی دونوں سیسنا طیارے
ذاتی تحویل میں رکھے جبکہ ان طیاروں کے استعمال کے محکمانہ واچرز پر ہمیشہ چیئرمین
واپڈا اور واپڈا کے دیگر اعلیٰ حکام کے دستخط ہوتے رہے کہ وہ یہ طیارے استعمال کر

رہے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا اور انہیں کھر کے دور وزارت میں اجازت نہیں تھی کہ وہ ان طیاروں کے استعمال کے بارے میں سوچ بھی سکیں۔

اس کے علاوہ ملک غلام مصطفیٰ کھر ہر وقت بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ایجنٹ کے الزام کی زد میں بھی رہے اور ہر حکومت کی تشکیل کے وقت ہماری خفیہ ایجنسیاں ہمیشہ اپنی رپورٹوں اور دیگر حوالوں سے یہ کوششیں کرتی رہیں کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کوئی کلیدی اسامی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن غلام مصطفیٰ کھر کے کے پھیلے ہوئے اثر و رسوخ کا توڑ کرنا شاید ان ایجنسیوں کے بس کا روگ نہ تھا اور ہر بار مصطفیٰ کھر کامیاب قرار پاتے اور حکومتوں میں اہم ترین عہدے حاصل کرتے رہے۔

غلام مصطفیٰ کھر کی سابقہ بیوی تہمینہ درانی کھر خاندان کے پس منظر کے بیان میں اپنی مشہور کتاب "مینڈا سائیں" میں لکھتی ہیں "کھر خاندان کا تعلق پنجاب کے کھل قبیلے سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خطہ لاہور سے تعلق رکھنے والے کھروں کے ایک ٹولے نے ملتان میں گنے کے ایک کھیت کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے گنے کاٹ کر کچھ اپنے مویشیوں کو کھلا دیئے اور کچھ جوڑ جاڑ کر جھونپڑیاں بنا لیں۔ جب کھیت کے مالک نے گلہ کیا تو انہوں نے بھولپن سے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ گنا کسی قسم کا گھاس ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون ہیں تو انہوں نے فخر سے کہا کہ وہ کھل ہیں۔ بذلہ سنج مالک نے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "تم کھر ہو جس کے معنی فارسی میں گدھا کے ہیں"۔ یہ شاخ ملتان سے ضلع مظفر گڑھ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہو گئی"۔

مصطفیٰ کھر انتخابات میں اپنی ابتدائی کامیابیاں حاصل کرتے رہے اور سیاست دانوں خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی سے ان کا تعلق بڑھتا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی تو غلام مصطفیٰ کھر کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کھر کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون اے بھی بنا دیا گیا۔ بطور گورنر کھر نے اپنے اختیارات کا اندھا دھند استعمال کیا۔ ان کے زمانہ اقتدار کے دوران پولیس کی ہڑتال بھی ہوئی جو ملک کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے بعد

غلام مصطفیٰ کھر کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ مصطفیٰ کھر کی وزارت اعلیٰ کے دور میں مخالف سیاست دانوں پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا۔ بعض سیاست دانوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا گیا جس سے پیپلز پارٹی کی حکومت کی عوامی سطح پر بہت زیادہ بدنامی ہوئی۔ کھر بھٹو کے ساتھ مل کر سیاسی مخالفین کو مغلوب کرنا چاہتے تھے یا پھر ان کا خاتمہ چاہتے تھے۔

ایک موقع ایسا بھی آ گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو یہ یقین ہو گیا کہ غلام مصطفیٰ کھر ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ بھٹو جو کہ ایک منتقم مزاج آدمی تھا' اس نے کھر کے اردگرد ایسے آدمی مقرر کر دیئے جو کھر کی سرگرمیوں کو چیک کرتے۔ اس دوران بعض خفیہ اداروں نے بھی غلام مصطفیٰ کھر کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔

۱۹۷۳ میں پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے دوران وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پنجاب کے دورے پر آئے۔ مسٹر غلام مصطفیٰ کھر وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تھے۔ جھنگ میں بھٹو کی آمد کے موقع پر استقبال کے لیے آنے والے لوگوں نے قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعروں کے ساتھ ساتھ جب شیر پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کیے تو بھٹو نے قریب کھڑے ایس پی جھنگ کو حکم دے دیا کہ وہ کارکنوں پر لاٹھی چارج شروع کرا دے۔ ایس پی جھنگ نے وزیر اعظم کے حکم کی تعمیل کرنا چاہی تو غلام مصطفیٰ کھر نے نہایت غصے کے عالم میں ایس پی سے ڈنڈا چھین کر اسے بری طرح جھڑک دیا۔ اسی روز سے سیاسی حلقوں میں یہ تاثر پھیلا کہ مصطفیٰ کھر بہت جلد اقتدار سے رخصت ہونے والے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد غلام مصطفیٰ کھر ذوالفقار علی بھٹو کی بنی ہوئی حکمت عملی کا شکار ہو کر اقتدار سے دور جا گرے۔ بھٹو نے محمد حنیف رامے کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا اور غلام مصطفیٰ کھر کو گورنر پنجاب لگا دیا۔ جب دونوں اصحاب میں محاذ آرائی اپنے عروج کو پہنچ گئی تو دونوں کو سبکدوش کر دیا۔

بھٹو حکومت کے خاتمہ کے وقت غلام مصطفیٰ کھر نے فوجی حکام کو تاثر دیا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ہیں۔ اس وقت پیپلز پارٹی کے حامی عناصر نے بیرون

ملک بیٹھ کر جنرل ضیاء کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کر دیا تھا۔ مسٹر کھر کو اس وقت جاری محاذ آرائی کو ختم کرانے کے لیے لندن بھیجا گیا مگر وہ لندن پہنچتے ہی مارشل لاء حکومت کے خلاف ہو گئے۔ کھر نے جنرل ضیاء کے خلاف محاذ آرائی کے لیے مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا اور ضیاء کے خلاف پاکستان میں مسلح بغاوت کرانے کی منصوبہ بندی بھی کی مگر یہ راز زیادہ دیر تک چھپایا نہ جا سکا۔ مارشل لاء کی قائم کردہ ایک عدالت میں کھر کو ان کی غیر حاضری میں سزا بھی سنائی گئی۔ کھر ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپس پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ جونیجو کھر کی رہائی کے حق میں تھا لیکن ضیاء کے لیے کھر کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ بعض اہم سیاسی شخصیات نے کھر کی رہائی کے لیے ضیاء کے ساتھ گفتگو کی تو ضیاء الحق نے جواب دیا کہ کھر میرا دشمن ہے اور یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی کی قیادت کے لیے مصطفیٰ کھر کا وجود ناقابل برداشت تھا۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں غلام مصطفیٰ کھر نے دو حلقوں سے کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی ایک خالی کردہ نشست غلام مصطفیٰ جتوئی کو دے دی۔ جلد ہی پیپلز پارٹی سے اختلاف کی خبریں منظر عام پر آنے لگیں۔ بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم بنائے گئے تو غلام مصطفیٰ کھر ان کی کابینہ میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔

۱۹۹۰ء میں غلام مصطفیٰ کھر نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیا۔ مصطفیٰ کھر نے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی ایک سیٹ حاصل کر لی۔ بعد ازاں کھر نے قومی اسمبلی کی ایک اور صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کر دی۔ نواز شریف حکومت کے دوران ملک غلام مصطفیٰ کھر اپوزیشن (پیپلز پارٹی) کا ساتھ دیتے رہے۔ نواز شریف حکومت کے خاتمے پر انہوں نے چوتھی مرتبہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۹۰ء کی طرح ۱۹۹۳ء میں بھی غلام مصطفیٰ کھر نے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی ایک نشست سے کامیابی حاصل کی اور بے نظیر حکومت میں وفاقی وزیر بجلی و پانی کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔

غلام مصطفیٰ کھر پر فوج کی خفیہ ایجنسیاں یہ الزام لگاتی رہیں کہ وہ بھارتی خفیہ

ایجنسی "را" کا ایجنٹ ہے۔ جس نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء تک کئی بار اندرا گاندھی اور پھر راجیو گاندھی سے ملاقاتیں کی تھیں۔ جس نے پاکستانی فوجی افسروں کے ایک ناراض گروپ کے ساتھ مل کر صدر ضیاء الحق کو قتل کرنے کے لیے "را" کے ایک ناکام منصوبے میں شرکت کی تھی اور پھر لندن میں بعد ازاں اس ادارے کا سربراہ بن جانے والے را کے کارندے جوشی سے سینکڑوں بار ملا تھا۔

پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے کھر کے بارے میں ثبوت اس وقت اکٹھے کرنا شروع کیے جب انہیں شک ہوا کہ وہ ستمبر۱۹۸۱ء میں اپنی اہلیہ' اپنے بھائی میلادی کھر' میلادی کھر کی بیگم اور اپنے دوست ماجد پرویز کے ساتھ بھارت گیا۔ خفیہ ایجنسیوں کے ذرائع کے مطابق بھارتیوں نے سب سے پہلے کھر کی ضرورت ۱۹۸۰ء میں محسوس کی جب وہ دو پاکستانی جرنیلوں راؤ عرفان علی اور جنرل چشتی کو چکمہ دے کر لندن چلا گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب بلوچ سردار عطا اللہ مینگل' ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ سے پاکستان کو ایک کنفیڈریشن بنانے کا منصوبہ لے کر لندن میں مصطفیٰ کھر کے فلیٹ پر گئے۔ دو ٹوک الفاظ میں مصطفیٰ کھر نے اس منصوبے کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔

مصطفیٰ کھر اس وقت مالی اعتبار سے پریشان اور سیاسی طور پر ایک ناکام آدمی تھا۔ اگرچہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے بیٹے مرتضیٰ بھٹو کو شیشے میں اتار کر آکسفورڈ یونیورسٹی سے لندن لے آیا تھا۔ لیکن نصرت بھٹو اور بے نظیر غلام مصطفیٰ کھر کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ مصطفیٰ کھر اس وقت غلام مصطفیٰ جتوئی سے ملنے والی دو ہزار پاؤنڈ ماہانہ کی رقم اور جام صادق علی کی مہربانیوں سے لندن میں اپنا وقت کاٹ رہا تھا کیونکہ پاکستان میں اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی گئی تھی۔

اگرچہ مصطفیٰ کھر کی اہلیہ نے اپنی کتاب میں مصطفیٰ کھر کے بھارت میں رابطوں کی تصدیق کر دی لیکن کھر ہمیشہ اس معاملے پر خاموشی اختیار کیے رہے۔ اس کے علاوہ مشہور جریدے اکانومسٹ کے ایک مضمون میں غلام مصطفیٰ کھر کے ڈانڈے بھی بھارت کے ساتھ ملانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ واضح رہے کہ اس مضمون میں کھر نے پاکستانی فوج کی قوت کم کرنے پر زور دیا تھا۔

انہی دنوں پاکستان میں صدر ضیاء الحق شرکت اقتدار کے ایک منصوبے پر غور

و خوش شروع کر چکے تھے۔ وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بٹھانا چاہتے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بار بار صدر ضیاء الحق سے کہتے رہے کہ غلام مصطفیٰ کھر کو معاف کر دیا جائے اور اس کو حکومت میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا جائے لیکن ضیاء الحق کبھی اس پر آمادہ نہ ہو سکے۔

ایک موقع پر تو اختر عبدالرحمن غلام مصطفیٰ کھر کو معاف کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے جن کے پاس کھر کی اہلیہ بار بار یہ پیغام لے کر گئی کہ کھر رائے عامہ میں 'اقتدار میں پاکستانی فوج میں شرکت کرنے کا مقدمہ لڑنے پر آمادہ ہے اور اس کے خفیہ حلیف کی حیثیت سے سیاست پر تیار ہے۔ جنرل اختر کے نزدیک یہ خسارے کا سودا نہیں تھا کہ کھر جیسا چالاک اور پرجوش سیاست دان ان کے ساتھ آملے۔ لیکن وہ بھی صدر ضیاء الحق کو قائل نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ وہ موقع آگیا جب غلام مصطفیٰ جتوئی نے اس وقت کھر کو تنہا چھوڑ کر نگران وزیراعظم بننے کا فیصلہ کر لیا جب اوجڑی کیمپ کے سانحہ کے بعد محمد خان جونیجو کو وزارت اعظمیٰ سے الگ کیا جا چکا تھا۔ مصطفیٰ کھر اس پر انتہائی دل گرفتہ تھے۔ راولپنڈی کی اڈیالہ جیل میں ان کا ایک ذاتی دوست انہیں ملنے گیا تو وہ رو پڑے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ عمر بھر کی دوستی تھی"۔

اسلم بیگ نے ضیاء الحق اور اختر عبدالرحمن کی موت کے بعد مصطفیٰ کھر کو رہا کرنے کا سگنل دے دیا اور ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق نے اسلم بیگ سے سوال کیا کہ انہوں نے کھر کو کیوں رہا کر دیا ہے تو اسلم بیگ کا جواب تھا "کسی وقت کام آئے گا"۔ اسلم بیگ کا یہ جواب سچ ثابت ہوا اور بے نظیر حکومت کے خاتمے میں مصطفیٰ کھر نے اہم کردار ادا کیا اور جتوئی کی نگران حکومت میں وزیر داخلہ بن گئے۔

۹۳ء میں جب بے نظیر بھٹو کی دوبارہ حکومت آئی تو ملک غلام مصطفیٰ کھر اس بار بجلی و پانی کے وفاقی وزیر بن گئے۔ یہاں سے مصطفیٰ کھر کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ چونکہ ملک غلام مصطفیٰ کھر نے جتوئی نگران حکومت میں سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ ضلع شیخوپورہ کے علاقے نارنگ منڈی میں ہندوستانی سرحد کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۰ ایکڑ اراضی الاٹ کرالی۔ پھر اس کے بعد ۹۳ میں وفاقی وزیر بننے کے بعد کھر نے جلو پارک لاہور سے ملحق ۵۰ ایکڑ اراضی بھی کوڑیوں کے مول خرید لی۔

کالا خطائی روڈ پر لاہور سے نارنگ منڈی کی طرف جاتے ہوئے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر اولیا پور نامی گاؤں میں غلام مصطفیٰ کھر نے اپنا زرعی فارم اور ڈیری فارم بنا لیا۔ کالا خطائی روڈ سے جنوب کی طرف تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر کھر کا زرعی فارم واقع ہے۔ کھر نے اپنے دور اقتدار میں ۵ کلومیٹر طویل پختہ سڑک تعمیر کرائی۔ چونکہ یہ علاقہ دریائے راوی کے بہاؤ کی زد میں رہتا ہے اس لیے کھر صاحب کی خواہش پر جو سڑک ان کے زرعی فارم کو کالا خطائی روڈ سے ملانے کے لیے تعمیر کی گئی اسے ۵ فٹ تک زمین کی سطح سے اونچا رکھا گیا اور اتنی ہی اونچائی کے ساتھ ۲۲ فٹ تک اس سڑک کو چوڑا کیا گیا۔ اس سڑک پر ۵۰ لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ ہوئی جو کہ ضلع شیخوپورہ کے ترقیاتی فنڈز سے ادا کی گئی۔ جب یہ سڑک اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں تھی تو مصطفیٰ کھر کے ڈیرے سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے اس کی تعمیر کو فوج نے رکوا دیا۔ فوج کی خفیہ ایجنسیوں کے مطابق چونکہ مصطفیٰ کھر کا ڈیرہ بھارتی سرحد کے بالکل قریب واقع ہے اس لیے ڈیرہ تک پختہ سڑک لے جانا ملکی دفاعی نقطہ نظر سے خطرناک ہو سکتا تھا۔ مصطفیٰ کھر پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ انہوں نے دریا برد گاؤں تلونڈی شیر خان کی کل اراضی ۵۵ مربع میں سے ۲۰ مربع اراضی بیچ لی اور باقی ماندہ ۳۵ مربع اراضی پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ مذکورہ اراضی کے مالک غریب زمینداروں میں ہمت نہیں کہ وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر سے ٹکر لے سکیں یا مذکورہ دریا برد اراضی پر لاکھوں روپے خرچ کر کے اسے دوبارہ قابل کاشت بنا سکیں۔ اس لیے انہوں نے غلام مصطفیٰ کھر کے خلاف کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔

غلام مصطفیٰ کھر نے تمام اراضی پر اپنے آبائی علاقے مظفر گڑھ کے مسلح افراد کو بٹھا دیا اور اس ساری اراضی کے کاغذات ملکیت تیار کر کے غریب کاشت کاروں سے دستخط کرا لیے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس تمام اراضی کی قیمت ۲ سے ۳ ہزار روپے فی ایکڑ درج کی گئی۔ حالانکہ زرعی علاقوں میں جہاں بھی کوئی شخص کسی زمیندار سے زمین خریدتا ہے تو اس کی کاغذات میں جو قیمت ظاہر کرتا ہے وہ اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مصطفیٰ کھر نے زمین کے ملکیتی کاغذات میں جو قیمت درج کی وہ بھی بہت کم ہے اور جو اصل قیمت ہوگی اس کے بارے میں محض اندازہ ہی

لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۲ کے آغاز میں غلام مصطفیٰ کھر نے نارنگ منڈی کی ان زمینوں پر کاشتکاری کا ابتدائی کام شروع کیا لیکن دریا بردگی کے باعث تمام اراضی پر چار سے پانچ فٹ تک مٹی اور ریت کی تہہ چڑھ گئی تھی جس کے باعث یہ زمین ناقابل کاشت بن گئی۔ اس ساری زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے غلام مصطفیٰ کھر کو بہت زیادہ سرمائے اور مشینری کی ضرورت تھی۔ اس وقت کھر صاحب کی بجلی و پانی کی وزارت کام آئی اور انہوں نے مقامی واپڈا ڈویژن کی تمام مشینری اور افرادی قوت اپنے فارم پر اراضی کو قابل کاشت بنانے کے لیے جھونک دی۔ شروع میں تقریباً ۱۱۲۵ ایکڑ پر واپڈا کے ٹریکٹروں اور بلڈوزروں کی مدد سے چار پانچ فٹ تک چڑھی ریت اور مٹی (ریتا) کی تہہ اتاری گئی۔

کھر کے فارم پر کام کرنے والی مشینری کے لیے پٹرول واپڈا کے قریبی پٹرول پمپ سے آتا رہا اور ایک اندازے کے مطابق ۱۰ لاکھ روپے صرف مشینری کے پٹرول اور مرمت کی مد میں خرچ ہو گئے۔ اس طرح دو سال کی محنت کے بعد کھر فارم کی ۸۵ فیصد اراضی دوبارہ قابل کاشت بنا دی گئی۔ فارم پر لگے ٹیوب ویلوں کو خصوصی طور پر ایک نئی سپلائی لائن لگوا کر بجلی کا کنکشن دیا گیا۔

کھر نے فارم کے ایک وسیع حصے پر شکارگاہ بنوائی اور اس میں ہرن اور دوسرے جانور چھوڑے گئے۔ آہستہ آہستہ علاقے میں طاقت کا توازن کھر کی طرف جھکنا شروع ہوا اور غلام مصطفیٰ کھر نارنگ منڈی کے طاقتور ترین جاگیردار بن گئے۔ چونکہ نارنگ منڈی کو ہمیشہ سے جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ کہا جاتا رہا ہے اس لیے کھر فارم پر بھی علاقے کے مفرور اور جرائم پیشہ افراد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔

بعض ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ مصطفیٰ کھر نے اپنے زرعی فارم کی توسیع کے لیے مقامی گاؤں وحید چک کے مشہور سمگلر اور پیشہ ور اجرتی قاتل گجر گروپ کو پناہ دے رکھی ہے۔ وحید چک کے ارشد، ذوالفقار اور صفدر گجر وغیرہ کی دیرینہ دشمنی دریا بند گاؤں اولیاء پور کے رحمٰن عرف میاں بھیڈو (نارنگ منڈی کا سب سے مشہور اور خطرناک اسمگلر) کے بیٹے اصغر عرف بوگی کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ دونوں گروپوں

میں جاری اس بیس سالہ پرانی جنگ میں درجنوں افراد قتل ہو چکے ہیں۔ ارشد گجر بھی دو مقدمات میں سزائے موقت پانے کے بعد جیل سے فرار ہو کر مصطفیٰ کھر کے زرعی فارم میں پناہ گزین ہے۔ ارشد گجر کا مخالف اصغر یوگی نارنگ منڈی کے بااثر ترین گروپ ڈوگرا گروپ میں شامل ہے۔

ارشد گجر مصطفیٰ کھر کی ایماء پر لاہور کے ایک رہائشی میاں اسلم کی ملکیتی ۲۰۰ ایکڑ اراضی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جو کھر کے زرعی فارم کے ساتھ واقع ہے۔ ارشد گجر وغیرہ نے میاں اسلم کی گندم کی فصل بھی اٹھالی جس کا مقدمہ ارشد اور مصطفیٰ کھر وغیرہ کے خلاف درج کرایا گیا۔ مصطفیٰ کھر نے جواب میں ڈوگرا گروپ کے خلاف مقدمہ درج کرانے کا حکم دیا لیکن ایس ایچ او تھانہ نارنگ منڈی نے صاف انکار کر دیا جسے مصطفیٰ کھر نے گورنر پنجاب راجہ سروپ کی وساطت سے لائن حاضر کرا دیا۔ مصطفیٰ کھر پر الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ ڈوگرا گروپ کے افراد کو پولیس مقابلے میں مروانا چاہتا تھا جبکہ ایس ایچ او نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس کی اس کو کڑی سزا دی گئی۔

ڈوگرا گروپ کی عسکری قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس گروپ نے براہ راست مصطفیٰ کھر کو قتل کی دھمکی دے دی اور مصطفیٰ کھر جو وزیر بجلی و پانی تھے ہر جمعرات کو اپنے فارم پر آتے تھے۔ انہوں نے سڑک کے ذریعے سفر کرنا ترک کر دیا اور بے نظیر سے خصوصی طور پر ایک ہیلی کاپٹر حاصل کیا جو ہر ہفتہ مصطفیٰ کھر کو ان کے فارم پر عارضی طور پر بنائے گئے ہیلی پیڈ پر اتارتا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ملک غلام مصطفیٰ جتوئی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے سیاست دان ہیں جو ہوا کا رخ دیکھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ سیاسی لحاظ سے ابن الوقت غلام مصطفیٰ جتوئی کا سیاسی مزاج بالکل جاگیردارانہ ہے اور جاگیر کے لحاظ سے وہ ایشیاء کے تقریباً سب سے بڑے جاگیردار تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے کبھی بھی خسارے کی سیاست کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ کونسل سے اپنی سیاست کا آغاز کیا اور ملک کے سب سے بڑے سیاسی و انتظامی عہدے تک جا پہنچے۔ کبھی غلام مصطفیٰ جتوئی بیک وقت دو دو نشستوں پر انتخابات جیت جاتے ہیں اور کبھی ایک نشست بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی ''لوٹا کریسی'' جیسی سیاسی بدعت کا ارتکاب متعدد دفعہ مصطفیٰ جتوئی صاحب نے کیا لیکن اپنے لیے ہر دفعہ کسی نہ کسی سیاسی پلیٹ فارم پر جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ اس ملک کی یہ روایت بن چکی ہے کہ سیاسی ہمدردیاں تبدیل کرنا کوئی اخلاقی یا معاشرتی جرم نہیں لہٰذا اکثر سیاست دان ایسا کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے جس سے ابھی تک کسی واضح سیاسی سفر کا آغاز نہیں ہو سکا اور کوئی حتمی رائے سیاست دانوں کے سیاسی کردار کے بارے میں قائم نہیں کی جا سکتی۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کا تعلق سندھ میں آباد مشہور قبیلے جتوئی سے ہے جس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ ایک مورخ کے مطابق ''جتوئی

ایک قدیم قبیلہ ہے جو سندھ بلوچستان اور جنوبی پنجاب کے کچھ اضلاع میں آباد ہے"۔
ایک روایت یہ بھی ہے کہ جتوئی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جتو سے مشتق ہے۔ جتو ایک عورت کا نام تھا جو جاٹ تھی اور اس کی شادی ایک رند سے ہوئی۔ اس قبیلہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا خون خالص نہیں ہے۔ لوک گیتوں میں جیسا کہ قبائلی سماج میں عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ایک قبیلہ اپنے خون اور بہادری سے دوسروں سے اعلیٰ ہونے کا مزہ لیتا ہے۔ یہ رسم ماضی قریب تک پنجاب کے کچھ علاقوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ دراصل اس کا آغاز عرب قبائل سے ہوا۔

ایک تاریخ دان کے مطابق جتوئی قبیلے کی تاریخ مائی جتو سے شروع ہوتی ہے جو اس وقت کے مورث اعلیٰ میر جلال خان کی بیٹی اور رند' لاشا اوہوت کی بہن تھی۔ محمد حیات خان بیدار' بلوچ' تواریخ بلوچستان میں جتوئی کو جلال خان کی بیٹی کی بجائے بیٹا قرار دیتے ہیں اور اپنے حوالے کی صداقت کے لیے بیان کرتے ہیں کہ بلوچوں میں قبیلوں کے نام عورتوں کے نام پر نہیں ہوتے۔ کچھ مورخین کے مطابق جتوئیوں کا سلسلہ عرب قبیلے الزت سے جڑتا ہے جو مسلم فوج کے ساتھ سندھ سے ترک وطن کر کے عراق چلا گیا تھا۔ وہاں پر ان کو زمین الاٹ ہونے کے علاوہ بیت المال کا محافظ بھی مقرر کر دیا گیا۔

سیاست میں جتوئی قبیلے کا عمل دخل حاجی امام بخش جتوئی سے شروع ہوتا ہے جو غلام مصطفیٰ جتوئی کا دادا تھا۔ امام بخش جتوئی ۱۸۸۱ء میں گوٹھ ملک تعلقہ مور میں پیدا ہوئے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا۔

ان کے تعلقات انگریزوں سے بڑے خوش گوار تھے۔ وہ انگریزوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اور انگریزوں کی قرابت نے ان کی اعلیٰ انگریزی حکام تک رسائی آسان بنا دی اور وہ اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات حاصل کیے۔ وہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک بمبئی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ انہوں نے سندھ اسمبلی کے لیے بھی انتخاب لڑا مگر ناکام ہو گئے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔

ان کی وفات کے بعد ان کا سیاسی ورثہ اکلوتے بیٹے غلام رسول جتوئی کو ملا۔

وہ بھی سیاست میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے اور دو مرتبہ ۱۹۴۶ء - ۱۹۵۳ء میں اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ قائم ہونے سے سیاسی معاملات غلام مصطفیٰ جتوئی نے سنبھال لیے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ۱۹۵۶ء سے پہلے ضلع کونسل نواب شاہ کے چیئرمین تھے اور بعد ازاں پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۶۳ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے محمد علی بوگرہ کے بعد پورے ملک میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔

ذوالفقار علی بھٹو سے قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ کنونشن مسلم لیگ میں رہے اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں پیپلز پارٹی قائم ہوئی تو کھر اور ممتاز علی بھٹو کے ساتھ جتوئی بھی اس میں شامل ہوگئے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے پی پی پی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور ذوالفقار علی بھٹو کی مرکزی کابینہ میں شامل ہوگئے۔ ان کے پاس مواصلات' ریلوے' بندرگاہیں' جہاز رانی' آب پاشی' بجلی اور گیس کے محکمے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں سندھ میں لسانی فسادات نے سر اٹھایا تو ممتاز بھٹو اس پر قابو نہ پا سکے جس پر ذوالفقار علی بھٹو نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو سندھ کی وزارت اعلیٰ کا قلمدان سونپ دیا۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اپنے بھائی کی خالی کردہ نشست پر الیکشن جیت کر یوں سرکاری کارروائی کو پورا کیا گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو سندھ کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی بلا مقابلہ سندھ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور متفقہ طور پر وزیر اعلیٰ بن گئے۔ ان کی وزارت اعلیٰ کا دور ۳ سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی پی پی پی اور ذوالفقار علی بھٹو کے اتنے قریب ہونے کے باوجود ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء میں ضیاء الحق کے غضب سے صرف اس لیے بچ گئے کہ وہ ایک ایسے موقع شناس سیاست دان ہیں جو ہمیشہ دوغلی پالیسی کے حق میں رہے ہیں۔

اگست ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے ایک الیکشن "سیل" تشکیل دیا جس کے ذمہ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کے انتظام کو فعال بنانا تھا۔ اس سیل کے انچارج جنرل فیض علی چشتی تھے۔ اس سیل میں جن سیاسی شخصیات نے فوجی حکام سے ملاقات

کی' ان میں دوسرے نمبر پر مصطفیٰ کھر اور تیسرے نمبر پر غلام مصطفیٰ جتوئی تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کی دور اندیشی نے مارشل لاء لگانے والوں کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا اور وہ مستقبل میں کسی پیش آنے والی پریشانی سے بچنے کے لیے ان سے پینگیں بڑھانے لگے۔ چونکہ اس وقت پیپلزپارٹی کے چیئرمین نظربند تھے اس لیے غلام مصطفیٰ جتوئی کھر کے ذریعے فوج سے اپنے تعلقات پختہ کر کے پی پی پی کی قیادت خود سنبھالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا غلام مصطفیٰ کھر نے جنرل چشتی کے دفتر میں جتوئی صاحب کی اور چشتی کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ یہ ملاقات غالباً ۲۵ اگست ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔ اس ملاقات میں دونوں قومی رہنماؤں نے مارشل لاء والوں کے حوصلے بلند کر دیئے اور ترکی کی طرح فوج کو آئینی لحاظ سے مضبوط کرنے پر زور دیا تاکہ اپنے آپ کو محفوظ کر سکیں۔ اس کھیل میں بھی جتوئی صاحب مخلص نہ تھے۔ یہ صرف وقتی طور پر صورت حال واضح ہونے تک وقت گزارنے کے حیلے بہانے تھے اور جتوئی صاحب اس وقت کے انتظار میں تھے کہ پی پی پی اور مارشل لاء (ضیاء الحق) دونوں پلڑوں میں سے جو بھی بھاری ہوگا' وہاں پناہ لے لی جائے گی۔

فوج کو یہاں تک پیشکش کی گئی کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو راستے سے ہٹا دیں۔ پھر ہم پی پی پی میں موجود دائیں بازو کے عناصر کو اپنے ساتھ ملا کر دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد کر کے بہتر طور پر آپ کا ساتھ دے سکیں گے۔ اس اتحاد میں جتوئی صاحب کو وزیراعظم بنانے کی تجویز بھی طے پا گئی۔

اس کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کی جلاوطنی کے بہانے پیپلزپارٹی کی قیادت بھی کرتے رہے اور ساتھ ساتھ مارشل لاء حکام سے بھی ملتے رہے۔ ۱۹۸۳ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے ایم آر ڈی کی بھی قیادت کی۔ اپنی سیاسی ہمدردیاں صرف اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی دوسری مثال غلام مصطفیٰ جتوئی کی اس وقت ملتی ہے جب انہوں نے ضیاء الحق کے کہنے پر ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کے اکابرین کو الیکشن کا بائیکاٹ کرنے کا کہا۔

۱۹۸۶ء میں جب بے نظیر بھٹو پاکستان آئیں تو انہوں نے سندھ میں پیپلزپارٹی کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں جو جتوئی صاحب کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔

کچھ عرصہ بیرون ملک گزارنے کے بعد جتوئی نے واپس آکر سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا تو پی پی پی کی ہائی کمان مارشل لاء حکام سے رابطے رکھنے کی وجہ سے جتوئی سے نالاں ہوچکی تھی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی الگ سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جتوئی صاحب کی نیشنل پیپلز پارٹی کو شروع شروع میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی لیکن بعد میں پس پردہ چلی گئی۔

مئی ۱۹۸۸ء میں قائم ہونے والے اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ بھی غلام مصطفی جتوئی تھے۔ سندھ میں پی پی پی کو اس قدر عروج حاصل ہوچکا تھا کہ جتوئی صاحب کو دونوں سیٹوں سے بالترتیب ۳۱ اور ۱۵ ہزار کے ووٹوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۸۸ء میں قائم ہونے والی قومی اسمبلی میں غلام مصطفی جتوئی کی عدم موجودگی کو کھرنے اپنے حلقہ سے ضمنی انتخاب میں کامیاب کروا کے ماضی میں کیے گئے احسانات کو واپس کر دیا۔ اگرچہ اس فیصلہ سے پی پی پی اور اسلامی جمہوری اتحاد میں تشویش کی لہر پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح جون ۱۹۸۹ء کو جتوئی متحدہ اپوزیشن لیڈر بن گئے۔ بے نظیر حکومت کے خلاف عدم اعتماد پیش کرنے میں غلام مصطفی جتوئی کو جب ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اسلام آباد رابطہ کر کے حکومت ختم کرانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ ۱۹۹۰ء میں بے نظیر کی حکومت کے خاتمے پر ان کو نگران وزیراعظم بنا دیا گیا۔

نگران دور حکومت میں جتوئی نے میاں نواز شریف کو کامیاب کرانے کے لیے مبینہ طور پر دھاندلی کرائی۔ کیونکہ نواز شریف نے جتوئی سے وعدہ کیا تھا کہ انتخابات کے بعد وزیراعظم وہی رہیں گے مگر الیکشن کے بعد میاں نواز شریف نے جتوئی کو گھاس تک نہ ڈالی۔ اس پر جتوئی نے خود کہا کہ میں حیران ہوں کہ "تو شہرو فیروز" میں کیسے کامیاب ہوگیا۔ ۱۹۹۳ء میں جب اسحاق خان نواز شریف کی حکومت برطرف کرنے والے تھے تو غلام مصطفی جتوئی صدر کے کیمپ میں شامل ہوگئے تاکہ نگران وزیراعظم بن سکیں مگر صدر اسحاق نے بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم بنانا بہتر سمجھا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں الیکشن کمیشن نے غلام مصطفی جتوئی اور ان کے بیٹے کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے۔ کیونکہ وہ نادہندہ تھے۔ بطور وزیر اعلیٰ اور (۹۰) دن کے

نگران وزیراعظم جتوئی نے کرپشن کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ سندھ میں وزارت اعلیٰ کے دوران وہ جام صادق کے ساتھ مل کر اپنی "شامیں رنگین" کیا کرتے تھے اور اس بات کا اقرار خود جام صادق کئی مرتبہ کر چکے تھے کہ دن کا اجالا ختم ہوتے ہی اعلیٰ شراب اور خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ محفلیں سجائی جاتی تھیں جبکہ جتوئی نے لاتعداد پلاٹ خوبصورت عورتوں کو الاٹ کیے۔ ان خوبصورت عورتوں کی خدمات کے صلے میں الاٹ کیے جانے والے پلاٹوں اور نقد انعامات سے ان کے قریبی رشتہ داروں تک کی قسمتیں کھل گئیں۔ کراچی کی ایک عورت نسرین منہاس اور اس کے قریبی رشتہ داروں کو بہت سے پلاٹ الاٹ کیے۔

دین محمد نامی شخص کے ذریعے لائی جانے والی ایک خوبصورت خاتون کو کلفٹن سکیم نمبر ۵ کے بلاک نمبر ۲ میں ایک ہزار گز کا پلاٹ نمبر ڈی (۱۰۳) گلشن اقبال سکیم نمبر ۲۴ کے بلاک نمبر ۳ میں چھ سو گز کا پلاٹ نمبر (س ۹۶) اور شمالی کراچی کے سیکٹر (۱) بی میں چار سو گز کا پلاٹ نمبر بی (۱۹۳) الاٹ کیا۔ نسرین ہی کی ایک رشتہ دار خاتون زرینہ منہاس کو تین پلاٹ الاٹ کیے۔

جتوئی نے ایک خاتون کو اس کی خدمت کے صلے میں تین پلاٹ الاٹ کیے اور اس کے چھوٹے بیٹے کو دو پلاٹ ایک (۶) سو گز کا دوسرا ۳ سو گز کا الاٹ کیا۔

جتوئی صاحب نے اسلام آباد میں شکیلہ بیگم اور رشید محمود نامی شخص کو پلاٹ الاٹ کیے۔ جتوئی جب سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے تو کراچی کے ہوٹلوں میں جسم فروشی کا دھندہ عروج پر ہوتا تھا۔ شراب عام مل جاتی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں ترکی قونصل خانے نے حکومت سے شکایت کی کہ ایک مقامی ہوٹل میں ترکش لڑکیوں سے زبردستی جسم فروشی کروائی جاتی ہے جس پر ہوٹل میں چھاپہ مار کر ترکش لڑکیوں کو برآمد کر لیا گیا اور تاج ہوٹل کے مالک اڈوانی کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس کی اطلاع بھٹو کو ملی تو انھوں نے کراچی کے تمام ہوٹلوں کو شراب اور بدکاری سے پاک کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت تاج اور ڈیلکس ہوٹل بدکاری کے سب سے بڑے مرکز تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اس وقت ملک سے باہر تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے اڈوانی کی رہائی کا حکم جاری کر دیا۔

سندھ میں امن و امان کی صورت حال بگاڑ کر سیاسی وڈیرے حکومت کو بلیک میل کرتے رہے۔ ان وڈیروں میں جتوئی کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے صوبے میں جرائم پیشہ افراد کی ناصرف سرپرستی کی بلکہ خود شامل رہے۔ بلکہ اپنے ڈیروں پر بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کے افراد کو پناہ دی اور جاسوسوں کی ہر ممکن مدد کی۔ یہ سب کچھ کر کے وہ حکومت پر ظاہر کرتے تھے کہ امن امان کی صورت حال کو وہی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ جتوئی علاقے میں چوری' ڈاکے اور قتل کی وارداتیں کرواتے اور ان افراد کو وہ اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف بھی استعمال کرتے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے دور حکومت میں اپنے تمام چاہنے والوں کو نوازنے کی بھرپور کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں جتوئی کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

نگران وزیراعظم کے دور میں انہوں نے اسلام آباد میں ۲۷۰ پلاٹ الاٹ کر کے بہادری کی مثال قائم کی۔ اس کے علاوہ غلام مصطفیٰ کھر سے اپنی دوستی نبھانے کا حق بھی ادا کر دیا اور غلام مصطفیٰ کھر کی مہربانیوں کا بدلہ چکا دیا۔

۹۰ دن پورے ہونے کے بعد میاں نواز شریف کے ساتھ تعلقات خراب ہوتے گئے تو میاں نواز شریف نے جتوئی کی جاسوسی کرائی اور وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے' وہاں سے جاسوسی کے آلات برآمد ہوئے جس پر جتوئی نے خوب شور مچایا۔ اس بناء پر جتوئی کے بیٹے کی وفاقی کابینہ میں شمولیت بھی ختم ہو گئی کیونکہ جتوئی اپنے بیٹے کو سندھ کا وزیراعلیٰ بنانا چاہتے تھے۔ مگر نواز شریف نے ان کو گھر واپس بھیج دیا جس کے بعد جتوئی بے نظیر بھٹو کے کیمپ میں چلے گئے۔ جبکہ سندھ میں نواز شریف ہی نے الطاف حسین کو جتوئی کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا تھا۔

سید غوث علی شاہ

۷۰ کی دہائی میں سندھ سے تعلق رکھنے والے جن سیاست دانوں نے اپنے آپ کو قومی سیاست میں متعارف کروایا ان میں سید غوث علی شاہ کا نام بھی شامل ہے۔ سید غوث علی شاہ کے پاس ان کی سیاسی زندگی میں دو ایسے مواقع آئے جب ان کو سیاسی من مانی کرنے کا موقع ملا۔ پہلا موقع ان کے پاس سندھ کے وزیر اعلیٰ کے طور پر تھا جبکہ دوسرا موقع جب وہ وزیر دفاع بنے اور وزارت دفاع کے دوران ہی انہوں نے مالی بدعنوانی کا ارتکاب بھی کیا۔

سید غوث علی شاہ سندھ کے ضلع خیرپور سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے متوسط درجے کے سید خاندان میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی زندگی میں بہت زیادہ محنت کر کے اپنے آپ کو سیاست جیسے پیشے سے منسلک کیا۔ شروع شروع میں ان کے تعلقات پیر پگاڑا سے بہت اچھے رہے مگر پگاڑا صاحب غوث علی شاہ کی انتخابات میں بار بار ناکامیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اس طرح ۱۹۸۷ء میں ان کے اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ غوث علی شاہ بنیادی طور پر مسلم لیگی تھے۔ مارشل لاء کے دور میں سندھ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ان کے جج بننے میں دیگر محرکات کے ساتھ ساتھ ان کا ۱۹۷۷ء سے باقاعدہ لاہور آ کر اقبالیت پر بھرپور تقریر کرنا' جس سے علامہ اقبال کے صاحب زادے (ریٹائرڈ) جسٹس جاوید اقبال کی قربت بھی شامل تھی۔ وہ بیک وقت عدلیہ اور انتظامیہ میں رہے۔ یعنی ابھی انہوں

نے سندھ ہائی کورٹ سے استثنیٰ نہیں دیا تھا کہ وہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے
بغیر وزیر اعلیٰ چن لیے گئے۔

اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران وہ سندھی وڈیروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے
میں لگے رہے جس میں وہ ذاتی مراسم قائم کرنے میں تو کامیاب ہوگئے لیکن مجموعی طور
پر ان کا تاثر ایک ایسے شخص کے طور پر ابھرا جس کو سندھ بشمول کراچی کے حالات
خراب کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ انتظامی لحاظ سے وہ ایک ناکام ترین منتظم
ثابت ہوئے اور ان کی وزارت اعلیٰ کے دوران سندھ کی امن و امان کی صورت حال
بھی خراب تر ہوتی چلی گئی۔

جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۳ء میں شروع ہونے والی ایم۔ آر ڈی کی تحریک جس
میں پاکستان کی تقریباً تمام سیاسی جماعتیں شامل تھیں کو دبانے کے لیے غوث علی شاہ کو
خصوصی ہدایت کی لیکن وہ اس کے اثرات ختم کرنے میں بھی مکمل طور پر ناکام رہے۔
ان کی وزارت اعلیٰ کے دوران سندھ میں قتل و غارت اور دیگر جرائم کی رفتار میں
اضافہ ہوگیا۔ تعلیمی اداروں میں قتل عام اور ڈاکہ زنی جیسے گھناؤنے جرائم ہونے لگے۔
ان میں جئے سندھ کے حامیوں کا اپنے مخالفین کو حراساں کر کے ان کو قتل کرنا
افسوس ناک حد تک بڑھ گیا۔ جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے پاکستان کو تنگ
کرنے کے لیے بلدیہ کراچی کو توڑ دیا گیا۔ ایم کیو ایم اور جئے سندھ کی سرپرستی شروع
کر دی گئی۔ جس کے نتیجے میں کراچی اور حیدر آباد کے پنجابی اور پٹھانوں نے اتحاد کر
لیا اور یہی وہ موقع تھا جب سندھ میں نسلی فسادات نے شدت اختیار کی۔

سید غوث علی شاہ کی وزارت اعلیٰ کا دورانیہ تین برسوں پر محیط تھا۔ ان کی
وزارت کے ٹھیک گیارہ دن بعد سندھ کو کرفیو کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ لسانی اور علاقائی
فسادات پر غوث علی شاہ کی صوبائی سول انتظامیہ مکمل طور پر ناکام ہوچکی تھی۔ سندھ
کے دیہی اور شہری آبادی سے تعلق رکھنے والے ارکان ان کے خلاف ہوچکے تھے۔
بالآخر ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی اور ان کو وزارت اعلیٰ سے
سبکدوش ہونا پڑا۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ اندرون خانہ پیر پگارا سمیت
مسلم لیگ کو سندھ میں شکست دینے کے لیے سرگرم رہتے تھے۔

سندھ میں ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک ہر انتخاب میں شکست کھانے والے غوث علی شاہ نے ضلع سیالکوٹ کے حلقہ نارووال سے خالی ہونے والی ایک نشست سے ضمنی انتخاب جیت کر وزارت دفاع حاصل کی اور یہیں سے ان کی مالی بدعنوانی شروع ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل نارووال سے ایک مقامی سیاست دان کی وساطت سے غوث علی شاہ اس لیے جیت گئے کہ وہاں کے ووٹروں کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر شاہ صاحب انتخاب جیت گئے تو نارووال کو ضلع بنا دیا جائے گا جو کہ بعد میں پورا کر دیا گیا۔

وزارت دفاع کے دوران سید غوث علی شاہ نے سول ایوی ایشن میں میرٹ کے خلاف ۳۰ ہزار سے لے کر ۳ لاکھ تک فی امیدوار رشوت وصول کی جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۲۳ فروری اور یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو سول ایوی ایشن اتھارٹی نے ۳۹۹ مختلف آسامیوں کے لیے موزوں امیدواروں کے انتخاب کے لیے قومی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات شائع کرائے۔ ان اشتہارات کے جواب میں پورے ملک سے ۵۳ ہزار درخواستیں وصول ہوئیں۔ امیدواروں کے تحریری امتحان اور انٹرویو کے لیے سول ایوی ایشن اتھارٹی نے ایک سلیکشن کمیٹی مقرر کی جس کے ۲ مستقل اور ایک غیر مستقل رکن تھا۔ سلیکشن کمیٹی کے مستقل ارکان میں اتھارٹی کے ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن، ایئر کموڈور جاوید اندرابی اور جنرل مینیجر ایسٹیلاشمنٹ گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) یو کے ساقی تھے۔ جبکہ تیسرا رکن ہر ٹریڈ کی آسامیوں کے لیے انٹرویو مکمل ہونے پر اپنی نشست دوسرے ٹریڈ کے ماہر کے حوالے کر دیتا تھا۔ ڈائریکٹر ایڈمن جاوید امجد اندرابی کمیٹی کے چیئرمین قرار پائے۔ اس کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ تمام بڑے شہروں میں تحریری امتحانات لیے اور انٹرویو کر کے ایک میرٹ لسٹ سول ایوی ایشن اتھارٹی کے حوالے کر دی۔

اس لسٹ کا کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ اس کو "حق" باصلاحیت لیکن اعلیٰ حکام تک رسائی نہ رکھنے والے کامیاب امیدواروں کی سفارش، رشوت اور اقربا پروری کی تلوار سے ڈھیر کیا جانا مطلوب تھا۔ اس میرٹ پر تلوار چلانے والوں میں جدید کراچی

توڑنے والے رسوائے زمانہ سابق وزیر اعلیٰ سندھ و وزیر دفاع غوث علی شاہ اور سول ایوی ایشن کے ڈائریکٹر جنرل ایئر وائس مارشل انور محمود خان سلیکشن کمیٹی کی تیار کردہ ابتدائی فہرست سے لے کر حتمی فہرست تیار ہونے تک موجود رہے۔ غوث علی شاہ نے ۲۴۹ ایسے امیدواروں سے جن کی اکثریت ٹیسٹ انٹرویو میں یا تو شامل نہیں ہوئی تھی یا شامل ہو کر ناکام ہو چکی تھی، فی کس ۳۰ ہزار سے لے کر ۳ لاکھ روپے وصول کیے اور انہیں بھرتی کر لیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے بھی ۶۷ امیدواروں کو میرٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چور دروازے سے بھرتی کر لیا۔ ملک کی ممتاز شخصیات کے رشتے داروں کی ۳۱ افراد کی لسٹ مذکورہ بالا افراد سے الگ تھی جو کہ میرٹ کے خلاف آئے تھے۔ اس سارے عمل کے دوران وزیر دفاع اور دیگر افراد کے سفارش کردہ امیدواروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو ڈی جی نے اسامیوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا جو کہ سراسر غیر قانونی تھا۔

ایئر وائس مارشل انور محمود خان اور غوث علی شاہ کے گہرے تعلقات کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ مظفر حسین شاہ کے زیر عتاب آنے والے ایس ایس پی کراچی جمیل احمد کو غوث علی شاہ کی سفارش پر ڈی جی سول ایوی ایشن نے چند دنوں کے اندر اندر سی اے اے کا جنرل منیجر وجیلنس مقرر کر دیا۔ یوں ایک شاہ نے جمیل کو دوسرے شاہ کے عتاب سے بچا لیا اور دونوں نے مل کر سول ایوی ایشن میں بھرتیوں میں بڑے پیمانے پر بدعنوانی کا ارتکاب کیا۔

غوث علی شاہ نے اپنی وزارت دفاع کے دوران ڈی جی سول ایوی ایشن کو یہاں تک نواز دیا کہ ان کو ۵ برس تک ملازمت کا کنٹریکٹ دیتے ہوئے ۶۰ برس کی عمر تک ملازمت میں توسیع کر دی۔ دراصل وزیر دفاع موصوف ڈی جی کو ایئر مارشل بنوانا چاہتے تھے۔ ان نوازشات کے بدلے میں ڈی جی نے تمام قاعدے قوانین پس پشت ڈالتے ہوئے بھرتیوں میں غوث علی شاہ کی دی ہوئی فہرست میں شامل افراد کو اندھا دھند بھرتی کرنا شروع کر دیا۔

غوث علی شاہ ان کرپشن میں سول ایوی ایشن کے دیگر شامل افسران نے شاہ صاحب کے مذکورہ بالا اقدام سے اس قدر دیدہ دلیری سے رشوت لینے کے ساتھ

ساتھ محکمہ کے ذرائع ناجائز طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا کہ ریکارڈ حد تک بدعنوانیاں کی گئیں۔ غوث علی شاہ کی وزارت دفاع کے دوران سول ایوی ایشن کے افسران جن میں انور محمود سرفہرست تھے' جو فضائیہ کے سربراہ تو نہ بن سکے لیکن ایک دوسرے ادارے کے ڈی جی بن گئے۔ جہاں کرپشن کرنا بہت آسان تھا۔ یہاں پر ان کی سیہ کاریوں کی تفصیل تو نہیں دی جا سکتی البتہ چند ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں جناح ٹرمینل کی صفائی کے ٹھیکے میں بدعنوانی' سکھر ایئرپورٹ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں ایک ہزار مہمانوں کے لیے صرف چائے کا بل ۸۵۰ روپے فی کس ادا کیا گیا۔

اس کے علاوہ جناح ٹرمینل پر ڈیوٹی فری شاپ' سول ایوی ایشن کے سیکرٹری دفاع سلیم عباس کی اہلیہ کے بوتیک کے فیز ۵ میں خیابان تنظیم پر ایک بنگلہ کا کرایہ ادا کرنا' ڈی جی کے دست راست ڈائریکٹر فنانس کے بیٹے کا میڈیکل بل حاصل کرنے میں دوہرا کلیم داخل کرانا وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ سول ایوی ایشن میں ہر شعبے میں کروڑوں روپوں کے گھپلے ہوئے جن کا تانا بانا غوث علی شاہ سے جا کر ملتا ہے۔

غوث علی شاہ کی مالی بدعنوانی اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب سول ایوی ایشن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے سفارش اور رشوت کے ذریعے بھرتی کیے گئے افراد کو پاس کرنے سے انکار کر دیا۔ ان امیدواروں میں سے بعض نے دھمکی دی کہ انہوں نے لاکھوں روپے دے کر نوکری حاصل کی ہے اور وہ اس کی شکایت سید غوث علی شاہ سے کریں گے۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے اس وقت کے سربراہ شاہد رضا کو غوث علی شاہ نے حیدرآباد سے تبادلہ کر کے کراچی بھیج دیا۔ سید غوث علی شاہ کی کرپشن اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے ملکی سلامتی سے متعلق اہم امور یعنی راڈار اور کنٹرول ٹاور جیسے حساس مقامات پر متعین عملہ کی بھرتی میں ایک ایسے شخص کو بھرتی کر لیا جس کی ایک آنکھ پتھر کی تھی جو کہ طبی طور پر اہل نہیں تھا۔

وزیر دفاع سید غوث علی شاہ نے معائنہ کرنے والے ڈاکٹر کو ہدایت کی کہ اگر پتھر کی آنکھ والے امیدوار کو طبی طور پر اہل قرار نہ دیا گیا تو اس کی چھٹی کرا دی جائے گی۔ وزیر دفاع کے کوٹے میں زیادہ تر تعداد ان امیدواروں کی تھی جو خیرپور سے

تعلق رکھتے تھے۔

غوث علی شاہ کی کرپشن اس داستان کو برسرعام کرنے میں کمپیوٹر نے بھی اہم کردار ادا کیا جس میں امیدواروں کو خاص نمبران کے دستخط کے ساتھ فیڈ کر دیئے گئے تھے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس وقت کے ڈی جی نے ۳۵ ہزار درخواستیں جلانے کا حکم بھی دیا تھا۔

۹۷ء میں بیٹھنے والی نواز شریف حکومت نے غوث علی شاہ سے وعدہ کیا کہ فاروق لغاری کے بعد انھیں صدر مملکت بنا دیا جائے گا لیکن گوہر ایوب خان نے اس کی مخالفت کی اور صدارت کے لیے اپنے آپ کو "موزوں ترین" امیدوار ظاہر کیا۔ ذرائع کا خیال ہے کہ غوث علی شاہ کا اس سلسلے میں پلڑا بھاری ہے اور نواز شریف سندھ کو خوش رکھنے کے لیے غوث علی شاہ کو صدر بنانے کے حق میں ہیں۔ دیکھیں صدر بننے کے بعد ہمارے سامنے کس طرح کے غوث علی شاہ آتے ہیں۔

سردار فاروق لغاری

سردار فاروق احمد لغاری پیپلزپارٹی کے پہلے دور اقتدار اور بلخ شیر مزاری کی مختصر نگران حکومت میں اہم عہدوں پر موجود رہے۔ اس دوران فاروق لغاری کی پیپلز پاکستان پیپلزپارٹی کے مرکزی رہنما کی سی رہی اور ذرائع ابلاغ سمیت مخالف سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کی طرف سے لغاری کی شخصیت تنقید سے محفوظ رہی۔

پاکستان پیپلزپارٹی کے دوسرے دور اقتدار میں جب سردار فاروق لغاری کو صدر مملکت بنایا گیا تو اپوزیشن اور ذرائع ابلاغ کی کوششوں سے صدر فاروق لغاری کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے بے نقاب ہوئے جن سے ان کی شخصیت کا متنازعہ پن نمایاں ہوتا گیا۔ بالآخر جب ۱۹۹۶ء میں فاروق لغاری نے آٹھویں ترمیم کا سہارا لے کر بے نظیر حکومت ختم کی تو فاروق لغاری کی شخصیت پورے رنگ و روپ کے ساتھ سامنے آ گئی۔ کیونکہ فاروق لغاری جو اسمبلی توڑنے کے چند گھنٹے پہلے تک اس وقت کے وزیرداخلہ نصیر اللہ بابر کو مسلسل ملاقات میں یہ یقین دلاتے رہے تھے کہ وہ بلوچ ہیں اور ان کی کچھ خاندانی روایات ہیں اور بے نظیر ان کی بہن ہیں اور وہ کیسے بے نظیر کی حکومت ختم کر سکتے ہیں لیکن ان کی یہ "خاندانی روایات" چند گھنٹوں بعد ہی دم توڑ گئیں اور انہوں نے بے نظیر حکومت ختم کر دی۔

سردار فاروق لغاری جب نومبر ۱۹۹۳ء میں پاکستان کے نویں صدر منتخب ہوئے تو ایک معروف جریدے کے مدیر نے لکھا کہ مجھے فاروق احمد لغاری کی پیپلزپارٹی میں موجودگی ہمیشہ بے جوڑ محسوس ہوئی اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایسا پابند

صوم و صلوٰۃ' تہجد گزار' جدید و قدیم کے متوازن مطالعہ اور صاف ستھری زندگی کی شہرت رکھنے والا یہ شخص پیپلزپارٹی کے سیاسی کلچر میں کیسے پھنس گیا؟ مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اسے آج ہی کے لیے محفوظ رکھا اور پروان چڑھایا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ وہاں موجود نہ ہوتا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے عہدہ جلیلہ کے لیے پیپلزپارٹی اپنی صف سے کس شخص کو نکال کر قوم کے سامنے پیش کرتی؟ وہاں دیانت و امانت یا ذاتی زندگی کی پاکیزگی' دینداری اور اس منصب کے لیے علم و اہلیت کی مطلوبہ صلاحیتیں رکھنے والا دوسرا فرد ہے کہاں۔ نہ ہوتے وہ تو کیا ہوتا۔

اسی طرح کے تبصرے اور آراء سامنے آئیں جب فاروق لغاری صاحب ایوان صدر میں آئے۔ مگر افسوس کہ کرپشن اور لوٹ مار کے مضبوط ڈھانچے نے' جس کا جناب فاروق لغاری صاحب ساری زندگی سے حصہ ہیں' کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدر منتخب ہونے کے چند ماہ بعد ہی مہران گیٹ سکینڈل سامنے آیا تو وہ لوگ جو نیک خواہشات رکھتے تھے ان کو صدمہ ہوا مگر عامتہ الناس جو گزشتہ پچاس سالوں سے حکمرانوں کی لوٹ مار اور کرپشن کے نہ صرف عینی شاہد ہیں' بلکہ شکار بھی ان کو یہ سن کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔ مہران گیٹ سکینڈل کے بعد کرپشن زدہ گلے سڑے ریاستی ڈھانچے کی سب سے بلند نشست کرسی صدارت پر براجمان جناب فاروق لغاری صاحب کی ایک کے بعد ایک خبر آنے لگی۔ ان سلسلوں میں صدر کا دورہ امریکہ جہاں انہوں نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ٹیکس دہندگان کے پیسوں سے اپنے بیٹے کے کانووکیشن میں شرکت کی۔ اپنے ذاتی دوست رابرٹ میک فارلین کی کمپنی کو بلوچستان میں پاور پراجیکٹ لگانے کا لائسنس لے کر دینے میں کمیشن حاصل کیا۔ ان کے فرزندوں اور قریبی رشتہ داروں نے بینکوں سے قرض لے کر سیمنٹ انڈسٹری میں اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی اور ابھی حالیہ دنوں میں ایجنٹ کانسی کی امریکہ کو سپردگی کے ذمرے میں ۳۵ لاکھ ڈالر وصول کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔

سردار فاروق احمد لغاری صاحب پنجاب میں چوٹی کے جاگیردار ہیں اور اپنے قبیلہ لغاری کے سردار بھی ہیں۔ لغاری صاحب کا خاندان کئی صدیوں سے ڈیرہ غازی

خاں میں آباد ہے۔ ان کے دادا سردار جمال خان لغاری پنجاب کی پہلی مجلس قانون ساز کے رکن لیے گئے جہاں وہ قیام پاکستان تک بلوچ تمنداروں کے حلقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ فاروق لغاری کے دادا کی زندگی میں ہی ان کے والد محمد خاں لغاری سیاست میں داخل ہوگئے اور ۱۹۵۱ء میں ممتاز دولتانہ کی کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ پھر عبدالحمید دستی کی کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ تاہم وہ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کا انتخاب ہار گئے۔ سردار فاروق لغاری کے والد کے خلاف بھی ایوب خان کے دور میں بدعنوانیوں کی وجہ سے ایبڈو کے تحت مقدمہ چلا اور ان پر ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں ڈیرہ غازی خاں بھی پورے ملک کی طرح مزدور اور کسان راہنماؤں کی قیادت میں تھا۔ گو فاروق لغاری کے والد صاحب صوبائی انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوگئے مگر لغاری خاندان کی بہت ساری زمینوں پر کسانوں نے قبضے کر لیے' جو سردار محمد خان لغاری کے بھٹو کی قیادت تسلیم کرنے پر واگزار کر دی گئی۔ اس خاندانی پس منظر اور ورثے کے ساتھ ۲ر مئی ۱۹۴۰ء کو وزیرستان کے علاقے ٹانک میں پیدا ہوئے۔ ایچی سن کالج سے فارغ ہونے کے بعد لندن چلے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں بیوروکریسی میں ملازمت شروع کر دی اور ڈی سی کے عہدے تک ترقی کر گئے مگر والد کی وفات کے بعد خاندان کی سربراہی سنبھالنے کے لیے انہوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس وقت تک ان کا خاندان پی پی پی میں شمولیت اختیار کر چکا تھا۔ اسی لیے انہیں ۱۹۷۳ء میں پی پی پی کی جانب سے سینیٹر چن لیا گیا مگر وہ پارٹی اور حکومت میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور کچھ دیر تک وفاقی وزیر کے عہدے پر تعینات رہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں وہ پارٹی کے اہم شمار ہوتے تھے۔

اسی دور میں جب پیپلزپارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین بیرون ملک چلے گئے تو لغاری صاحب ان کی جگہ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے۔ وہ پارٹی کے ان چند راہنماؤں میں سے ہیں جنہوں نے جلا وطنی بلکہ پورا عرصہ ملک ہی میں رہے۔ وہ

مارشل لائی عہد میں کئی مرتبہ جیل میں بھی گئے۔ البتہ وہ بھی ملک کے دوسرے سیاستدانوں کی مانند کبھی بھی عوامی جدوجہد کے اس مقام تک نہ گئے جہاں پر ان کو مارشل لاء کی انتقامی سیاست کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب ملک کی جمہوریت پسند قوتیں مارشل لاء کے خلاف جدوجہد میں معروف تھیں تو سردار صاحب شوق شکار اور سیاست کے درمیان وقت کی تقسیم میں مسلسل انصاف برتتے رہے۔ اسی دوران میں اکثر و بیشتر لیڈروں کے وطن سے باہر چلنے کی وجہ سے جناب لغاری صاحب کو بھی پارٹی کے اندر اپنے حلیفوں کا گروپ تشکیل دینے میں خاصی آسانی رہی۔

یہی وجہ تھی کہ جب بے نظیر بھٹو سے وہ اکثر و بیشتر اختلاف کر لیتے تھے اور فاروق لغاری ہی واحد رکن تھے جو پارٹی لیڈر سے اختلاف رکھنے کے باوجود پارٹی میں ہمیشہ معتبر رہے۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں قومی اور صوبائی دو نشستوں کے الیکشن پر الیکشن لڑا اور دونوں پر کامیاب رہے۔ ان کا پروگرام تھا کہ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنتے لہذا انہوں نے قومی اسمبلی کی سیٹ سے استعفا دے دیا۔ مگر پنجاب اسمبلی میں ان کی پارٹی اکثریت نہ رکھنے کی بنا پر اپنا وزیر اعلیٰ نہ منتخب کروا سکی اور جب نواز شریف وزیر اعلیٰ بن گئے تو انہوں نے پنجاب اسمبلی کی نشست سے بھی استعفا دے دیا۔ اس طرح ان کو دوسری مرتبہ الیکشن لڑنا پڑا اور یوں وہ ضمنی انتخاب میں دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے اور بے نظیر کی کابینہ میں وہ پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر بنائے گئے۔ بے نظیر بھٹو کی کابینہ کے ارکان سوائے لغاری کے کرپشن میں خاصے مشہور ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں صدر غلام اسحاق خان نے قومی اسمبلی توڑ کر جب انتخابات کروائے تو لغاری صاحب دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے مگر اس مرتبہ ان کی پارٹی اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ لہذا ان کو اپوزیشن کا کردار ادا کرنا پڑا۔ اس مرتبہ ان کی لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھرپور حزب اختلاف کا کردار ادا کیا اور نواز شریف کے خلاف لانگ مارچ کی کال دی۔ ان احتجاجوں میں لغاری صاحب نے بھرپور شرکت کی۔ جب وہ پنڈی سے جلوس کی شکل میں اسلام آباد جانا چاہتے تھے تو ان کو پولیس نے رکاوٹیں کھڑی کر کے روکا۔ اس دوران ہاتھا پائی اور لاٹھی چارج میں لغاری صاحب نے پہلی مرتبہ پولیس . .

لاٹھیاں کھائیں۔ ان احتجاجوں کے نتیجے میں صدر اسحاق نے نواز شریف کی حکومت برخواست کر دی اور ملک میں بلخ شیر مزاری کی قیادت میں نگران حکومت قائم کر دی۔

اس نگران حکومت میں جناب فاروق لغاری صاحب ۱۹۹۳ء میں وزیر خزانہ بنائے گئے۔ اسی وزارت کے دوران ان کی پالیسیوں سے عالمی سامراجی ادارے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بہت خوش رہے۔ لغاری صاحب نے وزیر خزانہ کے طور پر حلف بھی اٹھایا اور کام بھی کیا مگر بعد میں انہوں نے نگران سیٹ اپ میں شرکت پر تاسف کا اظہار بھی کیا۔ ۱۹۹۳ء میں نگران حکومت کے زیر سایہ ایک بار پھر عام انتخابات منعقد ہوئے۔ اس بار جناب فاروق لغاری صاحب ملک میں سب سے زیادہ ووٹ لے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہیں وزارت خارجہ کا قلمدان تھمایا گیا۔

بحیثیت وزیر خارجہ انہوں نے تھوڑا ہی کام کیا تھا کہ نومبر ۱۹۹۳ء میں پی پی پی نے انہیں اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا اور یوں انہوں نے ملک کے نویں صدر کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ سردار فاروق احمد لغاری کو پی پی پی کے ووٹوں سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے کیونکہ سردار صاحب بحیثیت بڑے جاگیردار کے تمام جاگیرداروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے اکثر و بیشتر بڑے خاندانوں کے ساتھ ان کی رشتہ داریاں ہیں وہ خود بیوروکریٹ رہے اور ان کے بیچ کے لوگ اس وقت اہم عہدوں پر فائز تھے۔ گو ۱۹۸۵ء میں انہوں نے جنرل حمید گل کے ذریعے پہنچنے والی ضیاء الحق کی وزارت عظمیٰ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا مگر اس کے باوجود فوج کے سربراہوں سے ان کے تعلقات صحت مند ہی رہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں سردار صاحب کا صدر مملکت منتخب ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔

صدر مملکت منتخب ہوتے ہی چند معاملات پر ان کے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری سے اختلافات شروع ہوگئے۔ گو انہوں نے صدر منتخب ہوتے ہی پارٹی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جو کہ صدر کے غیر جانبدار عہدے کے لیے ضروری بھی تھا۔ حالانکہ ان کے پیش رو غلام اسحاق خان نے اپنے پانچ سالہ عہد صدارت میں اپنی مسلم لیگ کی ممبر شپ بدستور قائم رکھی مگر لغاری صاحب کے مستعفی ہونے کے باوجود پی پی پی کی چیئرمین بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر نے مسلسل

ان کو پارٹی رکن کے طور پر ہی لیا۔ بے نظیر بھٹو نے ایک بار صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ صدر اپنے ہی آدمی ہیں' جس پر صدر فاروق لغاری کو اپنی غیر جانبداری کا بڑا اظہار کرنا پڑا۔

صدر مملکت جب ایوان صدر میں داخل ہوئے تو آتے ہی ان کی زوجہ محترمہ اور ملک کی خاتون اول نے پہلے سے مزین و آراستہ ایوان صدر کی مزید تزئین و آرائش کے لیے چھ کروڑ روپے طلب کر لیے۔ ان کو پانچ کروڑ ننانوے لاکھ روپے دیئے گئے۔ ان پیسوں میں سے صرف صدر مملکت کے لیے جرمنی سے منگوائے گئے ٹیبل لیمپ کی قیمت چھ لاکھ روپے تھی۔ باقی اخراجات کی تفصیل درج ذیل ہے:

ایوان صدر کے پردے اور سجاوٹ پر ۴۴ لاکھ۔ نیا فرنیچر ۳۱ لاکھ چھپن ہزار۔ قالین ۳ لاکھ اڑتیس ہزار۔ ڈیکوریشن ۶ لاکھ باسٹھ ہزار۔ فائرنگ رینج کی تعمیر ۴۳ لاکھ۔ فائرنگ رینج کے آلات ۱۲ لاکھ۔ دیوار کی تعمیر ۳ لاکھ پچاس ہزار۔ ایلومینیم کا دروازہ ۲ لاکھ۔ گھڑسواری کے لیے میدان ہموار کرنے کے لیے ۲ لاکھ پچیس ہزار۔ اس کے علاوہ سعودی عرب سے ڈیکوریشن پیس اور فانوس منگوائے گئے جن کی مالیت بھی لاکھوں روپے بتائی جاتی ہے۔

قاضی حسین احمد

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد کی شخصیت میں پائی جانے والی مستقل مزاجی اور ہم جوئی نے انھیں بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ جماعت اسلامی کا امیر بننے کے بعد قاضی حسین احمد نے جماعت کو نئے قالب میں ڈھالا' اس کو ایک طرح سے عوامی رنگ دینے کی کوشش کی اور ملک کی انتخابی سیاست میں نئے زاویوں کے ساتھ متعارف کروایا۔ اگرچہ جماعت اسلامی کو اس رنگ میں لانے کے لیے قاضی حسین احمد کو جماعت کی مجلس شوریٰ سمیت دیگر رجعت پسند افراد کی شدید تنقید برداشت کرنا پڑی لیکن قاضی حسین احمد نہ صرف اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے بلکہ جماعت اسلامی کے دوسری بار امیر بھی بن گئے۔

قاضی حسین احمد کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ ان کی پیدائش نوشہرہ کے ایک گاؤں زیارت کاکا صاحب میں ہوئی۔ اپنے خاندان میں سے قاضی حسین احمد پہلے فرد نہیں ہیں' جو مذہبی سیاست میں داخل ہوئے بلکہ ان کے خاندان کا مذہبی سیاست میں ہمیشہ اثر و رسوخ رہا ہے۔ قاضی حسین احمد کے خاندان کا جھکاؤ' جمعیت علمائے اسلام کی طرف رہا جبکہ قاضی حسین احمد شروع سے ہی مولانا مودودی کے معتقدین میں شامل رہے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے ہی حاصل کی اور سکول کے دوران وہ اسلامی جمعیت طلبہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی ایس سی کی۔ وہ کالج میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم رہے۔ بعدازاں ایم ایس سی جغرافیہ کرنے کی غرض سے پشاور یونیورسٹی کے طالب علم بنے۔

ایم ایس سی کرنے کے بعد وہ درس و تدریس سے منسلک ہوئے اور چار سال تک سوات کالج میں جغرافیہ پڑھاتے رہے۔

اسی ملازمت کے دوران بھی وہ سیاسی سرگرمیوں میں برابر شریک رہے اور ان سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کلینیکل لیبارٹری بنائی۔ اس کے بعد وہ زیادہ توجہ کاروبار پر دینے لگے۔ قاضی حسین احمد پر مولانا مودودی صاحب کی افکار کی ہمیشہ چھاپ رہی اور جب انہوں نے جماعت اسلامی کے لیے بھرپور کام شروع کیا تو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پشاور قومی اسمبلی کی نشست پر خان عبدالقیوم خاں کے مقابلہ پر الیکشن لڑا مگر بری طرح ناکام رہے۔ اسی دوران میں ان کو پشاور میں جماعت اسلامی کا امیر مقرر کیا گیا۔ جماعت کے لیے ان کی محنتوں اور کاوشوں کے پیش نظر انہیں صوبہ سرحد کا صوبائی امیر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں وہ جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بن گئے۔ جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل کی ریٹائرمنٹ کے بعد قاضی صاحب جماعت اسلامی کے امیر مقرر ہوئے۔

جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۵۱ء میں کراچی کے فائق دنیا میں ایک تاریخی تقریر کی جس میں انہوں نے امریکی انتظامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ سوویت یونین اور کمیونزم کا مقابلہ کرنا صرف امریکی دولت اور مادی وسائل کی مدد سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے فکری تحریک کی ضرورت ہے' جو بقول ان کے صرف وہی فراہم کر سکتے ہیں اور یوں جماعت اسلامی اندرون ملک اور بیرون ملک سرد جنگ سے منسلک ہو گئی اور ان پر امریکی فنڈ کھانے کا الزام لگا دیا گیا۔ جماعت اسلامی نے پاکستانی سیاست میں ہمیشہ وہ روش اختیار کی جو امریکی مفادات سے منسلک رہی۔ وہ خواہ ایوب خاں کے خلاف تحریک ہو یا بھٹو کے خلاف یا افغانستان کا جہاد' ان تمام میں جماعت اسلامی کا کردار ذہنوں میں موجود تاثر کو مزید گہرا کرتا چلا گیا۔ جہاد افغانستان کا مرکز پشاور شہر تھا' اس لیے قاضی حسین احمد نے نہ صرف عملی طور پر شرکت کی بلکہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے انفرادی اور جماعت نے مجموعی طور پر کثیر مالی فوائد بھی حاصل کیے۔ یہ فوائد براہ راست امداد کے علاوہ مختلف ٹھیکوں کی

مد میں پہنچائے جاتے رہے۔

۱۹۸۸ء میں بدلتے ہوئے عالمی تناظر نے روایتی سرد جنگ کا خاتمہ کر دیا، جس سے دنیا میں تبدیلیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تبدیلیوں کے اس دور میں جماعت کی سیاست کا تبدیل ہونا بھی موضوعی صورت حال کا تقاضا تھا۔ قاضی صاحب ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں سینٹ کے ممبر منتخب ہو چکے تھے کیونکہ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں جماعت کو ضیاء الحق کی بی ٹیم کہا جاتا تھا۔ لہٰذا جماعت کو سرکار دربار میں خاصی پذیرائی ملی۔ اس تمام پس منظر میں قاضی صاحب جماعت اسلامی کا ایک نیا روپ لے کر سامنے آئے۔ انھوں نے جماعت کو عوامی سیاست میں فعال کیا۔ ان کی محنت، کوشش اور شخصی جوش و خروش کی وجہ سے جماعت اسلامی مذہبی قوت کے ساتھ ساتھ انتخابی قوت بھی حاصل کرنے لگی تھی جسے نظرانداز کرنا پاکستان کے روایتی سیاست دانوں کے لیے آسان نہ تھا۔ ۱۹۸۸ء کے پہلے جماعتی انتخابات میں انھوں نے اپنا وزن اسلام پسند گروہ کے توقیر اور پراسرار اسلامی جمہوری اتحاد کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی انتخابی مہم میں قاضی صاحب نے خاصا اہم کردار ادا کیا۔ عوام الناس کا خیال تھا کہ پی پی پی انتخابات نمایاں اکثریت سے جیت جائے گی، لیکن اسلام آباد کی اسٹیبلشمنٹ نے آئی جے آئی بنا کر مقابلے کو ون ٹو ون کر دیا اور یوں یہ اتحاد نہ صرف صوبہ پنجاب میں حکومت تشکیل دینے میں کامیاب رہا بلکہ انھوں نے مرکز میں بھی بے نظیر کو واضح برتری حاصل نہ کرنے دی۔ اس کے باوجود مرکز میں بے نظیر وزیراعظم بنیں۔ شروع دن سے ہی پنجاب کی حکومت نے اس وقت کے صدر غلام اسحاق خاں اور دوسری بااثر قوتوں کے کہنے پر مرکزی حکومت سے آویزش شروع کر دی۔ اس آویزش میں قاضی حسین احمد صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے جماعت کی سٹریٹ پاور کو اس طور برتا کہ ۱۸ ماہ بعد ہی صدر اسحاق نے بے نظیر کی حکومت برخواست کر دی۔ ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں قاضی حسین احمد صاحب نے پھر مسلم لیگ کا ساتھ دیا کیونکہ اس وقت اسلام آباد کی مقتدر قوتیں نواز شریف کو وزیراعظم بنانے کا بندوبست کر رہی تھیں۔ لہٰذا قاضی صاحب نے نواز شریف کا ساتھ دیا۔ مجموعوں میں ہاتھ لہرا لہرا کر انھوں نے نواز شریف کو وزیراعظم بنانے کے لیے

ووٹ ڈالے۔ بقول قاضی صاحب انہوں نے نواز شریف سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ برسراقتدار آتے ہی اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے' سودی معیشت کا خاتمہ کریں گے' مغربی جمہوری نظام کی جگہ اسلامی قدروں کو متعارف کرائیں گے' ملک سے رشوت ستانی' بدعنوانی' اقرباء پروری کا خاتمہ کریں گے اور سرمایہ داری نظام کی جگہ اسلام کے معاشی عدل و انصاف کے تصور پر مبنی اصلاحات متعارف کروائیں گے۔ قاضی صاحب اور غلام اسحاق خاں کی معاونت و آشیرباد سے نواز شریف بھاری اکثریت سے وزیراعظم منتخب ہوئے اور چاروں صوبوں میں بھی ان کی حامی حکومتیں بن گئیں۔ مسلم لیگ کو سینٹ میں پہلے سے ہی دو تہائی اکثریت حاصل تھی لہٰذا قاضی صاحب نے مسلم لیگ کو انتخابی اتحاد کے دوران کیے گئے وعدے یاد دلانا شروع کیے۔ جب قاضی صاحب کے مطالبات پر کان نہ دھرا گیا تو آہستہ آہستہ ان کے اور نواز شریف کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔

اسلامی نظام کے نفاذ پر قاضی صاحب کے اصرار نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا کہ مارشل لاء کے پورے دور میں قاضی صاحب جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل رہے اور ضیاء الحق کی حکومت انتہائی مطلق العنان بھی تھی مگر اس کے باوجود جماعت اسلامی نے کبھی بھی نہ تو بلاسود معیشت کی بات کی اور نہ ہی اسلامی نظام کے نفاذ کی' پھر کیا وجہ تھی کہ ایک دم قاضی صاحب ان مطالبات کو لیے سامنے آئے۔ ایک وجہ تو وزیراعظم اور صدر کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات تھے' جس میں قاضی صاحب صدر کی حمایت کر رہے تھے اور دوسرا گزشتہ دونوں عام انتخابات نے قاضی صاحب کو اس زعم باطل میں مبتلا کر دیا کہ نواز شریف جیسے چھوٹے قد کے سیاست دان کا وزیراعظم بننا انہی کے رہین منت تھا اور تیسرا پاکستان کی مقتدر قوتیں مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی دونوں کو باری باری آزمانے کے بعد ایک تیسر پریشر گروپ تشکیل دینے کی خواہاں تھی۔ لہٰذا جب نواز شریف کی حکومت برطرف کر کے نئے عام انتخابات کا عندیہ دیا گیا تو قاضی صاحب نے پاکستان اسلامک فرنٹ کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا پروگرام بنایا۔ قاضی صاحب نے کثیر سرمائے سے انتخابی مہم کا آغاز کیا۔ بہت ڈھول پیٹے گئے' اچھل کود ہوئی' جس پر

جماعت اسلامی کے بہت سے بزرگ رہنما ہی نہ صرف ناراض ہوئے بلکہ جماعت اسلامی کے اپنے ہی ایک جریدے میں قاضی حسین احمد پر شدید تنقید کی گئی۔ جب عام انتخابات کے نتائج آئے تو "ظالمو! قاضی آ رہا ہے" کا نعرہ "دیکھو! قاضی جا رہا ہے" میں بدل گیا۔ ان الیکشنوں کے بعد قاضی صاحب پر شدید الزامات لگائے گئے۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے الزام لگایا کہ قاضی صاحب نے نہ صرف جماعت کی روایتی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ جماعت کے فنڈز کو بھی بے دریغ پانی کی طرح بہایا ہے۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ قاضی صاحب نے جلدبازی سے کام لیا ہے حالانکہ اس وقت جماعت اس وسیع پیمانے پر مہم چلانے کی متحمل نہ تھی۔ ان الزامات کے زیر اثر قاضی صاحب نے جماعت کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس استعفیٰ نے قدامت پسند ٹولے کو بے بس کر دیا۔ انہیں اپنے لیے نئے لائحہ عمل کی تیاری میں وقت کا سامنا تھا۔ ادھر جماعت کی مجلس شوریٰ نے جس میں قاضی صاحب کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی' قاضی صاحب کا استعفیٰ ماننے سے انکار کر دیا۔ قاضی صاحب نے انتخابی شکست کی خفت مٹانے کے لیے مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی دونوں کو چور چور کہنا شروع کر دیا۔ جواب میں نواز شریف نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ جب وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے تو قاضی حسین احمد صاحب نے ان سے کثیر رقم وصول کی تھی' جس کی قاضی صاحب نے نہ صرف تردید کی بلکہ نواز شریف پر ہرجانے کا دعویٰ بھی دائر کر دیا۔ بعدازاں یہ دعویٰ دونوں فریقین کی خاموشی کی نذر ہوگیا۔ بے نظیر کے پورے دور حکومت میں قاضی صاحب کرپشن اور احتساب کا غلغلہ بلند کرتے رہے۔ قاضی صاحب کے اس جوش و خروش اور عوامی سیاست کے پس منظر میں الجزائر اور ترکی کے اندر اٹھتا ہوا مذہبی ابھار بھی تھا' مگر کچھ مدت کے بعد وہ ابھار بھی بیٹھ گیا جس کا قاضی صاحب کو خاصا صدمہ ہوا۔ قاضی صاحب کی پالیسیوں اور بیرون ملک ان کے لیے حوصلہ افزا تحاریک کی ناکامی ایسے صدمات تھے جن سے قاضی صاحب اس درجہ بددل ہوئے کہ ۱۹۹۷ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ الیکشن مہم کے دوران جماعت اسلامی نے انتخابات کی جگہ احتساب کی حمایت میں تحریک چلائی۔ انہوں نے انتخابی عمل کو روکنے کی دھمکی بھی دی' مگر نہ ہی احتساب ہوا اور نہ ہی وہ انتخابات

کو روک سکے اور مسلم لیگ نے جماعت اسلامی کے تعاون کے بغیر بھاری مینڈیٹ پایا' جس پر جماعت اسلامی نے نواز شریف حکومت سے از سرِ نو احتساب اور نفاذ اسلام کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے پچاس لاکھ ممبر شپ کا ہدف دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ وہ چند برس کے اندر اندر ملک میں انقلاب برپا کریں گے۔

فی الحال تو لگتا ہے کہ جماعت نہ صرف اپنی روایتی پریشر گروپ کی حیثیت کھو بیٹھی ہے بلکہ اپنے اس روایتی انتظامی ڈھانچے میں بھی دراڑیں ڈال بیٹھی ہے جو اس کا طرۂ امتیاز خیال کیا جاتا تھا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

لیاقت علی خان

خان لیاقت علی خان یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو کرنال (انڈیا) میں نواب رستم علی خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور ۱۹۱۸ء میں ایم۔اے او کالج علی گڑھ سے گریجوایشن کی۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ بار ایٹ لاء کا امتحان پاس کیا۔

دوران تعلیم انگلستان میں انھوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور ہندوستان سوسائٹی کے خزانچی بن گئے۔ لیاقت علی خان ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بن گئے۔ اور ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کے سیکرٹری کے عہدے پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ حکومت ہند نے لیاقت علی خان کو ۱۹۴۶ء میں وزیر تجارت بنا دیا اور وزیر مالیات کی حیثیت سے عوامی بجٹ پیش کیا۔ تحریک پاکستان میں انھوں نے بھرپور کردار ادا کیا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

وزیراعظم کے عہدے کے دوران راولپنڈی کے کمپنی باغ میں جلسہ عام میں خطاب کر رہے تھے کہ ایک سید اکبر نامی شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ سید اکبر کو بھی موقع پر موجود پولیس انسپکٹر محمد شاہ نے گولی مار کر ہلاک کر دیا جس سے اصل حقائق پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دیا گیا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کو سپرد خاک کر دیا گیا اور ملک بھر میں ۱۰ دن تک سوگ منایا گیا۔ پاکستانی پرچم تین دن تک سرنگوں رہا اور تمام سرکاری اداروں میں تین دن تک کام نہ ہوا۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ خان لیاقت علی خان کی شخصیت کا متنازعہ

پن بہت ابتدائی دنوں میں ہی واضح ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ لیاقت علی خان کی خصوصاً اس گفتگو کا بہت زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے جو انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی عیادت کے دوران ان کے معالج سے کی۔ چونکہ نظریہ پاکستان اور پاکستان کی ایسی "سیاسی متبرک" شخصیات پر ناقدانہ انداز میں لکھنا اپنے آپ کو ایک طرح سے مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے لیکن چونکہ میرا موضوع "پاکستان کی متنازعہ شخصیات" ہے' اس لیے میں قائد ملت کی سیاسی زندگی پر اس انداز میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی بھی ایسی بات میرے قلم سے نہ نکلنے پائے جو "نظریہ پاکستان" کی غلط تعبیر کرنے والوں کے ہاتھ لگ جائے اور میں ساری زندگی کے لیے معتوب ٹھہروں۔

ہماری ۵۰ سالہ ملکی تاریخ کے "سرکاری انعام یافتہ" مورخ بڑے دھوم دھڑکے سے لکھتے آئے ہیں کہ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان ایک درویش صفت سیاستدان تھے اور جب ان کی وفات ہوئی تو ان کا کل اثاثہ محض چند ایک ضرورت کی معمولی اشیاء تھیں۔ مختصر یہ کہ ہمارا لکھاری بڑی عاجزی کے ساتھ لیاقت علی خان کی عسرت کی داستان بیان کرتا ہے اور شاید اس کا محرک وہ تصور ہے جو ہمارے سیاستدانوں نے گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ملکی خزانے کی لوٹ مار کرکے اور اپنے خاندانوں کو ارب پتی خاندانوں میں تبدیل کرکے اس کے ذہن میں قائم کیا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ مذکورہ سیاستدانوں کے مقابلے میں ایک ایسی سیاسی شخصیت کو پیش کیا جائے جو ان سے قطعی مختلف ہو' ملک کی پہلی وزارت اعظمیٰ بھی اس کے پاس رہی ہو اور پھر اس شخصیت کے سیاسی فیصلے اور دور اقتدار بہت زیادہ شفاف اور وطن کے لیے اور جمہوریت کے لیے "نعمت" رہا ہو --- انہی محرکات کے زیراثر ہماری اکثر "قومی تاریخیں" بھری پڑی ہیں اور ان میں اصل حقائق سے اتنی ہوشیاری کے ساتھ آنکھیں پھیری گئی ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لیاقت علی خان نے ترکے میں کروڑوں روپے کی جائیداد چھوڑی۔ اگر آج بھی صرف لاہور شہر میں واقع ان کی جاگیروں کی مارکیٹ قیمت معلوم کی جائے تو حیرت گم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مضمون کے بعد میں بھی "قومی غداروں" کی صف میں شامل کیا جاؤں' اسی لیے میں ان حقائق کا ذکر تو ضرور کروں گا

جو میرے سامنے ہیں' لیکن شاید بہت کم کر میں بھی ان کی نشاندہی نہیں کر سکتا کیونکہ اقتدار اور ذرائع ابلاغ پر جن قوتوں کا قبضہ گزشتہ پچاس برسوں سے چلا آ رہا ہے میں ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا اور ان کا "نظریہ" اتنا زیادہ اور خوفناک حد تک مضبوط اور حقائق سے عاری ہے کہ مجھ جیسا چھوٹا آدمی تو اس کی تاب بھی نہیں لا سکتا۔

مرحوم لیاقت علی خان کی سینکڑوں ایکڑ اراضی پنجاب کے دارالحکومت لاہور کے نواحی علاقے میں تھی جس میں سے بیشتر حصہ فروخت کیا جا چکا ہے' جبکہ اس اراضی کے ایک حصے پر قبضے کے لیے نصف درجن سے زائد افراد کو قتل بھی کیا جا چکا ہے۔ اس اراضی کی حقیقت تو ریونیو بورڈ کا وہ رجسٹری بتا سکتا ہے جو کسی بھی غیر سرکاری اور غیر ضروری فرد کے لیے ممنوع ہے اور ہر تحصیل میں اس کو سب سے بڑا انتظامی آفیسر سونے تالے میں رکھتا ہے۔ لاہور کے نواح کی اس اراضی پر ساجدہ لیاقت علی قابض رہیں اور پھر اس کی فروخت کے دوران اٹھ کھڑے ہونے والے اختلافات کے بعد علاقے کے طاقتور لوگ اس پر قابض ہو گئے اور آج بھی ایک حصے پر کچھ لوگ قابض ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے ایک دو بڑے سرکاری دفاتر کی جگہ بھی لیاقت علی خان کی ملکیت تھی' جبکہ لارنس روڈ پر ایک بہت قیمتی زمین آج لیاقت علی خان کے خاندان کے افراد کے پاس ہے اور اس کی قیمت اس وقت کروڑوں میں ہے۔

لیاقت علی خان کی شادی رعنا نامی ایک خاتون سے ہوئی جو بیگم رعنا لیاقت علی خان کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ رعنا لیاقت علی خان پہلے ہندو تھیں' جوانی میں عیسائی مذہب اختیار کیا۔ اگرچہ اس بات کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کب اسلام قبول کیا' تاہم دو تین واقعات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جب ان کی شادی لیاقت علی خان کے ساتھ ہوئی تو وہ مسلمان تھیں۔ جبکہ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے آخر تک اسلام قبول نہیں کیا۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کی سیاسی زندگی لاتعداد الزامات کی زد میں رہی۔ تحریک پاکستان میں فعال شخصیت میں سے آج بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو لیاقت علی کی سیاسی زندگی اور وزارت اعظمیٰ کے دوران کیے گئے اقدامات اور فیصلوں پر کڑی

تنقید کرتے ہیں۔ جیسے سردار شوکت حیات بارہا اس بات کا دعویٰ کر چکے ہیں کہ لیاقت علی خان نے بہت سے جمہوریت کش اقدامات کیے اور ہر اس شخص کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا جو جمہوریت اور جمہوری اقدار کا حامی تھا۔ لیاقت علی خان کی شخصیت میں ایک طرح کی آمریت پورے زور کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حقیقت میں بھاری اکثریت کے باوجود ان کی کابینہ اور پارٹی ملک میں صحت مندانہ رجحانات اور ایک جمہوری فضا قائم کرنے میں ناکام رہی۔ لیاقت علی خان آئین سازی کے سلسلہ میں ایسے اصول عوام کے سامنے پیش کرنے سے قاصر رہے' جو پاکستان کے تمام صوبوں کے لیے قابل قبول ہوتے۔ حتیٰ کہ جب لیاقت علی خان نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی تو مشرقی بنگال کے سیاستدانوں اور چھوٹے صوبوں نے اس کا بہت برا منایا۔

لیاقت علی ایک حد تک شخصی آمریت کے حامی تھے اور لاتعداد معاملات میں اپنے سوا کسی دوسرے فرد کی مداخلت بھی ان کو بہت ناگوار گزرتی۔ حتیٰ کہ لیاقت علی خان کابینہ کے اجلاس میں فیصلہ کرنے کی خاطر وزراء میں رائے شماری کراتے۔ ان کا یہ عمل پارلیمانی طرز حکومت کے قطعی منافی تھا اور ان کے اس عمل سے وزراء میں اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔

پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے حزب اختلاف کو ملک میں پنپنے ہی نہیں دیا۔ کسی بھی معاملے پر حکومت کی مخالفت اصل میں ملک کی براہ راست مخالفت کے مترادف تھی۔ وہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں روایتی رشتہ برقرار نہ رکھ سکے جس کی پارلیمانی طرز حکومت کی کامیابی کے لیے ضرورت رہتی ہے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں اور راہنماؤں کو محض اپنی ذات کی مخالفت کی بنا پر غدار وطن' دشمن دین اور بیرونی ایجنٹ قرار دیا۔ یوں اس منفی سیاسی روش کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اپنے سے زیادہ معتبر سیاستدانوں جن میں حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین جیسے لوگ شامل تھے' ان پر بھی وطن دشمنی کا لیبل لگایا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب سیاسی فہم و فراست سے عاری تھے' مگر ان میں ایک خوبی تھی کہ وہ جاگیردار اشرافیہ کو اکٹھا رکھ کر اس کی قیادت کر سکتے تھے۔ یہ

صلاحیت تحریک پاکستان کے دوران تو خوب ان کے کام آئی' مگر وزیراعظم بننے کے بعد ان کی کمزوریاں کھل کر سامنے آئیں۔ مغربی پاکستان کی جاگیردار اشرافیہ سے نواب صاحب بہت خائف تھے' لہٰذا انہوں نے اردو بولنے والے مہاجرین کو کراچی میں اکٹھا کر لیا تاکہ وہ اسے اپنا حلقہ انتخاب بنا سکیں۔ ان کی اس روش نے ملک بنتے ہی تنگ نظری کی فضا کو جنم دیا جس سے آگے چل کر ملک دولخت بھی ہوا اور باقی ماندہ پاکستان میں بھی صوبائی رجحانات پنپنے لگے۔ اپنی انہی سیاسی کج فہمیوں کی وجہ سے ہی خان صاحب بیوروکریسی کے آلہ کار بن کر ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے اور یوں وہ قائداعظم کی روش سے ہٹ گئے۔ جناب قائد بیوروکریسی پر ہمیشہ مقننہ کو مقدم سمجھتے تھے لیکن خان صاحب اس کے برعکس بیوروکریسی میں گھر کر رہ گئے۔

وہ اپنی عوامی سیاست میں بھی بیوروکریٹس کی معاونت لیتے تھے۔ یوں انہوں نے آغاز میں ہی مسلم لیگ کی جمہوری روح کچل ڈالی' جس کا قائداعظم کو ہمیشہ دکھ رہا۔ خان لیاقت علی خان اور ان کے حواریوں نے قائداعظم جیسی ہستی کو اس قدر بے بس کر کے رکھ دیا کہ وہ کراچی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ قائداعظم نے کئی مقامات پر اس ٹولے کا ذکر کیا' یہاں تک کہ انہوں نے اپنی جیب کے کھوٹے سکے بھی قرار دیا۔ بقول فاطمہ جناح جب قائداعظم زیارت میں تھے تو وزیراعظم صاحب ان سے ملنے کے لیے گئے۔ جناب قائد اپنی آرام گاہ میں تھے اور انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو بتایا کہ یہ شخص میرے سانس گن رہا ہے اور میرے مرنے کے انتظار میں ہے۔

قائداعظم کی موت بھی ایک داستان بن گئی جس کسمپرسی میں ان کا انتقال ہوا اور حکومت نے جس سردمہری کا اظہار کیا' اس نے خان لیاقت علی خان کی حیثیت کو مشکوک بنا دیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد سیاسی قیادت کی فراخ دلی' وسعت نظری اور جمہوری روایات کی بھی موت واقع ہو گئی۔ نواب صاحب کی ذات شریف میں اقرباء پروری کی روش پہلے سے ہی پائی جاتی تھی۔ جب ہندوؤں کی خالی کی ہوئی جائیدادیں الاٹ کی گئیں تو نواب صاحب' ان کے خاندان اور حواریوں کو عمدہ قسم کی جائیدادیں دی گئیں۔

نواب صاحب کے چچیرے بھائیوں کو لاہور کے دونوں سینمے اور انگلو عربک

خانہ الاٹ کر دیا گیا۔ ان کے رشتہ داروں کو مال روڈ پر بھی عمارتیں الاٹ کی گئیں۔ نواب صاحب کے ساتھ آنے والے ان کے حواریوں اور رشتہ داروں کو جب لاہور اور پنجاب میں جائیدادیں اور جاگیریں الاٹ ہوئیں تو یہاں کی مقامی اشرافیہ سے ان کا تضاد شروع ہو گیا' جس کا اظہار مرکز اور پنجاب کی کھینچا تانی میں بھی نظر آیا۔

خان صاحب نے کراچی میں اردو بولنے والے لوگوں کو کاروباری سہولتیں بہم پہنچائیں اور پنجاب کے کاروباری گھرانوں کو نظرانداز کیا' جس کی وجہ سے کاروباری طبقے میں بھی لیاقت علی خان کے حامی اور مخالفین کی صورت میں گروہ بندی ہو گئی' جس کا ملک کی معیشت اور سیاست کو خاص طور پر نقصان پہنچا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خان صاحب وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے اور نوزائیدہ مملکت کے راستوں کو درست کرنے کے لیے پوری سیاسی قیادت کو ساتھ لے کر چلتے مگر یہ ہو نہ سکا اور تضادات کے بھڑکتے ہوئے شعلے خود لیاقت علی خان کے اپنے دامن تک پہنچے اور وہ اس کی نذر ہو گئے۔

میر مرتضیٰ بھٹو

میر مرتضیٰ بھٹو کو ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو غصیلہ نوجوان کہتے تھے۔ وہ حالات ناراضگی اور غصے میں ہی ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو پولیس کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو لاڑکانہ کے سیاسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا سیاست انھیں ورثے میں ملی اور ورثہ حاصل کرنے کے لیے وہ مسلسل اپنے انداز کی جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ اپنی بہن بے نظیر کی طرح وہ آکسفورڈ میں محض اس لیے مشہور تھے کہ وہ تیسری دنیا کے ایک ملک کے معروف وزیراعظم کی اولاد تھے۔ جب ۵ جولائی ۱۹۷۷ء میں ان کے والد کی حکومت مارشل لائی آمریت کے نیچے روند دی گئی تو وہ ملک چھوڑ گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے والد کے خلاف قتل کا مقدمہ چلا جس کے خلاف ان کی والدہ محترمہ نصرت بھٹو اور ان کی بہن نے اپنے تئیں جدوجہد کی۔ جس کی بنا پر آغاز میں ہی بے نظیر بھٹو ان پر سبقت لے گئیں۔

اپنے باپ کی رہائی اور مارشل لاء حکومت کے خاتمے کے لیے جہاں بے نظیر بھٹو نے آئینی سیاسی راستے کا انتخاب کیا' وہاں مرتضیٰ بھٹو اپنے مزاج کے مترادف مسلح مزاحمت کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کی رہائی کے لیے بے شمار ملکوں کے سربراہوں سے رابطے کیے جن سے ان کے باپ کی اچھی دوستی تھی۔ ان رابطوں سے وہ ضیاء الحق حکومت پر اپنے باپ کی رہائی کے لیے دباؤ ڈلوانا چاہتے تھے۔ ان تمام

کاوشوں کے باوجود جب وہ اپنے باپ کی جان نہ بچا سکے تو انہوں نے ضیاء آمریت کا تختہ الٹنے کے لیے مزاحمت شروع کر دی۔ وہ یہ نہ بھانپ سکے کہ افغانستان کی جنگ کی وجہ سے ضیاء الحق امریکہ کی ضرورت ہے لہٰذا مرتضیٰ بھٹو کی معمولی مزاحمت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو کی اسی مزاحمتی لڑائی کی بناء پر مارشل لاء حکومت نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے را اور خاد کی معاونت سے الذوالفقار نامی تنظیم قائم کی ہے جو پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر رہی ہے۔ اس وقت مرتضیٰ بھٹو کابل میں مقیم تھے اور پاکستان سے افغانستان جانے والے سیاسی کارکنوں کے لیے وہ محور بن چکے تھے۔

ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کابل میں قیام کے دوران کابل میں پہلے سے مقیم اجمل خٹک کے بہت زیادہ زیر اثر تھے۔ جب سلام اللہ ٹیپو پی آئی اے کا طیارہ اغواء کر کے کابل لے گیا تو اس کی ذمہ داری بھی الذوالفقار پر ڈالی گئی۔ ان پر لاہور میں چودھری ظہور الٰہی کے قتل کا الزام بھی لگایا گیا۔ پھر جب ایم آر ڈی کی مارشل لاء کے خلاف تحریک بنی تو اس تحریک کا مرکز سندھ بن گیا اور بحالی جمہوریت کی تحریک کے دوران سندھ میں ہونے والی تخریبی کارروائیوں کی ذمہ داری بھی مرتضیٰ بھٹو پر ڈالی گئی۔ حالانکہ ان کارروائیوں کا بہانہ کر کے ضیاء آمریت نے اندرون سندھ ریاستی تشدد کی انتہا کر دی اور معصوم سیاسی کارکنوں کو گولی' لاٹھی اور کوڑوں کا نشانہ بنایا۔

ملک میں ہونے والی تمام تخریبی کارروائیاں الذوالفقار کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھیں اور ان کے مقدمات مرتضیٰ بھٹو کے خلاف قائم کیے جاتے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو پر یہ الزام بھی رہا کہ وہ اندرا گاندھی سے ملے اور ضیاء الحق کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اس سے مدد مانگی۔ اندرا گاندھی نے ان کو پیپلز لبریشن آرمی بنانے کا مشورہ دیا مگر عالمی سیاسی کشیدگی کے پیش نظر ہندوستان کی سرزمین استعمال میں لانے سے انکار کر دیا۔

مرتضیٰ بھٹو نے سیاسی جدوجہد کے جس راستے کا انتخاب کیا تھا' اس نے پاکستان میں داخلے کے راستے مسدود کر دیئے۔ وہ چاہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت

ان کے ہاتھ آئے مگر پی پی پی کی مرکزی قیادت ان کی نسبت بے نظیر کی حمایت کرتی تھی۔ لہٰذا جب ۱۹۸۶ء میں بے نظیر پاکستان پہنچی تو انہوں نے براہ راست پارٹی قیادت سنبھال کر سیاست شروع کر دی اور یوں مرتضیٰ بھٹو کا پی پی پی کو لیڈ کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر بھٹو وزیراعظم منتخب ہوئیں تو ان کی والدہ نصرت بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو کے خلاف عائد مقدمات واپس لینے اور اسے پاکستان آنے کی اجازت دینے کا اصرار کیا۔ مگر بے نظیر بھٹو نے صدر اسحاق' پاکستان کی مقتدر قوتوں اور اپنے سیاسی مستقبل کے خوف سے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس سے دونوں بہن بھائیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

محترمہ نصرت بھٹو نے اپنے واحد زندہ بیٹے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی مگر حکومت نہ مانی۔ انہوں نے ہر الیکشن کے موقع پر بے نظیر سے مرتضیٰ بھٹو کو الیکشن لڑوانے کے لیے دباؤ ڈالا مگر بے نظیر ہمیشہ ٹالتی رہیں۔ اس طرح دونوں بہن بھائیوں کے سیاسی راستے جدا جدا ہو گئے۔ دوسری طرف بے نظیر بھٹو کے پی پی پی کے بنیادی منشور سے انحراف رہا۔ کارکنوں کی بڑھتی ہوئی بد دلی اور پی پی پی کی قیادت کی مالی اور سیاسی بدعنوانیوں کو دیکھتے ہوئے مرتضیٰ بھٹو نے الگ سے سیاسی جماعت بنانے کا پروگرام بنایا اور یوں انہوں نے ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ملک سے باہر رہ کر شرکت کی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ رکن منتخب ہونے کے بعد وہ وطن واپس آئے تو کثیر تعداد میں مقدمات ان کے انتظار میں تھے۔ ان کی وطن واپسی کو اکثر و بیشتر لوگوں نے بہن وزیراعظم بے نظیر اور مرتضیٰ کے درمیان باہمی سمجھوتے کا نتیجہ قرار دیا مگر گزرنے والے ہر لمحے نے اس قیاس آرائی کی تردید کی۔

انہوں نے وطن واپس آکر پی پی پی (شہید بھٹو گروپ) تشکیل دیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنے باپ کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ انہوں نے حب الوطنی جتانے' اپنے اوپر وطن دشمنی کے الزام کی تردید کرنے اور مقتدر حلقوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے بے نظیر کی ملکی سالمیت کے خلاف پالیسیوں کی شدید مزاحمت کی۔ انہوں نے بے نظیر کو سیکورٹی رسک قرار دیا۔ دوسری طرف پی پی پی کے بنیادی منشور کو آگے بڑھانے کا چرچا کر کے وہ خاصے کامیاب رہے۔ جس سے نہ صرف انہوں نے

اپنی ماضی کی بری شہرت کو ختم کیا بلکہ پی پی پی کے ناراض کارکنوں کو مجتمع بھی کر لیا اور یوں وہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک قد آور سیاسی شخصیت بن گئے۔

حکمران گروہ کے دوسرے افراد کی طرح مرتضٰی بھٹو بھی جب عملی سیاست میں آئے تو انہوں نے بھی مروج سیاست کو ہی اپنایا۔ ان کے پارٹی کے کارکن دوسری پارٹیوں کے کارکنوں کی طرح کارروائیاں کرتے تھے۔ کراچی میں ان کے گروپ کی غنڈہ گردی بھی ایم کیو ایم کی طرح ہوتی گئی۔ مرتضٰی بھٹو کے کارکن دکانوں سے زبردستی چندہ وصول کرنے لگے اور سیاسی احتجاج کے لیے بھی انہوں نے تشدد کی راہ اپنائی۔ ان کی اپنی بہن بے نظیر بھٹو جو کہ وزیراعظم تھیں' نے ان کے گروپ کے خلاف کارروائیاں کیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر لاڑکانہ پولیس نے ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ المرتضٰی پر آنسو گیس پھینکی اور کارکنوں پر گولی چلائی۔ جس سے تین کارکن جاں بحق ہوگئے۔ حکومت نے اس واقعہ پر کہا کہ المرتضٰی میں اس وقت را کے ۲۰۰ ایجنٹ چھپے ہوئے تھے۔ جنہوں نے یہ گڑبڑ کی۔ حکومت کے اس موقف کے بعد مرتضٰی کی عوامی ساکھ ایک بار پھر متاثر ہوئی مگر اس کے باوجود بے نظیر بھٹو کی حکومت کی ناکامیوں کی وجہ سے بددل ہونے والے کارکن مرتضٰی بھٹو کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے اور وہ سرحد' سندھ اور پنجاب میں دھڑا دھڑ دفاتر کھول رہے تھے۔ مرتضٰی بھٹو نے اپنی ماضی کی شہرت کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو سنجیدہ سیاست دان منوانے کی کوشش کی جس میں وہ خاصے کامیاب ہوئے مگر پی پی پی کی حکومت کا ان کی پارٹی پر جبرو تشدد بڑھتا گیا۔

انہوں نے اس بڑھتے ہوئے ریاستی تشدد کے خلاف سیاسی لڑائی لڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے یہ معاملات سندھ اسمبلی میں بھی اٹھائے مگر کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔ کراچی میں جاری فوجی آپریشن کی وجہ سے ایم کیو ایم کے بہت سارے مطلوب افراد بھی مرتضٰی بھٹو کی بے باک اور محفوظ چھتری کے نیچے جمع ہونے شروع ہوگئے۔ جس کی وجہ سے مرتضٰی بھٹو کی پارٹی غیر صحت مند راستوں پر چل پڑی۔ جس کی بنا پر ایک وقت یہ آیا کہ خود مرتضٰی بھٹو کو گھاتوں کی سیاست میں کودنا پڑا اور یہیں سے وہ سفر شروع ہوا جو ۲۰ ستمبر کو ان کی ہلاکت پر تمام ہوا۔ اپنی زندگی کو درپیش

خطرات سے وہ اکثر و بیشتر حکام کو مطلع کرتے رہے اور آخری دن بھی اجتماع عام سے خطاب کے بعد انہوں نے پریس کانفرنس میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ کچھ لوگ ان کو مروانا چاہتے ہیں مگر افسوس انہوں نے ان لوگوں کے نام نہ بتائے اور نہ ہی آئندہ کوئی انکوائری اور کمیشن یہ نام بتا سکے گا کیونکہ بظاہر یہ قتل معمولی پولیس مقابلہ قرار پایا مگر کون جانے ۲۷۰۰۰ ایکڑ کے مالک سابق وزیراعظم کے فرزند اور ایک وزیراعظم کے بھائی کے قتل کے پیچھے کون کون سے لوگ اور کیسے محرکات تھے۔

ملک مشتاق اعوان

ملک مشتاق احمد اعوان کی شخصیت کے تمام پہلو اس وقت کھل کر سامنے آئے جب ستمبر ۹۵ء میں پیپلزپارٹی کی حکومت نے وٹو جیسے "تلخ" تجربے سے چھٹکارا حاصل کر کے مسلم لیگ (ج) کے بزرگ صوبائی وزیر سردار عارف نکئی کو بطور وزیر اعلیٰ قبول کیا اور مخدوم الطاف جیسی بھاری بھر کم شخصیت کو پنجاب میں سینئر صوبائی وزیر مقرر کر دیا۔ ملک مشتاق اعوان اور ناظم حسین شاہ وزارت اعلیٰ کے بہت بے تاب امیدوار گردانے جا رہے تھے لیکن انھیں وزارت اعلیٰ تو کجا ڈھنگ کی وزارت بھی نصیب نہ ہو سکی۔

مخدوم الطاف کو صوبائی انتظامی ڈھانچے کے طاقتور ترین شعبے ایس اینڈ جی اے ڈی کے علاوہ داخلہ اور خزانہ کا بھی چارج دیا گیا۔ عارف نکئی اور مخدوم الطاف کے انتخاب کے بعد ملک مشتاق اعوان اور ناظم حسین شاہ نے خفیہ طور پر وٹو کے سابق وزیر قانون چودھری فاروق کی معرفت وٹو سے رابطہ کرنا چاہا لیکن وہ اس وقت تک میاں نواز شریف کے چرنوں میں جگہ حاصل کر چکے تھے۔ ملک مشتاق اعوان اپنے طور پر سمجھے بیٹھے تھے کہ بے نظیر ان کی ذاتی "کوشش" سے میاں منظور وٹو کی "بدعنوان حکومت" ختم کرنے پر مجبور ہوئی ہیں لہٰذا وہ "صلہ" کے طور پر انھیں وزارت اعلیٰ پیش کر دیں گی۔ مشتاق اعوان اپنے بارے میں یقین پختہ کرنے کے لیے فیصل صالح حیات تک جا پہنچے تھے۔ بے نظیر بھٹو کو جس چیز نے اس بات پر مجبور کیا

کہ وہ مشتاق اعوان کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ نہ بنائے' وہ مرحوم مخدوم الطاف احمد کی تیار کردہ ایک رپورٹ تھی جس میں میاں منظور وٹو' مشتاق اعوان گٹھ جوڑ اور پنجاب میں ۴۲ ہزار اساتذہ کی تقرریوں کے سلسلے میں مشتاق اعوان اور منظور وٹو کی کوششوں کا احوال تھا۔

اساتذہ کی تقرریوں کا احوال کچھ یوں ہے کہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۵ء کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں منظور احمد وٹو نے صوبائی وزیر تعلیم ریاض فتیانہ' وزیر بہبود آبادی و جیل خانہ جات خوش اختر سبحانی' مسلم لیگ (ج) کے مقامی رہنما میاں آصف' وزیر ہاؤسنگ اور پی پی پنجاب کے صدر ملک مشتاق اعوان' وزیر بلدیات ناظم حسین شاہ اور افضل چن کو اچانک وزیر اعلیٰ ہاؤس طلب کر لیا۔ شرکائے اجلاس نے مخدوم الطاف احمد کو اس اجلاس سے دور رکھا کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ مخدوم الطاف ان کی کسی بدعنوانی میں شمولیت نہیں کریں گے اور اس صورت میں ان کو بلانا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف تھا۔ منظور وٹو نے اجلاس شروع کرتے ہی پنجاب میں ۴۲ ہزار اساتذہ کی آسامیوں کی "باہمی بانٹ" طے کرنا چاہی' شرکائے اجلاس ابھی چہ میگوئیوں میں مصروف تھے کہ میاں منظور وٹو نے اعلان کر دیا کہ ان کی جماعت مسلم لیگ (ج) ۳۰ ہزار آسامیاں خود پر کرے گی جبکہ باقی ماندہ ۱۲ ہزار آسامیاں پی ڈی ایف کی دیگر اتحادی جماعتیں پر کریں گی۔ عین اس وقت ملک مشتاق اعوان نے اپنی واسکٹ کی جیب سے فیصل صالح حیات کی تیار کردہ ایک فہرست نکال کر میز پر رکھ دی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ فیصل صالح حیات کی فہرست میں اساتذہ کی ۴۲ ہزار اسامیوں سے سے ۲۱ ہزار پی پی لینا چاہتی تھی۔

جبکہ ۲۱ ہزار اسامیاں مسلم لیگ (ج) اور پی ڈی ایف کی دیگر جماعتوں کو دینے کی تجویز تھی۔ اس کے علاوہ فہرست میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ وٹو گورنر سروپ کے رولز آف بزنس پر عمل کرتے ہوئے صوبہ میں گریڈ اٹھارہ اور اس سے اوپر کے افسروں کے تقرر و تبادلے کے اختیارات گورنر کو دیں۔ وفاقی حکومت کو صوبے میں اپنا چیف سیکرٹری مقرر کرنے دیں۔

اجلاس ختم ہوا تو یہ معاہدہ طے ہو چکا تھا کہ پنجاب میں اساتذہ کی ۴۲ ہزار

اسامیاں شرکائے اجلاس میں برابر تقسیم کردی جائیں جن کا تناسب اس طرح سے ہو کہ صرف منظور وٹو اور ملک مشتاق اعوان کو باقی حاضرین اجلاس سے دو گنا اسامیاں ملیں گی۔ جبکہ باقی تمام حاضرین میں برابر تقسیم ہوں گی۔ آئی بی ایک افسر نے اس اجلاس کی پوری کارروائی مخدوم الطاف حسین تک پہنچا دی اور مخدوم الطاف اس رپورٹ کو وزیراعظم بے نظیر تک لے گئے۔ بے نظیر نے فوری طور پر اس وقت کے گورنر راجہ سروپ کو آگاہ کیا اور پنجاب میں ۴۲ ہزار اساتذہ کی تقرری والے پلان کو سرد خانے میں ڈال دیا۔

لیکن مشتاق اعوان پر قسمت اچانک اس وقت مہربان ہوگئی جب یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء کو پنجاب کے سینئر صوبائی وزیر مخدوم الطاف احمد وفات پا گئے اور ملک مشتاق اعوان کو صوبے کا سینئر وزیر مقرر کر دیا گیا۔ مشتاق اعوان کی دیرینہ مراد بر آئی۔ انہوں نے اپنے الگ سیکرٹیریٹ میں حاجی محمد آصف کو اپنا پولٹیکل سیکرٹری رکھ لیا اور ایک ایڈیشنل سیکرٹری' چھ عدد ڈپٹی سیکرٹری اور آٹھ سیکشن افسر و انڈر سیکرٹری اپنے پاس بلا لیے۔

ایس اینڈ جی اے ڈی سے ۸' محکمہ داخلہ سے ۶' محکمہ خزانہ سے ۹ اور موٹر ٹرانسپورٹ ونگ سے ۵ گاڑیاں منگوا لیں۔ تمام گاڑیاں فوری طور پر اپنے عزیز و اقارب میں بانٹ دیں۔ موٹر ٹرانسپورٹ کی ایک نسان پٹرول گاڑی اپنے برادر نسبتی کے حوالے کر دی۔ سینئر وزیر کے برادر نسبتی نے موٹر ٹرانسپورٹ ونگ کا تقریباً سوا تین لاکھ روپیہ پٹرول اور مرمت وغیرہ کی مد میں خرچ کر دیا۔ سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان کی سیاسی زندگی میں یہ پہلی بار ہوا کہ انہیں پوری طاقت کے ساتھ اختیارات آزمانے کا موقع ملا۔

مشتاق اعوان کا تعلق شیخوپورہ کے ایک نواحی گاؤں (کدلسی) سے ہے۔ کھاریانوالہ یونین کونسل کے اس گاؤں میں اعوان' ورک اور آرائیں برادریاں آباد ہیں۔ اس نیم پسماندہ گاؤں کی آبادی ۴ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ "کدلسی" نام کے اس گاؤں کا تاریخی پس منظر اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ روایت کے مطابق ایک قافلہ یہاں سے گزر رہا تھا اور قافلے میں شامل ایک عورت گھوڑے سے چھلانگ لگا کر

یہاں اجڑ گئی اور پھر یہ قافلہ اس جگہ آباد ہو گیا۔ عورت کے چھلانگ لگا کر اترنے سے اس جگہ کا نام "ٹھڈ لسی" پڑ گیا۔ "ٹھڈ لسی" پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "چھلانگ لگا کر اترنے والی" کے ہیں۔ اس گاؤں کی اعوان برادری کے ایک بے زمین غریب باسی نے پولیس میں سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی اور گاؤں کو چھوڑ کر ے کلومیٹر کے فاصلے پر آباد شہر شیخوپورہ کے محلہ "ہنجراواں" میں ایک کمرے کا مکان خرید لیا اور بیوی بچوں سمیت اس مکان میں منتقل ہو گیا۔ غلام قادر کے چھ بیٹے ہوئے جن کے نام بالترتیب درج ذیل ہیں:

ملک حبیب اعوان' ملک حمید اعوان' ملک عزیز اعوان' ملک انور اعوان' ملک مشتاق اعوان اور ملک اشتیاق اعوان۔

غلام قادر کے بڑے بیٹے ملک حبیب اعوان نے شیخوپورہ کچہری جانا شروع کیا اور مختلف مجسٹریٹوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ملک مشتاق اعوان سینئر وزیر بنے تو ملک حبیب اعوان اسسٹنٹ کمشنر شیخوپورہ رفیق اعوان کے ساتھ ان کی عدالت میں موجود ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ اسسٹنٹ کمشنر رفیق اعوان پنجاب کا متنازعہ ترین پی سی ایس افسر ہے جس کو خاص طور پر سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان نے اسسٹنٹ کمشنر شیخوپورہ تعینات کرایا تھا۔

دوسرے نمبر پر آنے والے ملک حمید اعوان محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد فارغ ہیں۔ تیسرے نمبر پر ملک عزیز اعوان ٹیچر ہیں اور آج کل لاہور میں ملازمت کر رہے ہیں۔ چوتھے نمبر پر ملک انور اعوان اپنی فیملی کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں۔ پانچویں نمبر پر ملک مشتاق اعوان ہیں جبکہ آخر پر ملک اشتیاق اعوان ہیں جو مبینہ طور پر ملک مشتاق اعوان کی سینئر وزارت کے دوران سینئر وزیر کے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے تھے۔ آج کل شیخوپورہ میں پی پی پی کا دفتر بنا کر مقامی سطح کی سیاست کر رہے ہیں۔

ملک مشتاق اعوان نے بی۔ اے ایل ایل بی کیا اور ۱۹۶۵ء میں شیخوپورہ میں وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۷۰ء میں مشتاق اعوان نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ سیاست کے ساتھ ساتھ ایک درمیانے درجے کے وکیل کی حیثیت سے پریکٹس

کرتے رہے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پی پی پی نے ملک مشتاق اعوان کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا۔ مشتاق اعوان نے قومی اسمبلی کی نشست آسانی کے ساتھ جیت لی۔ اس کے بعد وہ بڑے بھرپور انداز میں ایم آر ڈی میں شامل ہوگئے۔ گرفتاری کے بعد انھیں لاہور کے شاہی قلعہ میں بند کر دیا گیا جہاں مشتاق اعوان کے بقول ان پر تشدد کیا گیا۔ اس دوران ان کی معاشی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ وکالت بھی کم ہی چلتی تھی حتیٰ کہ دوست احباب نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

۱۹۸۸ء میں مشتاق اعوان نے انتخابات کے لیے شیخوپورہ سے قومی اسمبلی کی نشست کے پی پی پی کی طرف سے کاغذات جمع کرائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مشتاق اعوان روابط کے ضلع کے طاقتور افراد سے قائم ہوئے۔ مشتاق اعوان کی طرف سے کامیابی کی صورت میں ان لوگوں کو فوائد پہنچانے کے وعدوں پر مشتاق اعوان کی انتخابی مہم ان لوگوں نے سنبھال لی جو سماجی اور سیاسی طور پر مقامی سطح پر بااثر تھے۔ یاد رہے کہ شیخوپورہ ایسا ضلع ہے جہاں انتخابات میں کامیابی کے لیے پیشہ ور افراد پوری طرح سرگرم رہتے ہیں اور اس نوعیت کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ ان مذکورہ بالا پیشہ ور افراد نے امیدواروں کے مالی اخراجات برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلح افراد کی مدد سے پولنگ اسٹیشنوں پر قبضہ کر کے اپنے امیدوار کو کامیاب بھی کروایا۔

۱۹۸۸ء میں ملک مشتاق اعوان الیکشن جیت کر وفاقی کابینہ میں وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ و پلاننگ کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔ ان کے انتخابی فنانسروں اور سپورٹروں نے شیخوپورہ میں خوب پر پرزے نکالے۔ اٹھارہ سال کی سیاسی مشقت کے بعد ملک مشتاق اعوان کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور انھوں نے شیخوپورہ شہر میں جائیداد بنانا شروع کی۔

ملک مشتاق اعوان کا بااثر مسلح افراد سے رابطہ ضرور رہا لیکن اس دوران انھوں نے کسی مخالف سیاست دان کے ساتھ باقاعدہ دشمنی کا آغاز نہ کیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں ملک مشتاق اعوان جماعت اسلامی کے نذیر ورک کے ہاتھوں قومی اسمبلی کی نشست ہار گئے لیکن ان کی مالی حالت وزیر ہاؤسنگ و پلاننگ بننے کے بعد بہت

مضبوط ہو چکی تھی۔ اس لیے دوبارہ وکالت شروع کرنے کی بجائے سیاسی کاروبار پوری توجہ اور سرگرمی سے جاری رکھا۔

۱۹۹۳ء میں ملک مشتاق اعوان کو پہلی بار صوبائی اسمبلی کی نشست کا ٹکٹ دیا گیا۔ اس مرتبہ ان کو انتخابی مہم چلانے کے لیے ظفر اقبال ڈار اور غلام علی سرہندی جیسے بااثر افراد میسر آ گئے۔ دونوں نے مشتاق اعوان کی انتخابی مہم میں بھاگ دوڑ شروع کر دی اور مسلح افراد کی ایک بھاری تعداد کو مشتاق اعوان کے ساتھ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان مذکورہ افراد کو یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد ان کو شیخوپورہ کی محصول چونگیاں اور بس اسٹینڈ سونپ دیئے جائیں گے اور اگر قسمت نے ان کا مزید ساتھ دیا اور وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے تو ڈار گروپ اور سرہندی گروپ کے دائرہ کار کو لاہور تک بڑھا دیا جائے گا اور راوی پل کا ٹھیکہ بھی ان کو دیا جائے گا۔

مشتاق اعوان وزیر اعلیٰ تو نہ بن سکے البتہ میاں منظور وٹو کی صوبائی کابینہ میں وزیر ہاؤسنگ بن گئے اور انہوں نے اپنے انتخابی ساتھیوں کو ہاؤسنگ سکیموں سے نوازنا شروع کر دیا۔ ہاؤسنگ سمیت دیگر محکموں میں ۳۰ کے قریب لوگوں کو ملازمت دلوائی۔ وٹو کی چھٹی اور سینئر وزیر مخدوم الطاف احمد کی اچانک موت کے بعد مشتاق اعوان کو سینئر صوبائی وزیر بنا دیا گیا۔ ملک مشتاق اور وزیر اعظم کی سیاسی مشیر مس ناہید خان نے مل کر پنجاب میں ایک دھڑے بندی کی بنیاد رکھی۔ پیپلز پارٹی کے اندرونی لوگوں نے اس دھڑے کو "ناہی گروپ" کا نام دیا اور اس گروپ کی بدعنوانیوں کے خلاف اخبارات میں آواز بلند کی۔

مشتاق اعوان کے سینئر وزیر بنتے ہی شہر کی تمام چونگیاں اور بس اسٹینڈ ڈار گروپ اور سرہندی گروپ کے پاس چلے گئے۔ ملک مشتاق اعوان نے ۳۸ منظور نظر افراد میں محکمہ زراعت کی ساڑھے تین کروڑ روپے مالیت کی اراضی بانٹ دی۔ ان افراد نے اس اراضی پر جو شیخوپورہ سبزی منڈی سے ملحق تھی' ۳۸ دکانیں قائم کر لیں۔ سینئر وزیر نے فوری طور پر محکمہ زراعت کو ایک حکم نامہ جاری کر دیا کہ ان لوگوں کو یہ زمین الاٹ کر دی جائے جنہوں نے "عجلت" میں یہ دکانیں تعمیر کر لی ہیں۔ مارکیٹ کمیٹی شیخوپورہ کے ایڈمنسٹریٹر نے ۳۸ افراد کو یہ دکانیں الاٹ کر دیں اور اس

کے لیے اعلیٰ حکام کی اجازت بھی نہ لی۔ ایڈمنسٹریٹر نے فی دکان ۲۲۵ روپے سے ۲۷۵ روپے تک کا کرایہ مقرر کیا۔ جب اس کا علم وزیر زراعت کو ہوا تو اس نے فوری طور پر ایڈمنسٹریٹر کو معطل کر دیا اور الاٹمنٹ غیر قانونی قرار دے دی۔ محکمہ زراعت کی اس قیمتی زمین پر مشتاق اعوان کے بعض حامیوں کا قبضہ ان کے اور وزیر زراعت طارق بشیر چیمہ کے درمیان خاصی تلخی کا باعث بنا۔ مشتاق اعوان کے آدمیوں نے طارق بشیر چیمہ کے گھر داخل ہو کر الاٹمنٹ جائز قرار دینے کا مطالبہ کیا لیکن جب طارق بشیر چیمہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو ان افراد نے طارق چیمہ کے خلاف شدید نعرے بازی کی۔

تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ ملک مشتاق اعوان کے سیکرٹری بشیر احمد نے مشتاق اعوان کی ہدایت پر ان افراد کی فہرست تیار کی تھی۔ مشتاق اعوان نے یہ فہرست سیکرٹری زراعت شفقت ایزدی شاہ کو ڈائریکٹو کے ہمراہ ارسال کر دی۔ لیکن سیکرٹری نے وزیر زراعت طارق بشیر چیمہ سے بات کرنے کے بعد مشتاق اعوان کا ڈائریکٹو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مشتاق اعوان نے محکمہ زراعت کی طرف سے ردعمل معلوم کیے بغیر اپنے چھوٹے بھائی اشتیاق اعوان اور بیٹے کاشف اعوان کو اجازت دے دی کہ وہ ان دکانوں کو ان افراد میں تقسیم کر دیں جن کے نام فہرست میں ہیں لیکن اشتیاق اعوان اور کاشف اعوان میں دکانوں کی تقسیم پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ ذرائع کے مطابق اشتیاق اعوان چھ لاکھ روپے فی دکان کا ریٹ لگانا چاہتے تھے جبکہ کاشف اعوان پانچ لاکھ فی دکان کا ریٹ لگانے پر بضد تھے۔ جیسے ہی مذکورہ دونوں افراد نے دکانیں تقسیم کیں، محکمہ زراعت نے ایڈمنسٹریٹر کو معطل کر کے دکانوں کی الاٹمنٹ منسوخ کر دی۔

جن لوگوں کو ملک مشتاق اعوان کے حکم پر دکانیں الاٹ کی گئیں ان کے نام بالترتیب درج ذیل ہیں:

(۱) مزمل حسین ولد منظور حسین (۲) عبدالرحمٰن ولد محمد حسین (۳) قاسم علی ولد محمد صدیق (۴) محمد صادق ولد کبیر (۵) محمد علی ولد اللہ رکھا (۶) شوکت علی ولد اللہ رکھا (۷) سہیل سرور ولد محمد سرور (۸) محمد رمضان ولد عمر جھنڈا (۹) محمد لطیف ولد رحمت علی (۱۰) مختار ولد جھنڈا (۱۱) محمد بشیر ولد حنیف

(۱۲) محبوب اختر ولد سردار محمد (۱۳) امان اللہ (۱۴) قاسم علی ولد محمد صدیق (۱۵) محمد صدیق ولد احمد دین (۱۶) اللہ رکھا ولد نور محمد (۱۷) شیخ مراتب علی ولد محمد صدیق (۱۸) محمد یوسف ولد محمد صدیق (۱۹) شوکت علی ولد رمضان علی (۲۰) محمد ابراہیم ولد منگو (۲۱) محمد جمیل ولد محمد اقبال (۲۲) محمد افضل ولد محمد دین (۲۳) ملک شفیع ولد میاں عبدالحمید (۲۴) محمد یوسف ولد محمد صدیق (۲۵) منور حسین ولد محمد سرور (۲۶) منظور احمد ولد نور احمد (۲۷) محمد بشیر ولد محمد حسین (۲۸) محمد ارشد ولد سردار محمد (۲۹) نظام علی ولد لیاقت حسین (۳۰) محمد فاروق ولد محمد حسین (۳۱) محمد سرور (۳۲) محمد ریاض گادھی (۳۳) محمد اعظم (۳۴) سعید اقبال (۳۵) محمد عباس ولد محمد شفیع (۳۶) محمد سلطان ولد پیر بخش (۳۷) محمد نذیر بٹ (۳۸) محمد وحید ولد طفیل۔ آج کل ان وکلاء کا کیس عدالت میں چل رہا ہے۔

ملک مشتاق اعوان کے چھوٹے بھائی ملک اشتیاق اعوان نے ان کی وزارت کے دوران لوگوں کے تبادلے کروائے اور رکوائے۔ شیخوپورہ شہر کی روایت رہی ہے کہ جو بھی پارٹی برسراقتدار ہو وہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال شیخوپورہ سے بھتہ وصول کرتی ہے۔

اشتیاق اعوان نے ہسپتال کے ڈسپنسر یاسین کو اس کام کے لیے مامور کیا اور وہ ۴۰ ہزار روپیہ ماہانہ ان کو پہنچاتا رہا۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ریٹ ۳۰ ہزار روپے ماہانہ تھا لیکن ملک اشتیاق اعوان نے اس میں اضافہ کر دیا تھا۔

ملک اشتیاق اعوان نے شیخوپورہ میں باقاعدہ ایک آفس کھول لیا اور پورے شہر سے بھتہ کمیشن وصول کرنے لگا۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال سے متعلقہ کسی شخص کو کوئی کام ہوتا تو وہ ایم ایس کی بجائے ملک اشتیاق اعوان کے پاس جاتا اور پیسے دے کر اپنا کام کرواتا۔ ایک بار نعیم نام کا ایک مقامی ڈاکٹر جو انگلینڈ سے واپس آیا اور اس نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی دگرگوں حالت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ اس ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کام کرے گا اور یہاں آنے والوں کی بہت اچھی خدمت کرے گا۔ ڈاکٹر نعیم ہسپتال کے ایم۔ ایس کے پاس گیا اور ملک اشتیاق

اعوان وہاں موجود تھا جس نے ڈاکٹر نعیم سے ۵۰ ہزار روپیہ طلب کیا۔ ملک اشتیاق اعوان نے کہا کہ پہلا ڈاکٹر ۳۰ ہزار بھتہ دیتا تھا تم ۵۰ ہزار دے دو اور تم یہاں آ جاؤ۔ یہ جواب سنتا تھا کہ ڈاکٹر نعیم واپس برطانیہ چلا گیا۔ اشتیاق اعوان پر یہ بھی الزام ہے کہ انہوں نے شہر میں واقع ایک غریب آدمی کے پلاٹ پر قبضہ کر لیا اور وہاں پی پی پی کا دفتر بنا لیا۔ متاثرہ شخص نے عدالت میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کو گھر سے اٹھا لیا گیا اور اس وقت رہا کیا گیا جب اس سے ملکیتی کاغذات پر دستخط کرا لیے۔ اسی طرح اشتیاق اعوان نے شہر کے وسط میں واقع بلدیہ کے ٹیوب ویل کی جگہ پر قبضہ کر کے پی پی پی کا دفتر بنا دیا اور جو تھوڑی سی جگہ بچی اس پر دو دکانیں تعمیر کرا دیں۔ یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اشتیاق اعوان نے ضلع کونسل برآمدی ٹیکس کی چونگیوں کے ٹھیکے کی رقم میں سے ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم اپنے پاس رکھ لی۔

بعض ذرائع کے مطابق یہ ٹھیکے ۱۱ سے ۱۲ کروڑ تک دیئے جاتے تھے لیکن ملک مشتاق اعوان کئی بولیاں مسترد کر کے اس ٹھیکے کو ۱۳ کروڑ تک لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جس میں سے ساڑھے گیارہ کروڑ بولی دہندہ سے آخری رقم کے طور پر طے کیا گیا جبکہ ڈیڑھ کروڑ روپے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ ملک مشتاق اعوان کے اقتدار سنبھالتے ہی اس کے بھائیوں نے اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ ملک مشتاق اعوان کے بڑے بھائی ملک حبیب اعوان نے ایک مقامی غریب شخص کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ ملک حبیب نے پہلے اس مکان میں پولیس کو بسائے رکھا اور اس کو پولیس چوکی کے نام سے مشہور کر دیا۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد ملک حبیب نے پولیس ملازمین کو مکان سے نکال دیا اور مکان پر خود قابض ہوگئے۔ ملک حبیب نے اس غریب آدمی کو ڈرا دھمکا کر مکان اپنی بیگم کے نام کروا دیا۔ ابھی تک ملک حبیب اعوان اس مکان میں رہائش پذیر ہیں اور اس کے دروازے پر ملک حبیب اعوان کی اہلیہ کا نام مالکن کے طور پر لکھا ہوا ہے۔ ملک مشتاق اعوان جس دن سینئر وزیر بنے تو انہوں نے بلدیہ شیخوپورہ کو حکم دیا کہ ان کے شایان شان استقبال کی تیاریاں شروع کی جائیں۔ ضلع کونسل شیخوپورہ نے فوری طور پر ۶۰ ہزار کے کپڑے کے بینرز لکھوائے اور انہیں پورے شہر

میں آویزاں کر دیا۔ ان بینروں پر خوش آمدید کی نعرے تحریر تھے۔ اس کے ساتھ ہی ضلع کونسل کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ملک مشتاق اعوان اور بے نظیر بھٹو کی تصویر والے پورٹریٹ تیار کروائے۔ ضلع کونسل کی طرف سے ۵۵ ہزار روپے کے پورٹریٹ تیار کروائے گئے جن پر ملک مشتاق اعوان اور بے نظیر کے بازو فاتحانہ انداز میں ہوا میں لہراتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

ملک مشتاق اعوان نے "انجمن بہبود مریضاں" ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال شیخوپورہ کو ۷ لاکھ اور ۱۰ لاکھ روپے کی اقساط کی صورت میں امدادی رقم کی منظوری دی۔ ۱۷ لاکھ روپے کی یہ رقم تقریباً ۲ ماہ کے عرصے میں "انجمن بہبود مریضاں" کو مل گئی اور اگلے دو گھنٹے میں اصل "مستحقین" کو مل بھی گئی تھی۔ اس انجمن کے چیئرمین ملک مشتاق اعوان کے چھوٹے بھائی ملک اشتیاق اعوان تھے جب کہ دیگر عہدیداروں میں قیصر ذوالفقار بھٹی' چودھری زاہد' شوکت کوثر اور پی پی کے ضلعی صدر الطاف ورک شامل تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس رقم کا ایک روپیہ تک بھی کسی مریض پر خرچ نہ کیا گیا۔

شیخوپورہ کا کرکٹ اسٹیڈیم جس کو بے نظیر سٹیڈیم کا نام دیا گیا تھا' مشتاق اعوان نے اپنے تعلق والے افراد کو اس کے ٹرسٹ میں شامل کر لیا تھا۔ جو لوگ "انجمن بہبود مریضاں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال شیخوپورہ" کے رکن تھے ان کو ٹرسٹ کا بھی رکن بنا دیا گیا۔ زمبابوے کے ساتھ پاکستانی ٹیم کا میچ جو شیخوپورہ میں کھیلا گیا' اس کا ٹھیکہ ۷ لاکھ روپے میں ظفر ڈار کو دے دیا گیا۔ جبکہ دیگر پارٹیوں کی طرف سے ۱۳ لاکھ روپے کی بولی بھی دی گئی تھی۔ ذرائع کے مطابق اس ٹھیکے سے ۵ لاکھ روپے کمایا گیا تھا۔

ملک مشتاق اعوان نے اسسٹنٹ کمشنر شیخوپورہ کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ میچ کے تمام ٹکٹ فروخت کروائیں۔ شیخوپورہ کے تمام تعلیمی اداروں میں ۱۰۰ روپے کا ٹکٹ ۲۰۰ اور ۳۰۰ روپے میں فروخت کر کے لاکھوں روپے کمائے گئے۔

مشتاق اعوان انتظامیہ کو اپنے کنٹرول میں کرنے اور مختلف نوعیت کے منافع بخش کام کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسسٹنٹ کمشنر فتح اعوان سے ملک مشتاق

اعوان نے پہلا کام اپنی بیٹی کے امتحانات میں نقل کروانے کا لیا۔ مشتاق اعوان نے ضلعی انتظامیہ کو ہدایت کر دی کہ امتحانی رول نمبر ۳۵۸۹۰ کو علیحدہ کمرہ امتحان "الاٹ" کیا جائے اور اس دوران امیدوار کو "خصوصی رعایت" دی جائے۔ مشتاق اعوان کی بیٹی کے لیے ایک الگ کمرہ امتحان کا انتظام کیا گیا۔ مقامی اخباری نمائندوں کی طرف سے جب اس امتیازی سلوک کے بارے میں خبریں چھپنا شروع ہوئیں تو دو خواتین پر مشتمل سپیشل انسپکشن ٹیم امتحانی مرکز کے معائنہ کے لیے لاہور سے شیخوپورہ پہنچی تو پولیس نے اسے امتحانی مرکز میں داخل ہونے سے روک دیا۔ امتحانی مرکز کے باہر اے سی شیخوپورہ کی گاڑی کھڑی تھی۔ رفیق اعوان خود مشتاق اعوان کے لیے سرگرم تھا۔ انسپکشن ٹیم نے جب لاہور رابطہ کیا تو محکمہ تعلیم کی مزید ایک اور ٹیم شیخوپورہ پہنچ گئی۔ مشتاق اعوان کی اہلیہ خود آکر امتحانی کمرہ کے باہر بیٹھ گئیں اور محکمہ تعلیم کے عملہ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔

مشتاق اعوان جنہوں نے وزیر اعلیٰ انسپکشن ٹیم کی عمارت میں اپنا سیکرٹریٹ قائم کر رکھا تھا' کو باقاعدہ ہیڈ کوارٹر کی شکل دے دی۔ مشتاق اعوان نے عبدالقادر شاہین کو اپنے ساتھ اپنے سیکرٹریٹ میں بٹھا دیا۔ بعض ذرائع کے مطابق عبدالقادر شاہین مشتاق اعوان سے مل کر لاکھوں روپے وصول کر کے لوگوں کو مختلف محکموں میں بھرتی کراتے رہے۔

ملک مشتاق اعوان کا سب سے کامیاب "گروپ" وزیراعظم کی سیاسی مشیر ناہید خاں کے ساتھ رہا۔ جب یہ دونوں ہستیاں پنجاب میں "پارٹی کاز" کے نام پر کروڑوں روپے کا فنڈ اکٹھا کر رہی تھیں تو اس وقت مشتاق اعوان اور ناہید خاں مخالف پی پی پی کے اراکین اسمبلی نے ان کے خلاف ذرائع ابلاغ میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ناہید خاں اور مشتاق اعوان گٹھ جوڑ کو "باجی گروپ" کا نام دیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ مشتاق اعوان اور ناہید خاں نے مل کر نیویارک میں ایک مہنگا ہوٹل خریدا ہے جس کی دیکھ بھال مشتاق اعوان کا چھوٹا بھائی اشتیاق اعوان کرتا ہے۔

مشتاق اعوان کی سینئر وزارت کے دوران ضلع شیخوپورہ کے لیے ۵۰ کروڑ روپے کی ترقیاتی سکیموں کی منظوری دی گئی۔ سارے ترقیاتی کاموں کو "پرچی" کی بنیاد

پر بانٹا گیا اور ۹۵ فیصد کام اپنے لوگوں کو دے دیئے گئے۔ ذرائع کے مطابق اس ساری رقم میں سے ۵۳ لاکھ روپے بھی ترقیاتی کاموں پر خرچ نہ کیے گئے اور ساری رقم مخصوص جیبوں میں چلی گئی۔ اس کی واضح مثال ملک مشتاق اعوان کے آبائی گاؤں "ڈھکر لسمی" کو فیصل آباد روڈ سے ملانے کے لیے ۲۲ لاکھ روپے کی لاگت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر لمبی پختہ سڑک اور پل کی تعمیر کا کام ہے۔

ملک اشتیاق اعوان نے یہ ٹھیکہ اپنے بھتیجے اسد ملک کو دلوا دیا۔ حالانکہ اسد ملک کے پاس اس کام کو کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ملک اسد نے یہ ٹھیکہ مبینہ طور پر کچھ کمیشن وصول کر کے ایک مقامی ٹھیکیدار کے حوالے کر دیا۔ مذکورہ ٹھیکیدار نے ۲۰ فیصد کام بھی مکمل نہ کیا تھا کہ بے نظیر حکومت ختم کر دی گئی اور یہ کام جوں کا توں پڑا ہے۔ سڑک پر کوئی کام نہیں ہو سکا جبکہ پل کی دیواریں تعمیر کر دی گئی ہیں۔

اس طرح ملک اشتیاق اعوان نے کمیشن کی صورت میں وصول ہونے والی رقم سے ساہو کی ملیاں میں ۲ ایکڑ اراضی خریدی اور اس پر ڈیری فارم کی تعمیر شروع کرا دی۔ ملک مشتاق اعوان نے قریبی بھٹہ خشت سے ۲۷ ہزار روپے کی اینٹیں خرید لیں لیکن اینٹوں کا بل ادا نہ کیا۔ ابھی ڈیری فارم تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھا کہ حکومت ختم کر دی گئی اور کام وہیں رک گیا۔ اس وقت ڈیری فارم کی دیواریں بارشوں کے باعث گر چکی ہیں جبکہ ڈیری فارم پر رکھی ہوئی چھ گائیں ان کا ملازم کرامت چنگڑ "ڈھکر لسمی" لے آیا ہے۔ ذرائع کے مطابق یہ گائیں گوجرانوالہ' لاہور' گجرات' اوکاڑہ اور فیصل آباد کی ضلع کونسلوں نے تحفے میں دی تھیں۔

ملک مشتاق اعوان جہاں "خود نوازی" کی ایک "شاندار تاریخ" رقم کرتے رہے وہاں انہوں نے شیخوپورہ میں اپنے حواریوں کو بھی بے تحاشا مواقع فراہم کیے۔

مشتاق اعوان نے بلدیہ شیخوپورہ' بلدیہ مریدکے میں اپنے تین حامی افراد کے بیٹوں کو نوکریاں دلوا دیں۔ یہ نوکریاں بغیر کسی گنجائش کے پیدا کی گئیں۔ اپنے ایک مقامی ساتھی ظفر ڈار کے بیٹے ذیشان ظفر ڈار کو ڈپٹی چیف آفیسر بلدیہ شیخوپورہ میں عارضی ملازم کرایا۔ مشتاق ڈوگر کے بیٹے اشتیاق ڈوگر کو بلدیہ مریدکے میں ڈپٹی چیف آفیسر جبکہ عبدالرحمن ورک کے بیٹے حفیظ الرحمن کو ڈپٹی چیف آفیسر ضلع شیخوپورہ

عارضی طور پر ملازم کرایا۔ ان مذکورہ بالا تینوں افراد کی نوکریوں کو محفوظ بنانے کے لیے پہلے سے تعینات مستقل ڈپٹی چیف آفیسوں کو جبری طور پر رخصت پر بھیج دیا گیا۔ ملک اشتیاق اعوان نے ۳۰۰ افراد کو بلدیہ شیخوپورہ میں "روزانہ اجرت" پر رکھا اور یہ بات صرف ریکارڈ میں لکھی گئی جبکہ ان افراد کا عملی طور پر وہاں کوئی وجود نہ تھا۔ ان تمام فرضی ملازمین کی تنخواہیں بھی مشتاق اعوان کے چہیتے وصول کرتے تھے۔ دوران اقتدار ملک مشتاق اعوان کے خاندان کے پاس ۱۰ عدد لینڈ کروزر، ۴ پجارو گاڑیاں اور دیگر کئی محکموں کی کاریں زیر استعمال رہیں۔ پوری فیملی کے پاس ۱۰ عدد موبائل فون تھے جن کا بل لاکھوں روپے تھا اور وہ سرکاری خزانے سے ادا کیا جاتا تھا۔ صرف مشتاق اعوان کے بیٹے کاشف اعوان کے زیر استعمال 353398 / 350067 0342 کے نمبر تھے۔

ملک مشتاق اعوان کے شیخوپورہ میں واقع گھر کی تمام ٹائلیں پبلک ہیلتھ ایکسین سبزواری نے خصوصی طور پر لگائیں۔ یہی ٹائلیں بعد میں مشتاق اعوان کے سسرال میں بھی سبزواری کے ذریعے لگوائی گئیں۔ ۱۹۸۸ء میں ملک مشتاق اعوان کو پیپلز پروگرام کے تحت دو موٹر سائیکلیں ملیں۔ ملک مشتاق اعوان نے ایک موٹر سائیکل پیپلز پارٹی شیخوپورہ کے صدر شوکت کوثر کو دے دی اور ایک موٹر سائیکل گوجرانوالہ میں رہائش پذیر اپنی سالی کے بیٹے کو دے دی۔

ملک مشتاق اعوان نے اپنے بیٹے کاشف اعوان کو بلدیہ شیخوپورہ کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ٹاؤن پلاننگ آفیسر کا کمرہ دے دیا۔ ملک کاشف اپنے دوستوں کی فوج کی ساتھ ٹاؤن پلاننگ آفیسر کے کمرے پر قابض ہوگیا۔ اس نے دفتر کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کا حکم دے دیا۔ ملک کاشف کے لیے گھومنے والی کرسی مبلغ ۷ ہزار میں خصوصی طور پر بنوائی گئی۔ ۴۰ ہزار روپے میں صرف کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے لگوائے گئے۔ ۳ نئے فون لگوائے گئے اور کاشف ملک نے صادق ملی کو بلدیہ شیخوپورہ کی تنخواہ پر پرسنل سیکرٹری رکھ لیا۔ ملک مشتاق اعوان کے ہمسائے اور دوست عبدالرحمان ورک نے ۳ کروڑ روپے مالیت کی سرکاری زمین پر قبضہ کر لیا اور اس جگہ پر دکانیں تعمیر کر لیں۔ اسی عبدالرحمان ورک کے بیٹے حفیظ الرحمٰن ورک کو

ملک مشتاق اعوان نے بلدیہ شیخوپورہ میں ڈپٹی چیف آفیسر ضلع کونسل شیخوپورہ میں تعینات کیا تھا۔

تحقیقات کرنے سے جو حقائق سامنے آئے ان کے مطابق مشتاق اعوان کا ذریعہ معاش صرف وکالت ہے جبکہ مشتاق اعوان سیاسی مصروفیات میں وکالت کے لیے وقت نکالیں تو ایک گھنٹے سے زائد وقت وکالت کو نہیں دے سکتے۔ جبکہ تمام حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو مشتاق اعوان درمیانے درجے کے وکیل ہیں۔ نہ کبھی شیخوپورہ ضلع کچہری میں ان کو کبھی مستقل وکالت کرتے دیکھا گیا ہے اور نہ ہی ہائی کورٹ میں۔ جبکہ مشتاق اعوان کا خاندانی پس منظر بھی زیریں متوسط طبقے کا پس منظر ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے خاندان کے زیر استعمال ۵ جدید ترین و قیمتی گاڑیاں اور ایک بہت بڑا گھر ہو جس میں رہن سہن نوابانہ ہو۔

ملک مشتاق اعوان کے پاس قیمتی ترین گاڑی "ہائی لکس سرف" بیگم کے پاس نئی سوزوکی مارگلہ' بیٹے کاشف اعوان کے پاس نئی ہنڈا سوک VIT' بیٹیوں کے پاس جدید ترین کرولا گاڑی اور بھائی کے پاس کرولا ۸۶ ماڈل ہے۔ بھرتیوں پر پابندی کے باوجود مشتاق اعوان نے اپنے بیٹے کو ایل ڈی اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھرتی کروایا۔ جب ملک مشتاق اعوان سے ان الزامات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے تمام الزامات کی تردید کر دی اور ان الزامات کو اپنے سیاسی مخالفوں کی سازش قرار دیا۔ ان کے بقول ان کا ذریعہ معاش وکالت ہے اور اسی سے ان کی گھریلو ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن

پاکستان کی سیاسی تاریخ کی متنازعہ ترین سیاسی شخصیات میں شیخ مجیب الرحمن کا نام صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موضوع پر بے شمار متضاد آراء سامنے آتی ہیں۔ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ذوالفقار علی بھٹو کا کارنامہ قرار دیتی ہے۔ کچھ لکھنے والے بین السطور یہ تاثر دیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی زیادہ ذمہ دار اس وقت کی فوجی کمان تھی۔ اسی طرح کچھ لکھنے والے اپنا سارا زور بیان اس نقطے پر صرف کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی خالصتاً" شیخ مجیب الرحمن کا کام تھا کیونکہ انہوں نے مغربی پاکستان کی تمام مصالحانہ کوششوں کو نظرانداز کر دیا اور ہندوستان کی ایماء پر صرف علیحدگی کے سوال پر اڑے رہے۔ اس دعوے کا ثبوت ان لکھنے والوں کے پاس عوامی لیگ کے چھ نکات ہیں جن پر عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن آخری وقت تک ڈٹے رہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سارے ہنگامے میں جو شخصیت مغربی پاکستان میں بہت زیادہ متنازعہ بن کر سامنے آئی وہ شیخ مجیب الرحمن کی تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے شیخ مجیب الرحمن کا نام ہمیشہ موضوع گفتگو بنتا رہے گا اور جب تک اس حوالے سے کوئی معروضی تحقیق سامنے نہیں آ جاتی لاحاصل گفتگو اور الزام تراشیوں کا سلسلہ جیسے گزشتہ اڑھائی دھائیوں سے چلتا آ رہا ہے' مزید چلتا رہے گا۔

آج بھی کچھ ایسے تجزیہ نگار آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں جو شیخ مجیب

الرحمن سے زیادہ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں' حکمرانوں اور فوجی جرنیلوں کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا موجب ٹھہراتے ہیں۔ ان تجزیہ نگاروں کا موقف یہ ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان نے ایک عجیب و غریب "فلسفہ وحدت پاکستان" گھڑا اور مشرقی پاکستان کے عوام کو اپنی زبان تک چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۲ء کے لسانی فسادات ایک واضح اور عبرت ناک مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمن کے سیاسی کردار کو ساری خوراک مغربی پاکستان کی حکومتوں سے ملی۔ مغربی پاکستان میں بیٹھے نااہل سیاست دانوں اور بہت چھوٹی فہم و فراست کے مالک اور "نظریہ پاکستان" کے خبط زدہ اعلیٰ سرکاری حکام اور فوجی جرنیلوں نے بغیر حقائق کے اپنے طور پر تسلیم کر لیا کہ بنگالی عوام پاکستان کے وفادار نہیں اسی لیے وہ اردو زبان کو اپنانے میں لیس و پیش کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور بنگلہ زبان کو پاکستان کی "سرکاری زبان" اردو پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اس کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ء میں اس مسئلے پر مشرقی پاکستان میں امن و امان کی صورت حال خراب ہوگئی اور مشرقی پاکستان کے عوام کو باقاعدہ "شہید" حاصل ہوگئے۔ جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں کشیدگی بڑھی تو بنگالی عوام ان "شہیدوں" کے ایام زیادہ شدت اور جذبے کے ساتھ منانے لگے۔

مجیب الرحمن کی سیاسی افزائش ایوب خان اقتدار کے دوران ہوئی۔ جب ایوب خان نے اپنے ناپسندیدہ سیاست دانوں کو بے اثر کرنے کے لیے "ایبڈو" کا سہارا لیا تو پھر پاکستان میں ایسی قیادت کا بحران پیدا ہوگیا جو حقیقی معنوں میں عوام کی نمائندگی کرتی۔ یہی وہ ایام تھے جن میں مجیب الرحمن جیسی غیر متوازن شخصیات نے اپنا سیاسی قد کاٹھ بڑھایا۔ شیخ مجیب رحمن کی شخصیت دن بدن مقبولیت حاصل کرنے لگی اور نااہل فوجی حکمرانوں کے اقدامات کے بعد مجیب الرحمن اپنی سیاسی شخصیت کو زندہ رکھنے کے لیے بنگالی قوم کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ قومی اسمبلی کی ۱۵۱ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ یہ تمام نشستیں مشرقی پاکستان سے حاصل ہوئیں۔ جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی نے ۸۱ نشستیں حاصل کیں۔ عام انتخابات کے انعقاد کے بعد یہ توقع

کی جا رہی تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے سیاسی تنظیموں کے درمیان دستوری ڈھانچے کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اتفاق و اتحاد ہو جائے گا لیکن شیخ مجیب الرحمن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آئین کی بنیاد چھ نکات پر ہوگی۔ چونکہ مغربی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ قومی اسمبلی کی ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس لیے پاکستان پیپلز پارٹی کو اکثریتی جماعت کی حیثیت سے یہ حق پہنچتا تھا کہ مغربی پاکستان کے عوام کے حقوق کے تحفظ کے لیے آئین تیار کرنے کے کام میں عوامی لیگ کا ساتھ دے۔ اس سلسلے میں بات چیت کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمن کے پاس غلام مصطفیٰ کھر کو بھیجا۔ اس کے چند روز بعد خود بھٹو شیخ مجیب سے بات چیت کے لیے خود ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ بھٹو نے تین دن تک شیخ مجیب الرحمن سے آئینی مسائل پر تبادلہ خیال کیا لیکن شیخ مجیب الرحمن چھ نکات میں رد و بدل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

بعد ازاں یحییٰ خان نے مختلف سیاسی پارٹیوں کے درمیان آئینی بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے ملک کے اہم مقامات کا دورہ کیا اور اس دوران انہوں نے شیخ مجیب الرحمن کو پاکستان کا ہونے والا وزیراعظم بھی قرار دیا۔ علاوہ ازیں یحییٰ خان اور مغربی پاکستان کے دوسرے سیاسی رہنماؤں نے شیخ مجیب الرحمن کو پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی لیکن شیخ مجیب الرحمن نے نہ صرف ان کی پیشکش کو مسترد کر دیا بلکہ چھ نکات پر بھی بات کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے یہ جواز پیش کیا کہ چھ نکات عوام کی ملکیت ہیں۔ اب چھ نکات میں کسی قسم کے رد و بدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ شیخ مجیب الرحمن نے دورہ مغربی پاکستان کے جواب میں کہا "جو کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے وہ ڈھاکہ آ جائے"۔

ایک سوال کے جواب میں شیخ مجیب الرحمن نے کہا "میں کسی سے ملاقات کا خواہش مند نہیں ہوں۔ اگر صدر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو یہاں آ جائیں"۔ بینکاک پوسٹ کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن نے کہا "میری پارٹی کو ۱۶۰ نشستوں کی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل ہے۔ اور اگر مغربی پاکستان نے میری پارٹی کے چھ نکاتی منشور کو پورے کا پورا تسلیم نہ کیا تو میں تنہا ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا اور

آئین تیار کراؤں گا"۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے یکم مارچ ۱۹۷۱ کو ڈھاکہ میں ایک جلسہ عام میں عوام سے سول نافرمانی اور عدم تعاون کی اپیل کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت کا نظم و نسق عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دے۔ علاوہ ازیں شیخ مجیب الرحمٰن نے عوام سے حکومت کو ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دینے کی بھی اپیل کی۔ یکم مارچ کو ہی صدر یحییٰ خان نے پنجاب' سندھ' سرحد' بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے گورنروں کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مرتبہ میں بدل دیا۔ ۷ مارچ کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ میں اسمبلی کے لیے چار شرائط پیش کیں اور ۲۵ مارچ کو منعقد ہونے والے اجلاس میں شریک نہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ شیخ مجیب نے درج ذیل شرائط پیش کیں:

(i) مارشل لاء ہٹایا جائے۔

(ii) فوجیں بارکوں میں واپس چلی جائیں

(iii) اقتدار عوامی نمائندوں کو سونپ دیا جائے

(iv) مشرقی پاکستان میں ۲ مارچ کو ہونے والی لوٹ مار' آتشزدگی' دھماکوں اور فائرنگ کے بارے میں تحقیقات کرائی جائیں۔

یہی وہ موقع تھا جب شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگالی عوام کے جذبات کو مغربی پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے آخری حربہ اختیار کیا۔ مشرقی پاکستان میں ہونے والے فسادات کو بنگالیوں کے خلاف بہت خطرناک سازش قرار دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اس موقع پر مغربی پاکستان سے آئے فوجی دستوں کی کارروائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ... تھا اور مغربی پاکستان میں بیٹھے فوجی حکمرانوں نے اس شورش کو دبانے کے لیے جس اجتماعی پن کا مظاہرہ کیا' اس کو شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں نے براہ راست جنگ میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر اس موقع پر شیخ مجیب الرحمٰن تحمل اور لچک کا مظاہرہ کرتے تو شاید حالات کا سنگین اتنی بھیانک تصویر پیش نہ کرتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ اس موقع پر براہ راست بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے نرغے میں تھے اور دلی سے موصول ہونے والی ہدایات کی بہت زیادہ پاسداری کر رہا تھا۔ چونکہ مشرقی پاکستان کے حالات پہلے ہی سے

خراب تھے اور ان حالات میں بنگالی عوام کو مشتعل کرنا مزید آسان ہو گیا تھا جس کا بھرپور فائدہ شیخ مجیب الرحمن اور بھارت نے اٹھایا۔

۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو صدر یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمن سے بات چیت کرنے کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ مذاکرات شروع ہوئے اور اگلے روز شیخ مجیب نے صدر یحییٰ خان سے ملاقات کی اور اپنا چار نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ بعد ازاں شیخ مجیب الرحمن نے عوامی لیگ کی اعلیٰ کمان کا اجلاس طلب کیا اور مشرقی پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ مشرقی پاکستان کے ایک ایک گھر کو قلعے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھی یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمن کے مابین ملاقاتیں جاری رہیں۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا جس کے لیے باقاعدہ ہدایات شیخ مجیب الرحمن جاری کرتے رہے۔ ایک طرف شیخ مجیب الرحمن مغربی پاکستان کے سیاست دانوں اور صدر یحییٰ خان سے مذاکرات کرتے پھر رہے تھے اور دوسری طرف ان کا سارا زور اس پر صرف ہو رہا تھا کہ افواج پاکستان اور دیگر اداروں کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ شیخ مجیب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس دوران انہوں نے بھارتی حکومت کے ساتھ اپنا رابطہ مزید مضبوط بنا لیا اور مستقبل کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

۲۲ مارچ کو بنگلہ دیش کے طلبہ کی مرکزی مجلس عمل نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کی بجائے یوم مزاحمت منایا جائے گا۔ اسی روز ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان کے درمیان ایک باقاعدہ میٹنگ ہوئی۔ بعد ازاں مجیب الرحمن نے کہا کہ ایک ماہ پہلے ذوالفقار بھٹو کے تجویز کردہ فارمولے کے مطابق دونوں صوبوں کو علیحدہ علیحدہ اقتدار منتقل کیا جائے۔

صدر یحییٰ خان نے سیاسی لیڈروں سے کہا کہ وہ شیخ مجیب سے ملیں۔ ۲۳ مارچ کی شام کو مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں نے آئینی مسائل پر شیخ مجیب الرحمن سے گفت و شنید کی مگر شیخ مجیب الرحمن اپنی سکیم میں کسی قسم کے رد و بدل پر رضامند نہ ہوئے۔ دریں اثناء ۲۳ مارچ کو شیخ مجیب الرحمن نے مسلح دستوں کی سلامی لی اور نجی رہائش گاہ اور اہم عمارات پر اپنا پرچم لہرایا۔ ہر طرف بنگلہ دیش کے پرچم لہرا رہے تھے

اور پاکستانی پرچم کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے حکم پر مشتعل عوام نے اس سفارت خانوں پر پتھراؤ کیا جنھوں نے پاکستانی پرچم لہرانے کی کوشش کی تھی۔

۲۴ مارچ کو یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان طے شدہ ملاقات اس بناء پر نہ ہو سکی کیونکہ شیخ مجیب الرحمٰن کے دستوری مسودہ کو صدر یحییٰ کے مشیران نے مسترد کر دیا تھا۔ اسی روز چیئرمین پیپلز پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے صدر یحییٰ سے ڈھاکہ میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کا مقصد صدارتی اعلان کی قانونی حیثیت سے متعلق گفت و شنید تھا۔ اسی روز شیخ مجیب الرحمٰن کے مشیروں' جن میں قانونی مشیر کمال حسین بھی شامل تھے' صدر مملکت سے ملاقات کی اور اپنی ملاقات کے بعد اخبار نویسوں کو بتایا کہ اب مزید خیالات کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

۲۵ مارچ کو شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ "صدر کی ڈھاکہ میں آمد اور مذاکرات کے بعد عوام کا خیال تھا کہ اب یہ محسوس کر لیا گیا ہے کہ ملک کو درپیش بحران صرف سیاسی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں نے صدر مملکت سے ملاقات کی۔ بعد میں میرے ساتھی تفصیلات طے کرنے کے لیے صدر کے مشیروں سے ملاقات کرتے رہے۔ ہم نے مفید کی بھرپور کوشش کی اب صدر اور ان کے مشیران کا کام ہے کہ وہ معاملات کا تصفیہ کرائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ملک سنگین حالات سے دو چار ہو جائے گا اور ۲۵ مارچ کی رات صدر آئندہ ایکشن کی ہدایت دینے کے بعد کراچی روانہ ہو گئے۔ مسٹر بھٹو اس روز ڈھاکہ کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں رہائش پذیر تھے۔ ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی شب ۲ بجے کے بعد مسٹر بھٹو نے اپنے کمرے میں مشین گن کے فائر کی آواز سنی۔

۲۶ مارچ کو صدر یحییٰ نے پورے ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی اور مشرقی پاکستان میں فوج کو مرکزی حکومت کی حاکمیت بحال کرنے کا حکم دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو غدار قرار دیا گیا۔ ڈھاکہ سے کراچی پہنچنے پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا "خدا کا شکر ہے پاکستان بچ گیا"۔ اسی روز صدر یحییٰ نے کہا "شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی پاکستان کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ملک کی سالمیت پر حملہ کیا ہے۔ ان کا

اس جرم کی سزا دی جائے گی"۔ تحریک استقلال کے سربراہ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان اپنی کتاب "جرنیل سیاست میں" میں فوجی ایکشن کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈھاکہ سے کراچی جاتے ہوئے جب پی آئی اے کا طیارہ چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر سری لنکا سے گزر رہا تھا تو یحییٰ خان وہسکی کا گلاس اٹھائے چسکیاں لے رہے تھے۔ اس وقت جہاز کے کپتان نے اسے پیغام دیا کہ "آپریشن سرچ لائٹ" کا آغاز ہو چکا ہے۔ جونہی یہ المیہ شروع ہوا ٹینک اور فوجی گاڑیاں ڈھاکہ کی سڑکوں اور گلیوں میں آ پہنچیں۔ فوج کی ایک کمانڈو ٹیم نے مجیب الرحمن کو گرفتار کر کے فوجی چھاؤنی میں پہنچا دیا۔ بعد ازاں اسے مغربی پاکستان لایا گیا"۔

شیخ مجیب الرحمن کی گرفتاری کے بعد ہندوستان بھر میں شیخ مجیب الرحمن کی حمایت میں مظاہرے شروع ہوگئے۔ چونکہ شیخ مجیب الرحمن اور ان کے ساتھیوں نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اس لیے جب شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کیا گیا تو مشرقی پاکستان میں موجود دیگر شرپسند عناصروں کے خلاف فوجی ایکشن کرنا ضروری ہوگیا۔ فوجی کارروائی کے دوران لاکھوں شرپسند عناصر اپنا گھربار چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔

۳۱ مارچ کو لوک سبھا میں مسز اندرا گاندھی کی موجودگی میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں امن و امان کی صورت جوں کی توں ہے۔ اس لیے دنیا بھر کی حکومتوں کو چاہیے کہ پاکستان کے معاملات میں مداخلت کریں اور ضروری اور تعمیری قدم اٹھائیں۔ حکومت پاکستان نے پاکستان کے معاملات میں بھارت کی بے جا مداخلت پر بھارتی حکومت سے سخت احتجاج کیا۔ ۳۱ مارچ کو بھارتی پارلیمنٹ میں مشرقی پاکستان میں شرپسندوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں ہر ممکن امداد کا یقین دلایا گیا۔ حکومت پاکستان نے بھارت کی اس کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ برابر جارحانہ کارروائیوں میں برسر پیکار رہی۔

یکم اپریل کو مسلح بھارتی مشرقی پاکستان میں داخل ہوگئے۔ پاکستان کی مسلح افواج نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب کارروائی شروع کر دی۔ ۱۳ اپریل کو

روسی صدر نے صدر یحییٰ خان کے نام ایک پیغام بھیجا "پاکستان کے حالیہ واقعات پر روسی عوام کو تشویش ہے"۔ روسی صدر نے اپیل کی کہ مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف ظلم و ستم اور خونریزی بند کرنے کے لیے فوری اقدامات کریں۔ جواب میں صدر یحییٰ نے کہا کہ "ہم اپنے معاملات میں کسی ملک کو مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔ روس اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے بھارت کو مداخلت سے باز رکھے"۔

۴ اپریل کو مشرقی پاکستان کے ۲ سیاسی رہنماؤں کے ایک وفد نے مولوی فرید احمد کی سربراہی میں مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ٹکا خان سے ملاقات کی۔ ان تمام سیاسی رہنماؤں نے ٹکا خان کو صوبہ میں امن و امان کی صورت حال کو بحال کرنے کے سلسلے میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی تاکہ غنڈہ اور شرپسند عناصر کی تخریبی سرگرمیوں سے جو لوگ خوفزدہ ہیں' اس کی مدد کی جائے۔ ۵ اپریل کو یحییٰ خان نے کہا کہ "پاکستان کے اندرونی معاملات میں کسی ملک کی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی۔ میں مشرقی پاکستان کے معقولیت پسند نمائندہ افراد کے ساتھ مذاکرات چاہتا ہوں"۔

مغربی پاکستان کے حکمران آخری بنگالی کی قیمت پر مشرقی پاکستان کے جغرافیائی خطے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجیب الرحمن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان میں قید کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان اس دوران شدید ترین نوعیت کی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ بھارتی افواج بھی اس عرصہ میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئیں۔ بھارتی افواج پے در پے کامیابیاں حاصل کرتی گئی۔ بنگالیوں نے پوری قوت کے ساتھ بھارتی افواج کا ساتھ دیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک بھارت نے پورے مشرقی پاکستان کو فتح کر لیا۔ اس دوران بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سانحے کے بعد یحییٰ خان نے اقتدار چھوڑ دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو' باقی ماندہ ملک کا سربراہ بن گیا۔ شیخ مجیب الرحمن کو پاکستانی قید سے رہائی ملی اور شیخ مجیب الرحمن پہلے لندن اور پھر ڈھاکہ پہنچ گیا۔

شیخ مجیب الرحمن نے بنگلہ دیش کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اس کی مٹی اٹھا کر ماتھے سے لگائی کہ اس کا خواب بالآخر پورا ہو گیا ہے۔ پھر مجیب الرحمن اپنی قوم کی توقعات پر بھی پورا نہ اتر سکا۔ مجیب الرحمن ایک ناکام حکمران قرار پایا۔ عوامی سطح پر

اس کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ مجیب الرحمٰن کو ایک فوجی بغاوت کے دوران اندھا دھند فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جس تیزی کے ساتھ ملک کے سیاسی افق پر ابھرا تھا' اسی تیزی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

جسٹس محمد منیر

پاکستان کی آئینی تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں پر غیر قانونی اور غیر آئینی اقدامات کیے گئے ہیں اور متعلقہ لوگوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ایسے آرڈیننس جاری کیے جن کا جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس میں ایک واضح مثال پنجاب گورنر کی ۱۹۹۶ء میں منسٹرز آرڈیننس ۱۹۷۵ء میں دفعہ ۷ اے کا اضافہ ہے جو سراسر ناجائز اور انسانی حقوق کی پامالی ہے۔ یہ تو چھوٹی سی بات نظر آتی ہے اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پاکستان اپنی گولڈن جوبلی تک پہنچتے پہنچتے حکومت کے تیرہ ادوار سے گزر چکا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ جہاں سے پتہ چل سکے کہ کسی حکومت نے اپنی آئینی مدت پوری کی ہو۔ راتوں رات حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا اور نئی صبح نئی حکومت کے ساتھ طلوع ہوتی رہی اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداران نے اپنی من مانی کرتے ہوئے ذاتی مفادات کی خاطر آئین کی دھجیاں اڑائیں جن کا خسارہ پاکستان کو ٹکڑوں میں منقسم ہونے کی صورت میں اٹھانا پڑا۔ ایسی ایک مثال ۱۹۵۳ء کے گورنر غلام محمد کے دور میں ہوئی۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو گورنر غلام محمد نے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین اور اس کی کابینہ کو معطل کر دیا۔ یہ اقدام مکمل طور پر خلاف آئین تھا اور گورنر جنرل کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ ایسا اقدام کرے۔ اس صورت میں مولوی تمیز الدین صدر اسمبلی نے سندھ ہائی کورٹ میں اس اقدام کے خلاف رٹ دائر کر دی جس میں یہ موقف بیان کیا گیا کہ حکومت کے کارندے اسمبلی کی کارروائی کو روکنے سے باز

رہیں۔ کارروائی کے دوران سندھ ہائی کورٹ نے فریقین کے دلائل سنے اور طویل سماعت کے بعد عدالت نے مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عدیہ نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ واقعی گورنر جنرل کا اقدام خلاف آئین ہے اور اس کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو ان کے اختیارات سے دست بردار کرے۔

سندھ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف حکومت نے فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ عدالت عظمیٰ نے بھی یہ تسلیم کیا کہ موجودہ آئین میں گورنر جنرل کو اسمبلی توڑنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اس کے باوجود خاص طور پر چیف جسٹس محمد منیر اور دوسرے جج صاحبان کی اکثریت نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو رد کر دیا اور گورنر جنرل کے اقدام کو برقرار رکھا۔ گورنر جنرل کے ایک غیر آئینی اقدام کو صحیح قرار دے کر چیف جسٹس محمد منیر نے قانونی مہارت کی تذلیل کی اور جس طرح قانون کی دھجیاں بکھیریں پوری دنیا کے قانونی ماہرین کی نظروں میں تنقید کا نشانہ بنے۔ اس فیصلے کے حوالے سے چیف جسٹس محمد منیر نے جو شہرت پائی' خدا کسی کو بھی نصیب نہ کرے اور قوم کبھی اس فیصلے کے حوالے سے ان کو معاف کر سکی ہے اور نہ کر سکے گی۔

اس فیصلے کے کچھ ہی عرصے کے بعد چیف جسٹس نے خود یہ تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ فیصلہ سیاسی دباؤ کے تحت کیا۔ اس فیصلے کے اثرات یہاں تک پڑے کہ ۱۹۷۷ء میں نظریہ ضرورت کی بنیاد پر جنرل ضیاء الحق کے پاکستان پر غاصبانہ قبضے کو بھی جائز تسلیم کیا گیا بلکہ فوجی آمر کو آئین میں ترمیم کا حق دے دیا گیا۔ بے بس قوم کے پاس چیف جسٹس منیر کے فیصلے کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بلکہ قوم نظریہ ضرورت کے فیصلہ کی سزا آج تک بھگت رہی ہے۔

خواجہ ناظم الدین اور مولوی تمیز الدین کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا جس کی سزا میں قوم کو آدھا پاکستان کھونا پڑا اور یہ قیمت قوم نے ڈھاکہ کی صورت میں ادا کی۔ کیونکہ اس فیصلے نے تعصب کو ہوا دی اور بنگالیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ خواجہ ناظم الدین اور مولوی تمیز الدین کو انصاف اس لیے نہ مل سکا کہ وہ بنگالی تھے۔

اسی طرح ۱۹۷۷ء میں عدلیہ نے غاصب کے حق میں فیصلہ دیا اور بے نظیر اور

جونیجو کی اسمبلیاں بحال نہ کیں جس کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہن میں یہ خیال تقویت اختیار کر گیا کہ پنجابی جج کبھی بھی سندھی وزیراعظم کے حق میں فیصلہ نہیں دے گا اور اس تعصب کو ابھارنے کا سہرا چیف جسٹس محمد منیر کے سر ہے۔

پاکستان میں مارشل لاء کے تحت سزا کے خلاف پہلے مقدمے کی سماعت بھی فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر نے کی اور ۱۹۵۳ء میں اپنے فیصلہ میں ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کے تحت بعد کے برسوں میں نافذ ہونے والی فوجی آمریتوں کو قانونی جواز مل گیا اور اس بات کا سہرا چیف جسٹس منیر کے سر ہے کہ جب سول انتظامیہ بدامنی اور بگڑے ہوئے حالات پر قابو نہ پا سکے تو مارشل لاء کے ذریعے فوج کا اقتدار پر قابض ہونا قانونی اقدام ہے۔

مولانا عبدالستار نیازی رکن پنجاب اسمبلی کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۸ اور ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت ہنگاموں کے دوران تقریریں کرنے اور پولیس کے ایک سپرنٹنڈنٹ فردوس علی شاہ کے قتل پر اکسانے کے الزام میں ۷ مئی کو ایک خصوصی فوجی عدالت نے موت کی سزا سنا دی۔ بعد میں الزام ثابت نہ ہونے پر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے موت کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ ایم آر کیانی نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۹۱ کے تحت اس مقدمہ کی سماعت کی جو محمد عمر خان نے مولانا عبدالستار نیازی کی حبس بے جا سے رہائی کے لیے دائر کی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران اس نقطہ پر طویل بحث ہوئی کہ مارشل لاء اقدامات کو تحفظ دینے والے آرڈیننس کی دفعہ ۷ قانون کے مطابق ہے کہ نہیں جس کے تحت گورنر جنرل کو سزائیں برقرار رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ عدالت عظمیٰ نے مارشل لاء اقدامات کو تحفظ دینے والے آرڈیننس کی دفعہ ۷ کے تحت سزا کو برقرار رکھا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے نہ صرف مارشل لاء اقدامات کو جائز قرار دیا بلکہ مارشل لاء کے تحت قائم کردہ خصوصی و فوجداری عدالتوں کو بھی قانونی جواز فراہم کر دیا۔ اس فیصلے کی تلواریں آج بھی ہمارے سر پر لہرا رہی ہیں جس کا سہرا چیف جسٹس منیر کے سر ہے۔ بقول ایم این ہوتی کہ چیف جسٹس منیر نے صحیح اور غلط کی تمیز نہ کرتے ہوئے اپنی قانونی مہارت کی تذلیل کی اور خود کو اپنے مقام سے گرا لیا۔

یاد رہے کہ گورنر جنرل کی طرف سے ۱۹۵۵ء میں خصوصی ریفرنس پر فیڈرل کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ رولنگ بھی دی تھی کہ گورنر جنرل نیا آئین تیار نہیں کر سکتا کیونکہ آئین سازی کا اختیار ۱۹۴۷ء کے آزادی ایکٹ کے تحت صرف دستور ساز اسمبلی کو حاصل ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ نئی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کے لیے گورنر جنرل نیا حکم نامہ جاری کر سکتا ہے۔ اس ریفرنس کے حوالے سے فیڈرل کورٹ میں گورنر جنرل کے اسمبلی توڑنے کے اختیار کو بھی زیر بحث لایا گیا تو فیڈرل کورٹ نے نظریہ ضرورت کے تحت گورنر جنرل کے اسمبلی توڑنے کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ جسٹس محمد شریف اور جسٹس کارنیلیس نے نظریہ ضرورت کو حالت جنگ یا قومی آفات تک محدود کر دیا جبکہ جسٹس محمد شریف اور جسٹس کارنیلیس نے عدالت عظمیٰ کے اکثریتی فیصلوں کو مقتدر طبقہ کے لیے ایک ستون قرار دیا۔

۱۹۴۷ء سے حکومت کے تینوں اجزاء یعنی مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ اس مسئلہ پر کام کر رہے ہیں کہ دستوری قوانین کے لیے گورنر جنرل کی توثیق ضروری نہیں کیونکہ دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں وفاقی عدالت نے فیصلہ دیا اور تمیز الدین کی درخواست خارج کر دی کہ قانون ساز اسمبلی کے موثر نفاذ کے لیے گورنر جنرل کی منظوری لازمی ہے۔

ان تمام قانونی پیچیدگیاں کی جڑ چیف جسٹس منیر الدین ہے جس نے اپنے ذاتی مفاد' تعصب پرستی یا انہی کے بقول سیاسی دباؤ کے تحت کیا اور اس کے غیر آئینی اور غیر منصفانہ اقدام کی وجہ سے فوج کو اس حد تک اختیارات مل گئے کہ اب ہر حکومت کو خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کسی بھی وقت فوج ملک میں بدامنی اور لاقانونیت کا دعویٰ کر کے ملکی حالات کو اپنے کنٹرول میں لے سکتی ہے اور گورنر جنرل کو یہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ وہ قانون سازی کے موثر نفاذ کے لیے منظوری دے۔ اس کے علاوہ سیاسی دباؤ اسمبلی کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں اور چیف جسٹس ہونے کے باوجود محمد منیر جیسے اعلیٰ عہدیدار اپنی نوکری کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ انہی لوگوں نے ہمارے ملک کے آئین کی جڑوں کو غیر آئینی اور غیر منصفانہ اقدامات سے کھوکھلا کیا ہے۔

محمد خان جونیجو

محمد خان جونیجو کی پیدائش ۱۸ اگست ۱۹۳۲ء میں سندھ کے ایک گاؤں سندھڑی میں ہوئی۔ وہ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ کم عمری میں ہی انگلستان چلے گئے اور کیمرج یونیورسٹی سے سینئر کیمرج کیا۔ جونیجو نے زراعت میں ڈپلومہ زرعی انسٹی ٹیوٹ ہسٹنگو سے کیا۔ وطن واپسی پر انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

جونیجو ۱۹۵۴ء میں سانگھڑ ضلع کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ جولائی ۱۹۶۳ء میں جونیجو کو تعمیرات' ریلوے' صحت' بنیادی جمہوریت و بلدیات اور محنت' امدادی قوت کے محکموں کا وزیر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۷۸ میں ریلوے کے وزیر بن گئے مگر ۲۱ اپریل ۱۹۷۹ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

مارشل لاء دور میں جب غیر جماعتی انتخابات ہوئے تو جونیجو قومی اسمبلی کے رکن بن گئے اور ۱۹۸۵ء میں انہیں وزیراعظم پاکستان نامزد کر دیا گیا۔

۲۹ مئی ۱۹۸۸ء میں ضیاء الحق نے اسمبلی برخاست کر دی۔ محمد خان جونیجو بیمار ہوگئے جب ان کو علاج کے لیے لندن لے گئے تو وہیں پر انتقال کر گئے۔ ان کو آبائی گاؤں سندھڑی میں دفن کیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق مارشل لاء لگانے کے بعد جب یہ فیصلہ کر چکے کہ ذوالفقار علی

بھٹو اور پی پی پی کا اقتدار میں واپس آ جانا ان کے لیے خطرناک ہے تو انہوں نے دونوں کو ختم کرنے کے لیے ٹھوس اور فیصلہ کن اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک قتل کے مقدمے میں تختہ دار پر لٹکا کر پی پی پی کے خاتمے کے لیے انہوں نے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتائج کے بعد ضیاء الحق کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو پی پی پی مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دسترس میں رہتے ہوئے کسی پیپلز پارٹی مخالف قوت کو ملک میں اتنا مضبوط کر سکے کہ پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار نہ آ سکے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ان کی نظریں ضلع سانگھڑ (سندھ) کے ایک غیر معروف سیاست دان محمد خان جونیجو جو اگرچہ اس وقت مسلم لیگ کے عہدے دار تھے، پر ٹھہر گئیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کو ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو وزارت عظمیٰ کے لیے نامزد کیا۔

انہوں نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال کر ۱۵ اپریل کو اپنی کابینہ تشکیل دی اور اس طرح ایک طویل عرصے کے بعد ملک میں منتخب حکومت نے کام کرنا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں محمد خان جونیجو ضیاء الحق کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے رہے لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے فیصلہ کن اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔ ضیاء اور محمد خان جونیجو کے درمیان اس وقت چپقلش منظر عام پر آئی جب وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے صاحبزادہ یعقوب خان کو وزارت خارجہ سے ہٹا کر زین نورانی کی تقرری کر دی۔

محمد خان جونیجو ۱۸ اگست ۱۹۳۲ء کو صوبہ سندھ کے ضلع سانگھڑ کی تحصیل کھپرو کے موضع سندھڑی کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انگلستان میں کیمبرج سے سینئر کیمبرج کیا۔ اس کے بعد زرعی انسٹی ٹیوٹ ہسنگر سے زراعت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ سانگھڑ بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے اور اس طرح انہوں نے عملی سیاست میں شرکت کرنا شروع کر دی۔

۱۹۶۲ء میں محمد خان جونیجو مغربی پاکستان کی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ نواب آف کالا باغ نے ان کو مواصلات و تعمیرات اور ریلوے کی وزارت سونپی۔ وہ صدر ایوب کے زوال تک ایک وزیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۰ء

کی دہائی کے آغاز میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے البتہ کالعدم مسلم لیگ اور پیر پگاڑہ سے ان کی وابستگی رہی۔

جنرل ضیاء الحق نے جب "قومی اتحاد" کی جماعتوں پر مشتمل کابینہ تشکیل دی تو جولائی ۱۹۷۸ء میں ان کو ریلوے کا وزیر بنا دیا گیا۔ اس وزارت پر انہوں نے ۹ ماہ تک کام کیا۔ دیگر وزراء قومی اتحاد کے ساتھ وہ بھی مستعفی ہو گئے اور ایک دفعہ پھر قومی سیاست سے غائب ہو گئے۔ ۱۹۸۵ء میں جب غیر جماعتی انتخابات ہوئے تو کالعدم مسلم لیگ نے انتخابات جیت کر حکومت بنائی اور محمد خان جونیجو اس کے وزیراعظم بنے۔

محمد خان جونیجو ایک ایسے سیاست دان تھے جو پرامن سیاست کے قائل تھے۔ صدر ضیاء الحق نے سندھ کے لوگوں کو ریلیف دینے اور پی پی پی کی بیخ کنی کے لیے پیر پگاڑہ کے کہنے پر ان کو وزیراعظم بنایا تاکہ سندھ سے پی پی پی کو ختم کر کے مسلم لیگ کو مضبوط کیا جا سکے۔ محمد خان جونیجو خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر قطعاً وزیراعظم بننے کے لیے تیار نہ تھے۔

صدر ضیاء الحق نے ایک سیدھے سادے آدمی کو وزیراعظم نامزد کیا تھا لیکن اس کے تمام اندازے اس وقت غلط ہو گئے جب محمد خان جونیجو نے ۳۰ مئی کو سرحد اسمبلی اور یکم جون کو پنجاب اسمبلی میں مارشل لاء کے خلاف قرارداد منظور کرنے کو کہا اور یہ قراردادیں منظور کر لی گئیں۔ اس سے پہلے محمد خان جونیجو کہہ چکے تھے "جمہوریت اور مارشل لاء ایک ساتھ نہیں چل سکتے"۔

اس کے علاوہ محمد خان جونیجو نے آئی ایس آئی، انٹیلی جنس بیورو، ملٹری انٹیلی جنس اور دیگر فوجی معاملات میں براہ راست مداخلت کرنا شروع کر دی۔ صاحبزادہ یعقوب خان کی برطرفی اور زین نورانی کی تقرری بھی صدر ضیاء الحق پر ناگوار گزری۔

محمد خان جونیجو اور صدر ضیاء کے درمیان اختلافات اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئے جب محمد خاں جونیجو نے اوجڑی کیمپ کے واقعہ کی غیر جانبدار انکوائری کرانے کے لیے ایک کمیشن کا تقرر کیا۔ وہ جنرل ضیاء سمیت دیگر جرنیلوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ دوسرا واقعہ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا، وہ جنرل ضیاء الحق کی بطور

چیف آف دی آرمی سٹاف کی ملازمت میں توسیع تھا۔ جنرل ضیاء کی ملازمت میں توسیع کے بارے میں بل کو اسمبلی میں لے جانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکومت اور اپوزیشن کے ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔ اس کا جب صدر ضیاء کو پتہ چلا تو وہ بہت سیخ پا ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب زیادہ دیر تک جونیجو حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے۔

مندرجہ بالا دونوں واقعات جونیجو حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔ اسی دوران ضیاء الحق نے مسلم لیگ اور حکومتی مشینری میں ایسے اقدامات کیے جس سے محمد خان جونیجو تنہا رہ گئے۔ جب صدر ضیاء کو یقین ہوگیا کہ محمد خان جونیجو کے علاوہ ایسے افراد کو اپنے ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ وہ جونیجو کے بغیر حکومت چلا سکتے ہیں تو انہوں نے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو قومی اسمبلی توڑ دی۔ محمد خان جونیجو اسمبلی بحال کرانے کے لیے عدالت تک بھی گئے لیکن ملکی حالات خالص جمہوری ماحول میں ڈھل چکے تھے اور صدر ضیاء ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہوچکے تھے لہٰذا ان کی اسمبلی کی بحالی کے فیصلے کا اعلان نہ ہو سکا۔ اس کے بعد وہ سیاست میں کسی حد تک غیر متحرک ہوچکے تھے۔ وہ ۱۹۹۳ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

محمد خان جونیجو کی حکومت میں کرپشن نے پورے حکومتی ڈھانچے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جونیجو حکومت کے پہلے سال ہی رشوت' سفارش اور بدعنوانی کی آواز سنائی دینے لگی۔ بقول چودھری ممتاز تارڑ "پہلے عدالتیں رشوت ستانی سے محفوظ تھیں اب عدالتیں بھی بکنے لگی ہیں"۔ بقول جاوید ہاشمی "اب سیکرٹری سطح تک رشوت سے کلام لیے جاتے ہیں۔ ملک بھر میں مختلف محکموں میں بھرتی کے لیے لاکھوں روپوں کی رشوت دی جاتی ہے حتیٰ کہ کانسٹیبل کی بھرتی کے لیے پیسے دینے کی روایت ان کے دور میں پروان چڑھی۔ ان کے دور حکومت میں قدآور جرنیلوں نے حصہ لیا۔ ایک جرنیل نے تو اپنی انتخابی مہم میں ۸۰ لاکھ روپے تک خرچ کیے۔ یہ پیسے کہاں سے آئے؟"

سندھ کے ایک رکن اسمبلی نے الزام لگایا کہ جونیجو حکومت کے دوران پرائمری ٹیچر بھرتی ہونے کا ریٹ ۷ ہزار جبکہ انجینئر کا ۵۰ ہزار تھا۔ باقی نوکری کی

پیداواری اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ریٹ مقرر کیا جاتا۔ انجینئروں کو تو یہاں تک کہا جاتا کہ آپ کے علاقے میں فلاں پراجیکٹ پر کام ہو رہا ہے اور اس کی لاگت ایک کروڑ روپیہ بنتی ہے۔ اس میں سے ۳۰ لاکھ روپیہ دے دو ورنہ چارج چھوڑ دو۔

جونیجو حکومت میں "تولیہ" سکینڈل بہت مشہور ہوا۔ جس کے ضمن میں ۹۰ اعلیٰ افسران کو برطرف کر دیا گیا اور ایک وفاقی وزیر شہزادہ محسن الدین مستعفی بھی ہوگئے تھے۔ کواپریٹو سوسائٹی کے فنڈز میں بھی بڑی مقدار میں خوردبرد کی گئی۔ جس کی پاداش میں ایک وزیر چودھری انور عزیز جس کا تعلق شکرگڑھ سے تھا' مستعفی ہونا پڑا۔

جونیجو حکومت پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے پنجاب کے ترقیاتی فنڈز سے لاکھوں روپے مسلم لیگ کو دیے اور صرف راولپنڈی مسلم لیگ کو ۵۰ لاکھ روپے دیے گئے۔ جونیجو حکومت کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین صاحبزادہ محمد علی شاہ نے خود اعتراف کیا تھا کہ "نوکر شاہی عوام سے رشوت وصول کرتی ہے۔ سرکاری محکمے کھلے عام لوگوں سے پیسے لیتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ چور اور ڈاکوؤں کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اقربا پروری کی جاتی ہے' قومی دولت کو لوٹا جا رہا ہے۔ عوامی فنڈز اور امداد میں خوردبرد کی جاتی ہے۔ اس حمام میں ہر کوئی ننگا ہے"۔

اس لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کے دور میں سینٹ کا ادارہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ سینٹ میں دولت کی ریل پیل کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مالدار اور کرپٹ عناصر سینٹ کی درمیانی مدت کے لیے پیسے خرچ کر کے رکن بننے لگے اقتدار میں آ کر وہ اس رقم کو دوگناہ کرنے کا طریقہ اپناتے اور اس طرح ملک کا یہ مقدس ادارہ بھی بدعنوانی کا مرتکب ہوتا رہا۔ ان کے دور میں پارلیمنٹ کے ۱۷ ارکان نے پلاٹوں کی خرید و فروخت میں ۲۰ کروڑ روپے سے زائد کمائے۔ جونیجو دور کے ایک وزیر نے کہا تھا کہ "پہلے ریلوے کی نشستیں بکتی تھیں اب پورے اسٹیشن بھی فروخت ہو جاتے ہیں"۔

جونیجو کی حکومت پر یہ بھی الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کے دور اقتدار میں جاگیرداروں نے بڑے بڑے قرضہ جات حاصل کیے اور ان کے اصل کوائف بھی درج کرنے کی زحمت نہ کی گئی۔ پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ایک رپورٹ پیش کی کہ

صرف صوبہ پنجاب میں ۵۰ ارب روپے کی خردبرد کی گئی ہے جبکہ وفاقی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ایک رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ ملک کے سرکاری محکموں میں ہر سال ۴۰ ارب روپے کے گھپلے کیے جاتے ہیں اور ہر سال ایک کھرب روپے کے ٹیکس چوری کیے جاتے ہیں۔

جونیجو حکومت پر قرضوں کی معافی کے حوالے سے الزام لگایا کہ ۸۳ ارب روپے کے قرضے مختلف دباؤ میں آ کر معاف کر دیے گئے۔

جونیجو کے دور حکومت میں جعلی سرمایہ کار کمپنیوں نے ایک ارب روپے سے زائد کے فراڈ کیے اور ری بیٹ کی مد میں بینکوں میں بھی کروڑوں روپے کے فراڈ ہوئے۔ اس کے علاوہ خشک دودھ کی درآمد میں (۳۰) لاکھ روپے کا فراڈ ہوا جبکہ ریلوے کو سالانہ ۳ ارب روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔

افراط زر کی وجہ سے زیر گردش نوٹوں کی مالیت میں ایک ارب ۱۷ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔ جونیجو کے حکومتی دور میں ایک خفیہ رپورٹ پیش کی گئی جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ ٹیکس چوروں اور ہیروئن کی سمگلروں کے اس ایک کھرب ۴۴ ارب روپے مالیت کی رقم موجود ہے۔ ان پر یہ بھی الزامات لگائے گئے کہ انہوں نے اسلام آباد اور ملک کے دوسرے حصوں میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ سیاسی بنیادوں پر کی۔

ایک بین الاقوامی سمگلر "حاجی ہارون یعقوب عرف اونٹنی والا نے ملک کی بااثر شخصیات کو خوش کرنے کے لیے مزار قائد کراچی کے قریب ایک بنگلے کو عیاشی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ جہاں اس کی ذاتی دعوت پر ہر شب ملک کی کوئی نہ کوئی نامور شخصیت داد عیش دینے حاضر ہوتی تھی۔ عشرت کے مستقل مہمانوں میں حفیظ پیرزادہ' جام صادق' ولی جاموٹ' عبدالستار گبول' مولانا کوثر نیازی اور جونیجو قابل ذکر تھے۔ ان لوگوں کے لیے غیر ملکی شراب اور حسین دوشیزاؤں کا انتخاب کیا جاتا اور عیاشی کے اس اڈے پر کسی بھی ادارے کو چھاپہ مارنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک ایماندار انسپکٹر قاضی محمد ارشاد نے اپنے عملے کے ہمراہ مذکورہ عیاشی کے اڈے پر چھاپہ مارا جس کی پاداش میں انسپکٹر ارشد کو اور اس کے دیگر ساتھیوں کو نہ صرف نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے بلکہ ایک جھوٹے مقدمہ میں ملوث کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

ملک کے سیاسی اداروں اور سیاست میں ایسے افراد شریک ہوتے جو سیاسی طور پر غیر تربیت یافتہ تھے اور ان میں اکثریت کا تعلق بس سٹینڈ کے اڈوں اور دیگر عوامی مقامات سے جگا لینے والوں میں سے تھا۔ اس وقت کے ارکان اسمبلی قانون سازی اور دیگر حکومتی اقدامات کی الف ب سے بھی واقف نہ تھے جس کا اثر جمہوری اداروں پر پڑا اور جمہوریت کے سفر کی رفتار سست پڑ گئی۔

میاں منظور وٹو

پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں منظور احمد وٹو کی بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کے حوالے سے سب سے پہلا معتبر اعتراف لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس ٹوانہ کے دلیرانہ فیصلہ سے سامنے آتا ہے۔ اس فیصلے میں فاضل جج نے میاں وٹو اور ان کے ساتھ ارکان اسمبلی کے بارے میں صوبائی حکومت کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان افراد کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کر کے انہیں گرفتار کرلے۔ اگرچہ بعد میں اپیلنٹ بنچ نے اس واضح فیصلے اور حکم کو فوری طور پر معطل کرنے کا فیصلہ دے دیا لیکن اس سارے عمل میں میاں منظور وٹو کا مزاج مکمل طور پر ابھر کر سامنے آ گیا۔

میاں منظور وٹو کی شخصیت پنجاب کی سیاست میں متنازعہ ترین شخصیت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ میاں وٹو پر نہ صرف اپنی اسپیکر شپ اور وزارت اعلیٰ کے دوران سنگین نوعیت کی مالی بدعنوانیوں کے الزامات لگائے گئے بلکہ ان کا سیاسی کیریئر بھی وفاداریوں کے تغیر و تبدل کا ایک مکمل نمونہ پیش کرتا ہے۔ میاں منظور وٹو یونین کونسل کے چیئرمین سے اپنا سیاسی سفر شروع کر کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ ان کے ذہن میں اقتدار کا قدیم دیسی تصور قائم تھا اور یہ کہ "تھانہ کچہری" کے افسران اور عہدیداروں کو اپنے معتبر ساتھیوں میں شامل کیا جائے اور وسیع پیمانے پر بدعنوانیاں کر کے اتنا زیادہ پیسہ بنا لیا جائے کہ مستقبل کی ممکنہ شکست اور سیاسی بے اثری کا افسوس نہ رہے۔

میاں منظور وٹو ایسے "باکمال" وزیر اعلیٰ پنجاب گزرے ہیں جن کی بدعنوانیاں اور بے قاعدگیاں اپنی شروعات میں ہی پریس اور اپوزیشن کے ہاتھ لگ جاتیں اور اخبارات سمیت اسمبلی فلور پر وٹو کی موجودگی میں ہی واویلا شروع ہو جاتا لیکن چونکہ موصوف کے رابطوں کا جال اتنا گمبھیر تھا کہ اس "چالو بدعنوانی" کو روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ میاں منظور وٹو کی خواہش ہر صورت میں پوری ہو کر رہتی۔ اس دوران نہ تو میاں منظور وٹو اپنی کرپشن کے خلاف ہونے والے شور و غل سے پریشان ہوتے اور نہ ہی اخبارات کو تردیدی بیان جاری کرنے کی زحمت کرتے۔

میاں منظور احمد وٹو پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زیر سایہ "اجتماعی بدعنوانی" کا اہتمام کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ پنجاب کے اقتدار پر نظر ڈالی جائے تو گزشتہ ڈیڑھ دہائی میں کئی ایسے سیاسی رہنما مل جاتے ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار میں "خود نوازی" کی شاندار مثالیں قائم کیں لیکن اس حوالے سے میاں منظور احمد وٹو الگ شان کے مالک ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں وٹو کی بدعنوانیوں کا بڑا حصہ ان کی ذات اور ان سے وابستہ قریبی لوگوں کی مالی آسودگی کا باعث بنا۔ اس حوالے سے بھی میاں منظور وٹو ایک علیحدہ تشخص رکھتے ہیں۔ میاں منظور وٹو "مغلیہ شان و شوکت" کے ساتھ اپنی خاندانی تقریبات منانے میں مشہور تھے۔ میاں وٹو نے اپنے اقتدار میں اپنی بیٹی اور بیٹے کی شادیاں اس "یادگار" انداز میں ریاستی وسائل کو بروئے کار لا کر کیں کہ پنجاب کی پوری سیاسی تاریخ میں اس نوعیت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

وٹو صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی پر جس "سرکاری فیاضی" کا ثبوت دیا اس پر اپوزیشن اور پریس نے بہت شور مچایا لیکن وٹو صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میاں منظور وٹو پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے لاکھوں روپے کے زیورات "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" سے رقم نکلوا کر دہلی سے خریدے حتیٰ کہ ان کی بیٹی کی شادی کے دعوتی کارڈ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کی وساطت سے تیار ہوئے اور سرکاری اہتمام کے ساتھ تقسیم ہوئے۔ وٹو پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اس موقع پر پچاس کے قریب شلوار قمیض بھی مال روڈ کے ایک ٹیلر سے سلوائیں اور بل صوابدیدی فنڈ سے ادا کیا گیا۔

وٹو صاحب کی بیٹی کی شادی اس وقت فراموش کر دی گئی جب میاں منظور وٹو نے ۹۵ کے شروع میں اپنے بیٹے معظم وٹو کی شادی کا اہتمام کیا۔ وزیر اعلیٰ وٹو کے بیٹے کی شادی خانہ آبادی لاہور ترقیاتی ادارے (LDA) کے اس وقت کے وائس چیئرمین جاوید عمر خان کی صاحبزادی کے ساتھ سرانجام پائی۔ دلہن کے والد صدر مملکت فاروق احمد خان لغاری کے عزیز تھے اس طرح یہ شادی ہمارے حکمرانوں کے آپس میں گندھے ہوئے شجرہ ہائے نسب کے مزید باہمی قرب کا باعث بنی۔ وٹو صاحب نے پہلا ولیمہ لاہور کے ماڈل ٹاؤن پارک کی گراؤنڈ میں منعقد کیا۔ لاہور کے ظاہر پرست رئیسوں کو رشک میں مبتلا کر دینے والا رنگ و نور میں نہلایا ہوا ولیمہ اور دوسرا اپنے آبائی حلقے کے ورکروں کو خوش کرنے والا دیہاتی ولیمہ وساوے والا (اوکاڑہ) میں منعقد کیا گیا۔

۸ مارچ ۱۹۹۵ء کی شب وسیع و عریض ماڈل ٹاؤن گراؤنڈ میں دس ہزار افراد کی نشست اور خوراک کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وٹو صاحب نے صوبائی دارالحکومت کی ساری انتظامی مشینری اس ولیمے کے اہتمام میں جھونک دی۔ اس ولیمے پر حکومت پنجاب کے مختلف محکموں نے "سلامی" کے طور پر ایک اندازے کے مطابق کل دو کروڑ روپیہ اکٹھا کیا۔ مہمانوں کی آمد و رفت اور دیگر لوازمات کے لیے سرکاری اداروں کی گاڑیوں اور ہیلی کاپٹروں کا بے تحاشہ استعمال کیا گیا۔ قومی دولت کے اس بے رحمانہ اصراف کے ذریعے ایک نجی تقریب کو ریاستی تہوار میں بدل دیا گیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۵ء کو وساوے والا میں منعقد ہونے والے ولیمہ کی تقریب لاہور کی تقریب ولیمہ سے تین گنا بڑی تھی۔ کیونکہ اس میں ۳۵ ہزار مہمانوں کی خاطر تواضع کا بندوبست کیا گیا تھا۔ شاہی فرمان کی اطاعت میں لاہور کی ساری انتظامیہ اور پولیس اپنے تمام اسباب و آلات سمیت ایک ہفتہ تک اس "خانگی مصروفیت" کا شکار رہی۔

سابق وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو کی بدعنوانیوں کی شروعات اس وقت ہوتی ہے جب موصوف پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے۔ اس دوران میاں منظور احمد وٹو ناراض ایم پی اے حضرات اور خوفزدہ سرکاری افسروں میں گاہے بگاہے "مصالحت" کرا دیتے

تھے۔ اس عمل سے میاں منظور وٹو کی حمایت میں اضافہ ہونے لگا۔ اگر ایوان میں وزیروں اور مشیروں پر دباؤ ہوتا تو وہ ان کو مصیبت سے نجات دلوا کر ان کی حمایت حاصل کرتے اور ساتھ ہی اپنے کاموں کی لسٹ بھی انہیں تھما دیتے۔ اسمبلی ممبران اپنی شکایات کے حوالے سے ایوان میں بیورو کریسی پر جارحانہ سوالات کرتے اور ان سوالات کے دوران جب بیورو کریسی بے بس ہو جاتی تو اس وقت میاں منظور وٹو اسپیکر اسمبلی کی حیثیت سے بیورو کریسی کی مدد کرتے۔ بیورو کریسی بھی وٹو صاحب کا یہ "احسان" کبھی نہ بھولتی اور بدلے میں میاں وٹو کے لیے مراعات کا ڈھیر لگا دیتی کیونکہ وٹو صاحب کی پوری سیاسی زندگی کا منشور یہ رہا ہے کہ دوسرے کو مصیبت کے وقت اکاموڈیٹ کرو اور پھر انتظار کرو کہ کب اس شخص سے بہترین فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

میاں منظور احمد وٹو کی مذکورہ بالا "صلاحیت" سے متاثر ہو کر اس وقت کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف نے انہیں صوبائی اسمبلی کی سپیکر شپ پر برقرار رہنے دیا اور انہیں سپیکر شپ جیسے غیر انتظامی عہدے پر بھی پوری بساط کے ساتھ دولت سمیٹنے کا موقع فراہم کیے رکھا۔

میاں منظور احمد وٹو اسپیکر پنجاب اسمبلی تھے تو انہوں نے اسمبلی سیکرٹریٹ کو وزیراعلیٰ آفس سے علیحدہ کر دیا اور پھر اس میں اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے اپنے رشتہ دار اور دوست بھرتی کر دیے اور ایسے لوگوں کو بلا جواز ترقیاں دیں جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے لیے کام کریں گے۔ اس کی واضح مثال حبیب اللہ گورایہ تھے جنہیں وٹو نے تمام قواعد کو رد کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کا سیکرٹری بنا دیا اور جس نے بعد میں نواز شریف کی خاطر وٹو صاحب کو دھوکہ دیا۔ میاں وٹو پوری طرح میاں نواز شریف کے نقش قدم پر چلے اور انہوں نے نواز شریف کی طرح "وزیر اعلیٰ ڈائرکٹیوز" کے ذریعے صوبے کے انتظامی اور مالی ڈھانچے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

چونکہ سپیکر پنجاب اسمبلی کی حیثیت سے وٹو صاحب کے پاس کوئی انتظامی عہدہ نہیں تھا اس لیے وٹو صاحب کو اپنی "فتوحات" جاری رکھنے کے لیے صرف وزراء اور مشیروں اور ارکان اسمبلی کے علاوہ بیورو کریسی سے "تعلقات" کا سہارا لینا پڑا۔ میاں منظور وٹو نے اس دوران جن لوگوں کو "اکاموڈیٹ" کیا تھا ان سے ناجائز

بھرتیوں' کمیشن کے لیے تعمیراتی ٹھیکوں' پرکشش اسامیوں پر تبادلوں اور چیئرمینی کی صورت میں فائدہ اٹھایا۔ میاں منظور وٹو پر الزام لگایا جاتا رہا کہ انھوں نے اپنی سپیکر شپ کے دوران درجنوں افراد کو لاکھوں روپیہ وصول کر کے محکمہ مال میں تحصیلدار' نائب تحصیلدار اور پٹواری وغیرہ بھرتی کرایا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو پولیس سمیت دیگر انتظامی محکموں میں بھرتی کرایا۔ اپنے دوستوں کے لیے ٹھیکے حاصل کیے اور پھر ان لوگوں سے بھاری کمیشن وصول کیا۔

اس کے بعد میاں منظور وٹو کی وزارت اعلیٰ کا دور شروع ہوتا ہے جو پورے کا پورا کرپشن اور بے قاعدگیوں کا دور ہے۔ میاں منظور وٹو اگرچہ وزارت اعلیٰ کے عہدے سے دو سال کے عرصے کے بعد ہٹا دیئے گئے لیکن وہ اپنے پیچھے کرپشن کی ایسی جاندار روایت چھوڑ گئے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میاں منظور وٹو کا پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے سبکدوش ہونا طے تھا کیونکہ وٹو صاحب اپنی روش سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ روش اگر خالصتاً" سیاسی ہوتی اور جونیجو لیگ کے مفادات کی توسیع کے لیے ہوتی تو شاید وہ اقتدار کا تحفظ کر سکتے تھے لیکن ان کے مزاج میں شروع ہی سے لوٹ کھسوٹ کا عنصر نمایاں تھا جس کی وجہ سے وہ ہر سیاست دان سے بلیک ہوئے اور ان کی دھاندلی منظر عام پر آتی رہی۔ دو سال میں وٹو صاحب سوائے مال روڈ پر نصب کیے گئے کتبوں کے اور کچھ نہ کر سکے لیکن عوامی املاک کی بندر بانٹ میں وہ ہمہ تن مشغول رہے۔ جب وہ گئے تو ان کے اقتدار کا آخری جواز بھی ختم ہو چکا تھا۔

وٹو صاحب اپنے اقتدار کے آخری دورانیے میں سیکھے ہوئے سبق کو دہرا رہے تھے۔ کرپشن سے دولت جمع کرو' پھر لوکل گورنمنٹ کے اداروں پر قبضہ کرو اور اس کے بعد ہتھیائی ہوئی دولت اور کونسلروں کی مدد سے انتخاب جیتو۔ میاں منظور وٹو نے اپنی بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کا پہلا پڑاؤ "لاہور ترقیاتی ادارے" (LDA) میں ڈالا اور کروڑوں روپے کما لیے۔ ایل ڈی اے ایک ایسی گائے ہے جس کے تھن مختلف وزرائے اعلیٰ کی غیر محتاط کھینچا تانی سے بالآخر خشک ہو چکے ہیں۔ جب اس کو دوہنے کی میاں منظور وٹو کی باری آئی تو انہیں خبر تھی کہ میاں نواز شریف کے دور میں اس ادارے سے ۳۰۰۰ پلاٹ سمیٹ لیے گئے تھے۔ قانون یہ ہے کہ ہر ایل ڈی

اے سکیم میں ۲۰ فیصد کوٹہ وزیراعلیٰ کے لیے مختص ہوتا ہے۔ جب وزیراعلیٰ کے حاصل کردہ پلاٹ اس حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو وہ قانون میں آسانی کے ساتھ "نرمی" کر لیتا ہے اور اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے جتنے مزید پلاٹ درکار ہوں' حاصل کر لیتا ہے۔ ایم ڈی اے ملتان اور ایف ڈی اے فیصل آباد کے متعلق بھی یہ ایک حقیقت ہے اور جو وزرائے اعلیٰ کی لوٹ کھسوٹ کے بعد ایل ڈی اے کی طرح دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

میاں منظور وٹو اس وقت کے ایل ڈی اے کے وائس چیئرمین جاوید عمر خان اور ڈائریکٹر جنرل ایل ڈی اے اے یو سلیم نے ایل ڈی اے کے پلاٹوں میں وسیع پیمانے پر گھپلے کیے۔ تینوں افراد نے مل کر ۶ کروڑ روپے مالیت کے ۲۱ پلاٹ ناجائز طور پر الاٹ کر دیئے۔ حالانکہ ڈائریکٹر جنرل ایل ڈی اے نے ۱۹۹۳ء میں اپنے ایک حکم کے تحت ایل ڈی اے کی تمام پرانی سکیموں میں پی ٹی او کی بنیاد پر پلاٹ منتقل کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس کے باوجود وائس چیئرمین ایل ڈی اے جاوید عمر نے وزیراعلیٰ منظور وٹو کے ساتھ مل کر یو ایس ۲۰۹۱۔ یو ایس ۲۰۹۷' یو ایس ۲۰۹۸' یو ایس ۲۰۹۹' یو ایس ۲۱۰۱' اور پلاٹ نمبر یو ایس ۲۱۰۳ کو منتقل کیا۔ ان کیسوں کی پی ٹی ڈی کی تصدیق کے لیے بورڈ آف ریونیو کو چھ بار ریفر کیا گیا مگر بورڈ کی طرف سے صرف ایک بار جواب ملا کہ بورڈ میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ ۱۹۹۳ء میں اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل اے یو سلیم نے وائس چیئرمین جاوید عمر کی وساطت سے ایک سمری وزیراعلیٰ وٹو کو بھجوائی جو منظور ہو کر واپس آ گئی تاہم ۱۹۹۵ء تک اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ بعد ازاں الیوکیشن کمیٹی نے ان فائلوں پر گارڈن ٹاؤن میں ایل ڈی اے کی سکیم پر ۲۱ عدد پلاٹ مختص کر دیئے جن کی مالیت ۷ کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔

نیو گارڈن ٹاؤن میں مختص ہونے والے پلاٹوں کے نمبر درج ذیل تھے:

۱۳۶ گارڈن بلاک' ۱۲۸ اتا ترک بلاک' ۲۳' ۲۱۰' ۲۰۹ گارڈن بلاک' ۱۴۳ گارڈن بلاک' ۱۸۲' ۱۸۳ گارڈن بلاک' ۵۴' A۔۵۳' ۵۶ علی بلاک' ۱۵۶ گارڈن بلاک' ۵۰' ۵۱' ۵۲ علی بلاک اور ۲۲۳ گارڈن بلاک۔

ایک اور کیس میں سابق وزیراعلیٰ میاں منظور وٹو اور جاوید عمر نے مل کر

تین کروڑ روپے مالیت کے آٹھ کنال دو مرلے اراضی غیر قانونی طور پر منتقل کی۔ یہ اراضی ایک خاتون تھو بیگم کی ملکیت تھی۔ جسے ۱۹۶۲ء میں رقم وصول کر کے الاٹ کی گئی تھی۔ ۳۳ سال تک اس خاتون کی فائل بغیر کسی کارروائی کے پڑی رہی۔

۱۹۹۵ء میں مذکورہ بالا مفاد پرستوں نے اس عورت کی طرف سے ایک درخواست دائر کی اور معاوضہ واپس کر کے ناجائز طور پر دو پلاٹ ۳۵ احمد بلاک اور ۵۲ ابوبکر پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے۔ ان پلاٹوں کی ایگزیمپشن اور ایلوکیشن میں بھی بدعنوانیاں کی گئیں۔ اس کے علاوہ میاں منظور وٹو دور میں تقریباً ۵۰۰ پلاٹ ناجائز طور پر الاٹ کیے گئے اور اربوں روپے کے بدعنوانیاں کی گئیں۔ میاں منظور وٹو نے اپنے دور اقتدار میں میاں نواز شریف کے ساتھ رابطے استوار رکھے اور نواز شریف وزارت اعلیٰ کے دور میں غائب ہونے والی ۴۰۰۰ فائلوں کی انکوائری کے لیے قائم شدہ کمیٹی محض نواز شریف کو بچانے کے لیے توڑ دی۔ وزیراعلیٰ وٹو نے اس دوران اپنے "لاہور پیکج" کی تحت تقریباً ۲۰ کروڑ روپے کمشن وصول کر کے درجنوں ٹھیکے من پسند لوگوں کو دے دیئے۔

اس کے بعد وٹو نے مری کے علاقے بھوربن میں کروڑوں روپے مالیت کی ۱۴۷ کنال اراضی صرف ایک ہزار روپے فی کنال کے حساب سے ایک فرضی فرم کو ۵۰ سالہ لیز پر دے دی۔ اس موقع پر ایک فرضی عرب باشندے کو اس فرم کا چیئرمین ظاہر کیا گیا۔ میاں منظور وٹو کا بیٹا معظم وٹو' داماد اور قریبی رشتہ دار اس فرم میں بطور حصہ دار شامل تھے۔ وزیراعلیٰ وٹو کی خصوصی ہدایت پر سیکرٹری کالونیز نے اس لیز کی منظوری دی جبکہ سابق ڈپٹی کمشنر پنڈی جاوید اسلم نے اس کے متعلق نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ وٹو نے یہ زمین غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایک فائیو سٹار ہوٹل بنانے کی غرض سے لیز پر دی۔ اس علاقے میں ایک کنال اراضی کی قیمت ۸ لاکھ سے ۱۰ لاکھ روپے تھی۔ لیکن وٹو نے اس کی قیمت ایک ہزار روپے فی کنال مقرر کر دی۔ سیکرٹری کالونی کو حکم دے دیا کہ وہ اس کو فوری طور پر پچاس سالہ لیز پر دے دیں۔ میاں منظور وٹو پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس ہدایت کے عوض اسلام آباد کی ایک سرمایہ دار پارٹی سے دس کروڑ روپے کمیشن وصول کیا اور اس میں یہ شرط بھی عائد کر

دی کہ سارے منصوبے میں میرے بیٹے معظم اور داماد کو بھی حصہ دار بنائیں۔ اس کے بعد میاں منظور احمد وٹو نے اپنے کزن نسیم وٹو کے چار ملازموں کے نام پر لاہور میں اہم مقامات پر پیٹرول پمپ الاٹ کرانے کی منظوری دے دی۔ ایک ملازم اللہ دتہ کو ۳ اپریل ۱۹۹۵ء کو ۴۳ سوک سنٹر ایم اے جناح ٹاؤن لاہور میں پیٹرول پمپ الاٹ کر دیا۔ دوسرے ملازم محمد طفیل کو نیو شیرپاؤ لاہور میں ایک پیٹرول پمپ الاٹ ہوا۔ تیسرے ملازم محمد امین کے نام پر ۲۷ مارچ ۱۹۹۶ء کو فروٹ اینڈ ویجیٹیبل مارکیٹ علامہ اقبال ٹاؤن میں پیٹرول پمپ الاٹ ہوا جبکہ چوتھے ملازم فلک شیر کے نام پر ۲۱ اگست ۱۹۹۵ء کو اوپن ایریا بالمقابل ہنس پارک ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن لاہور میں پیٹرول پمپ الاٹ کرنے کی منظوری وزیر اعلیٰ منظور وٹو نے دے دی۔

اس کے علاوہ منظور وٹو نے اپنے پولیٹیکل سیکرٹری رانا گل ناصر کو ۲۹.۳.۹۵ کو نیو راوی پل کے قریب پیٹرول پمپ لگانے کی منظوری دے دی۔ اس کے بعد انہوں نے قریبی رشتہ دار احمد شجاع وٹو کے قریبی دوست نعیم حیدر کو جڑانوالہ روڈ پر اور مسز نگار توفیق کے نام پر ۴۰ اے سوک سنٹر سبزہ زار میں پیٹرول پمپ الاٹ کر دیئے۔ نعیم حیدر کی تعمیراتی کمپنی کو فیروز پور روڈ انڈر پاس سمیت متعدد کنٹریکٹ دے دیئے۔ ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ اس میں وزیر اعلیٰ منظور وٹو نے ۲۰ کروڑ روپے کمیشن حاصل کیا۔ واضح رہے کہ وزیر اعلیٰ منظور وٹو نے رانا گل ناصر کو گریڈ ۲۰ کی اسامی پر براہ راست تعینات کیا۔ اس کے بعد رانا گل حسن کو سرکاری گاڑیاں نمبر LOS 8951 اور LOE 9156 دے دی گئیں۔ جن پر ماہانہ پچاس ہزار روپے حکومت پنجاب کا موٹر ٹرانسپورٹ بل تیل اور مرمت کی مد میں خرچ کرتا رہا۔ اس کے بعد میاں منظور وٹو اپنے سیکرٹریٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹریٹ کی تزئین کے لیے ۷۵ کروڑ منظور کیا۔ لاہور کے ایک تعمیرات کی خدمات حاصل کیں اور وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے کمروں کی دیواروں پر قیمتی ٹائلیں لگائی جاتی رہیں۔ کمروں کا فرنیچر تبدیل کر دیا گیا۔ پورے وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے پردے تبدیل کر دیئے۔ ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ اس منصوبے میں منظور وٹو اور مذکورہ ماہر تعمیرات نے ۵۰ کروڑ روپے کی رقم خود ہڑپ کر لی۔ ذرائع کے مطابق وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ سے بچ جانے والی قیمتی ٹائلیں

اور دوسرا سامان منظور وٹو کے آبائی گاؤں وساوالہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے جہانگیر وٹو کو میٹرک پاس کرانے کے لیے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا۔ چیئرمین سیکنڈری بورڈ اور کنٹرولر کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ "پسر اعلیٰ" کی امداد کریں۔ منظور وٹو نے خصوصی طور پر اپنے بیٹے کی امتحان کے لیے ملتان کا انتخاب کیا اور چیئرمین بورڈ ملک بشیر اور کنٹرولر حاجی لطیف سے خصوصی طور پر اپنے بیٹے کے لیے وی وی آئی پی انتظامات کرائے گئے۔ پسر اعلیٰ کو امتحانی مرکز میں چھوڑنے کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان کی گاڑیاں استعمال کیں۔ منظور وٹو نے اپنے ایک عزیز ماسٹر جمیل کی سفارش کی اور اسے مذکورہ امتحانی سنٹر کا ممتحن بنا دیا گیا۔ ماسٹر جمیل کے ذریعے سے ڈائریکٹر جنرل کو ہدایت کر دی کہ چیئرمین اور کنٹرولر امتحانات کسی نوعیت کا دخل نہ دیں اور نہ کسی کی شکایت پر چیکنگ پارٹی کو اس طرف آنے دیں۔ ماسٹر جمیل پہلے محکمانہ طور پر تیار ہونے والی بلیک لسٹ میں شامل تھے۔ اس بڑے کارنامے کے عوض وٹو نے امتحانی سنٹر یعنی سکول کو حکومت کی طرف سے ایک کروڑ روپے کی گرانٹ مہیا کی۔

وٹو پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے سابقہ وزیر خوراک نکا اقبال کے ساتھ مل کر ۲۹۰ ملین روپے بار دانہ قبل از وقت خرید لیا۔ حالانکہ جس وقت اتنی بڑی مقدار میں بار دانہ کی خریداری کی گئی اس وقت اس مقدار کے دس فیصد حصے سے بھی آسانی کے ساتھ کام چلایا جا سکتا تھا۔ ذرائع کے مطابق اس سودے میں سے آدھی رقم منظور وٹو اور آدھی رقم سابقہ وزیر نکا محمد اقبال کے ہاتھ لگی۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ اصل میں ۲۹۰ ملین روپے کی لاگت سے خریدی جانے والی بار دانے کی مقدار صرف کاغذی تھی اور ایک بوری تک نہ خریدی گئی۔ لیکن کاغذوں میں درج کر دیا گیا کہ پنجاب میں نئی فصل کے لیے اتنا بار دانہ خرید ا گیا۔ وٹو کی وزارت اعلیٰ کے دوران محکمہ خوراک وٹو اور نکا اقبال گٹھ جوڑ کے باعث سنگین قسم کی مالی بدعنوانیوں کا شکار ہوا۔ وٹو اور نکا اقبال نے محکمہ خوراک میں نئے منصوبوں سے بھاری رقم بطور کمیشن وصول کی اور محکمہ کے بدعنوان افسروں کے خلاف پہلے سے جاری انکوائری کو روک دیا۔ وٹو نے اپنے دور میں ۳۶۲ لاکھ صوابدیدی کوٹہ کے تحت اپنے عزیز و اقارب کو الاٹ کر دیا۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے یہ پلاٹ ایل ڈی اے کے

بدعنوان افسروں کی مدد سے خصوصی اختیارات کی تلوار استعمال کر کے الاٹ کیے۔ اگرچہ اس وقت کے گورنر چودھری الطاف حسین نے ان پلاٹوں کی الاٹمنٹ کی تحقیق کرانے کی کوشش کی لیکن تحقیق کرنے والا عملہ منظور وٹو کا منظور نظر تھا۔ اس لیے کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔

لاہور ایئرپورٹ پر رن وے کی تعمیر کے دوران ہونے والی ساڑھے پانچ کروڑ روپے کی بدعنوانیوں کے سلسلے میں بھی وٹو پر الزامات لگائے گئے۔ لیکن وٹو نے اس کی تردید نہیں کی۔ طیارے درآمد کرنے والی ایک فرم پاکستان جنرل ایوی ایشن (پرائیویٹ) کے ایم ڈی جاوید احمد ضیاء اور سابقہ وزیر اعلیٰ منظور وٹو نے مل کر ٹینڈر نوٹس کے بغیر طیارہ خریدا۔ خریداری کا ٹھیکہ مارکیٹ سے زیادہ قیمت پر دیا گیا۔ طیارے کی قیمت ۱۹ کروڑ روپے تھی جبکہ اس کی پارکنگ کے زمرے میں ۲۴ کروڑ روپے ادا کیا گیا۔ طیارے کی خریداری کے لیے ڈالر بلیک مارکیٹ سے خریدے گئے جس نے قومی خزانہ کو بھاری نقصان پہنچایا۔ جاوید احمد ضیاء کی رقم کو طیارے کی خریداری کا ٹھیکہ دیا۔ جاوید ضیاء نے ۱۹ کروڑ روپے سے طیارے کی خریداری کی' جس میں ۶ کروڑ روپے بے ضابطگی کی گئی اور ۵ کروڑ روپے پارکنگ اور دیگر چارجز کے وصول کیے گئے۔ اس وقت جاوید ضیاء پنجاب میں ۱۲.۵ ارب روپے کی ہائی ویز اور ایکسپریس ویز کی تعمیرات کے منصوبے کے بھی نگران تھے۔ ان منصوبوں میں ساڑھے پانچ کروڑ روپے کا لاہور ونگ روڈ ایکسپریس وے کی تعمیر ۳.۶ ارب روپے' فیصل آباد پنڈی بھٹیاں ایکسپریس وے اور ڈیڑھ ارب روپیہ لاہور قصور شاہراہ کا ٹھیکہ شامل تھا۔ جاوید ضیاء وٹو گٹھ جوڑ اس وقت منظر عام پر آیا جب وفاقی حکومت نے وٹو طیارہ سکینڈل میں ملوث جاوید ضیاء اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کے متعلق ثبوت اکٹھے کیے۔ جاوید ضیاء نے وزیر اعلیٰ وٹو کی پشت پناہی سے مختلف یونٹوں کو نہ صرف شروع کیا بلکہ ان کو دن بدن مضبوط کیا۔ ان یونٹوں میں ننکانہ شوگر ملز' ماڈرن لمیٹڈ ٹیکسٹائل انڈسٹریز' پاکستان جنرل ایوی ایشن پرائیویٹ' ماڈرن اسٹیٹ' ماڈرن بلڈنگ سسٹم' ماڈرن گروپ آف کمپنیز اوکاڑہ' ایئر ویز جے ایس او پرائیویٹ اور اوکاڑہ ٹیکسٹائل ملز شامل تھے۔ وٹو نے اپنی سپیکر شپ کے دوران جاوید ضیاء کو نیشنل بینک

سٹ پاکستان لمیٹڈ ۲ کروڑ روپے کا قرضہ لے کر دیا۔

جاوید ضیاء نے اعتراف کیا کہ حکومت پنجاب سے حاصل کیے گئے ٹھیکوں اور طیارے کے خریداری کے معاملات سمیت اور دیگر معاملات میں میاں منظور وٹو کے صاحبزادے معظم وٹو اور داماد مظہر وٹو کے ذریعے چلاتا رہا ہوں اور یہ لوگ ان تمام معاملات میں کمیشن حاصل کرتے رہے ہیں۔ جاوید ضیاء کے بقول وٹو کے لیے بیچ کرافٹ طیارے کی خریداری میں معظم وٹو نے اہم کردار ادا کیا اور کمیشن کی ساری رقم بھی اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرائی۔

پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ نے حکومت پنجاب کے ساتھ مل کر جلو پارک میں امریکہ کے ڈزنی لینڈ کی طرز پر ایک تفریحی پارک تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ ۱۹۹۱ء میں بنایا گیا۔ محکمہ جنگلات سے ۹۹ سالہ لیز پر ۲۲۱ ایکڑ زمین حاصل کی گئی۔ اس منصوبے کو عملی صورت اس وقت ملی جب منظور وٹو وزیر اعلیٰ پنجاب بنے اور انہوں نے ورلڈ ایڈونچر نامی ادارے سے ۱۹۹۳ء میں ایک تحریری معاہدہ کیا۔ اس کمپنی نے امریکی ڈزنی لینڈ کی طرز پر تفریح مہیا کرنا تھی مگر یہ کمپنی ڈزنی لینڈ کی بجائے لینڈ کروزر کی فراہمی کا ذریعہ بن گئی۔ ورلڈ ایڈونچر کے کارندوں نے تفریح مہیا کرنے کی بجائے ۲۲۱ ایکڑ پر پھیلے ہوئے کروڑوں کے درختوں کو کاٹنے کا پلان بنا لیا۔ پنجاب حکومت ماحولیاتی تحفظ کے اداروں کے احتجاج کے باوجود آنکھیں بند کیے ہوئے خاموش رہی۔

میاں منظور وٹو نے کامیاب حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وزیراعظم بے نظیر کو افتتاح کے لیے بلایا۔ ڈیڑھ ارب روپے کا پراجیکٹ حاصل کرنے والے ادارے کی مالی حالت کا یہ عالم تھا کہ اس نے افتتاحی تقریب کے موقع پر بروشر اور اشتہارات بھی حکومت پنجاب کے خرچ پر دلوائے۔ اس منصوبے کا ڈراپ سین اس وقت ہوا جب منظور وٹو حکومت ختم ہونے پر پراجیکٹ کا معاہدہ منسوخ کر دیا گیا لیکن منظور وٹو پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس پراجیکٹ سے ۱۰ کروڑ روپے کمائے۔ وٹو نے درختوں کی کٹائی کی اجازت بھی اس لیے دی کہ مزید پیسے کمائے جا سکیں۔

ریکروٹمنٹ پلان نام کے اس روزگار پیکج کے تحت صوبہ میں حکمران پی ڈی ایف کے ہر رکن صوبائی اسمبلی کو پندرہ اسامیوں پر مشتمل ایک پروگرام دیا گیا۔

جولائی ۹۵ کے آخری ہفتہ میں وزیر اعلیٰ وٹو نے صوبے کے اعلیٰ سرکاری عہدیداروں اور ساتھی ارکان اسمبلی کے مشورے سے ہر رکن کو پیش کی جانے والی پندرہ اسامیوں کا حتمی تعین کر لیا۔ جونیئر کلرک سے لیکچرار تک کی اسامیاں کچھ یوں تھیں: ۲ جونیئر کلرک، ۲ جیل وارڈر، ایک آفس اسسٹنٹ، ایک اسٹینو گرافر، ۲ فوڈ گرین سپروائزر، ایک لیبارٹری ٹیکنیشن، ایک ڈویژنل سپورٹس کوچ، ایک تحصیل سپورٹس افسر، ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس، ایک سب انجینئر، ایک ماہر مضمون اور ایک لیکچرار۔

ان اسامیوں پر پی ڈی ایف پنجاب کے ہر رکن صوبائی اسمبلی نے اپنی صوابدید پر بھرتیوں کی سفارش کرنا تھی۔ خالصتاً" وٹو کے تخلیق کردہ اس بھرتی پلان کی بھنک پی ڈی ایف سے تعلق رکھنے والے اراکین قومی اسمبلی کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے ناہید خان اور آصف علی زرداری سے سفارش کی کہ وہ وٹو کو اس بات پر راضی کریں کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے پی ڈی ایف کے ارکان قومی اسمبلی کو بھی اس ریکروٹمنٹ پلان سے استفادہ کا موقع دیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وزیراعظم بے نظیر یا کسی دوسرے وفاقی حکومت کے عہدیدار نے وٹو کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت کی تھی لیکن تقریباً ایک ہفتہ بعد وزیر اعلیٰ وٹو نے پنجاب سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگ (ج) کے ارکان قومی اسمبلی سے ملاقات کر کے فیصلہ کیا کہ پی ڈی ایف کے تمام پنجابی ارکان قومی اسمبلی کو بھی اس ریکروٹمنٹ پلان میں شامل کر لیا جائے۔ لہٰذا ان ارکان قومی اسمبلی کو بھی فی کس ۱۵ اسامیوں سے مستفید ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

وٹو نے اس موقع پر فیصلہ کیا کہ وہ اس بھرتی پروگرام سے عام رکن اسمبلی کی طرح مستفید نہیں ہوں گے بلکہ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اور ریکروٹمنٹ پلان کے خالق ہونے کی حیثیت سے پی ڈی ایف پنجاب اور ارکان قومی اسمبلی کو دی جانے والی تمام اسامیوں کا دس فیصد اضافی حصہ لیں گے۔ اگست ۹۵ کے پہلے ہفتہ میں وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ نے ارکان اسمبلی میں اسامیاں بانٹنے کا عمل شروع کیا۔ پنجاب پیپلز پارٹی کے ۱۰۰ ارکان اسمبلی نے اس بھرتی پروگرام سے ۱۵۰۰ اسامیاں حاصل کیں۔ صرف تین ارکان صوبائی اسمبلی نے اس پلان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ مسلم لیگ (ج) پنجاب سے

تعلق رکھنے والے ۲۳۳ ارکان صوبائی اسمبلی میں سے ۳۲ ارکان نے ۴۸۰ اسامیاں حاصل کیں۔ جبکہ وٹو نے ممبر صوبائی اسمبلی کی حیثیت سے کوئی اسامی حاصل نہ کی۔ اس کے علاوہ پی ڈی ایف کے دیگر اتحادی ممبران اسمبلی میں سے ۱۸ ارکان نے ۲۴۰ اسامیاں حاصل کیں اور اپنے اپنے سفارش کردہ لوگوں کو وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ بھجوانا شروع کر دیا۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے پیپلز پارٹی کے ۵۳ ارکان میں سے صرف ایک رکن قومی اسمبلی مخدوم شہاب الدین نے کوئی اسامی حاصل نہ کی۔ جبکہ ۵۲ ارکان اسمبلی نے ۷۸۰ اسامیاں حاصل کر لیں۔ پنجاب کے مسلم لیگ (ج) کے ۶ ارکان قومی اسمبلی نے ۹۰ اسامیوں کے لیے وزیر اعلیٰ ہاؤس سے رابطہ کر لیا۔ جبکہ پنجاب سے پی ڈی ایف کے اتحادی ۴ ممبران قومی اسمبلی نے بھی ریکروٹمنٹ پلان میں سے ۶۰ اسامیاں حاصل کر لیں۔ اس طرح پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان قومی اسمبلی کے حصے میں کل ۹۳۰ اسامیاں آئیں۔ آخر میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں وٹو نے ریکروٹمنٹ پلان کے تحت تفویض کی جانے والی کل ۳ ہزار اسامیوں کا ۱۰ فیصد اضافی کوٹہ یعنی ۳۰۰ اسامیاں خود حاصل کر لیں۔ وزیر اعلیٰ کو ملنے والی ۳۰۰ اسامیوں میں نچلے درجے کی تمام اسامیاں ختم کر کے ان کی جگہ گریڈ ۱۷ کی اسامیاں حاصل کی گئیں۔ ریکروٹمنٹ پلان کے اس بھرتی منصوبے کے تحت ان اسامیوں کی نامزدگی کے حوالے سے بنیادی شرط یہ تھی کہ متعلقہ اسامی کے لیے مطلوبہ تعلیمی قابلیت کے زمرے میں امیدوار کا سیکنڈ ڈویژن ہونا ضروری تھا۔ لیکن چونکہ اس ریکروٹمنٹ پلان کا اصل مقصد پی ڈی ایف کے ڈانواں ڈول ممبران اسمبلی کو سیاسی رشوت پیش کرنا تھا اس لیے شرائط کی پابندی برائے نام تھی۔ بعض ممبران اسمبلی نے ایسے افراد کے نام بھی اپنی مرتب کردہ بھرتی لسٹوں میں شامل کر دیے جو مطلوبہ تعلیمی ڈگری بھی نہیں رکھتے تھے اور ان کی عمریں بھی ڈھل چکی تھیں۔ معزز ارکان اسمبلی نے مذکورہ بالا اسامی کے اس کی اہمیت کے تناسب سے نرخ مقرر کیے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

اے ایس آئی پولیس کی اسامی کے لیے ۳ سے چار لاکھ روپے' لیکچرار اور ماہر مضمون کی حیثیت سے ۲ سے ۳ لاکھ روپے' سب انجینئر کے لیے عمومی ریٹ ایک سے دو لاکھ تک رہا۔ ڈویژنل سپورٹس کوچ اور تحصیل سپورٹس افسر کی اسامیوں کے

لیے فی اسامی ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کر کے لوگوں نے بھرتی لسٹ میں نام درج کرایا۔ فوڈ گرین سپروائزر کی اسامی کے لیے ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپے ریٹ مقرر ہوا۔

فوڈ گرین سپروائزر کی اسامی کا ایک لاکھ روپے سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک ریٹ مقرر ہوا۔ جبکہ اسٹینو گرافر' آفس اسسٹنٹ' جیل وارڈر اور جونیئر کلرک کی اسامیاں ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے میں فروخت ہوئیں۔ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے تمام اسامیوں کا دس فیصد کوٹہ یعنی ۳۰۰ اسامیاں جو وٹو کے حصہ میں آتی تھیں' انھیں پر کرنے کے لیے انھوں نے اپنے خاص لوگ مقرر کیے جنھوں نے وزیر اعلیٰ کے کوٹے کی بیشتر اسامیوں کے لیے بھاری رقوم وصول کیں۔ انھوں نے ہر اسامی کے لیے عمومی شرح سے زائد رقم وصول کی۔ اس طرح پنجاب بھر سے ۳۳ سو آسامیوں کے لیے محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۵ ارب روپے کی خطیر رقم ہزاروں امیدواروں نے وزیر اعلیٰ وٹو کے اس ریکروٹمنٹ پلان کے لیے ارکان اسمبلی کو دی۔

یہ بھرتیاں اس وقت منطقی انجام کو پہنچ گئیں جب صدر لغاری نے صوبے میں وٹو حکومت کو معطل کر دیا۔ ہزاروں افراد اپنے پیسوں کی بازیابی کے لیے سیکرٹریٹ کے چکر لگاتے رہے لیکن ارکان اسمبلی اور وٹو ان کو یہی دلاسہ دیتے رہے کہ ان کی حکومت ہائی کورٹ سے بحال ہو جائے گی تو ریکروٹمنٹ پلان کے تحت نامزد کیے جانے والے تمام امیدواروں کو ملازمت دلوائیں گے۔ لیکن جب وٹو ہائی کورٹ سے بحال ہوئے تو اتنے کمزور تھے کہ وہ صرف اپنے صوابدیدی فنڈ سے اپنے ایک عزیزی کو چند ہزار روپے تو دے سکے اپنے تخلیق کردہ ریکروٹمنٹ پلان کی طرف دیکھ بھی نہ سکے۔ اس طرح پانچ ارب روپے کی اس کرپشن کا براہ راست الزام میاں منظور وٹو کے سر جاتا ہے جنھوں نے اپنی طبیعت کے عین مطابق ارکان اسمبلی کو اپنی حلقہ دام میں رکھنے کی غرض سے یہ پلان تیار کیا تھا۔

اسی طرح وٹو نے اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں اپنے آبائی علاقہ اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے تین سو افراد کو صرف ایک رات میں پولیس میں بھرتی کرا دیا۔ وزیر اعلیٰ نے ایک شام صوبے میں بھرتی پر عائد پابندی اٹھائی اور پولیس کی گاڑیاں اپنے گاؤں وساوے والا روانہ کر دیں۔ آدھی رات کو یہ گاڑیاں ۳۰۰ کے قریب

نوجوانوں کو لے کر پولیس لائن آئیں اور ان کی چھاتیاں ناپ کر انھیں پولیس میں بھرتی کرایا گیا۔

اگلی صبح صوبائی حکومت نے بھرتی پر دوبارہ پابندی عائد کر دی۔ وٹو کی حکومت کا دارومدار بلیک میلنگ پر رہا۔ وٹو مسلم لیگ (ج) کے وزیروں کو لگام نہ ڈال سکے۔ چونکہ وہ پیسہ بنانے کی آزادی کا چارہ ڈال کر مزید لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے' اس دوران محکمہ تعلیم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ اساتذہ کو تبادلوں کے لیے اور تبادلے رکوانے کے لیے بھاری رشوت دینا پڑی۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے دیے گئے فنڈ خرد برد کر لیے گئے۔ قانون پر عمل کرنے والے اساتذہ اور طلبہ کو چپ کرانے کے لیے ایم۔ ایس ایف (ج) کو تسلیم کیا جانے لگا۔

میاں منظور وٹو سے جب ان پر لگائے جانے والے الزامات کے بارے میں بات کی گئی تو انھوں نے تمام الزامات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دے دیا اور کہا کہ میں اپنے آپ کو قوم کے سامنے احتساب کے لیے پیش کرتا ہوں اور میری طرح میاں نواز شریف اور بے نظیر بھی اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کریں۔ انھوں نے کہا کہ میں ان الزامات کی پرزور تردید کرتا ہوں۔

ایڈمرل منصور الحق

پاکستان نیوی کے سابق سربراہ ایڈمرل منصور الحق پر بے تحاشہ کرپشن اور بے قاعدگیوں کے الزامات پہلی بار ذرائع ابلاغ کے ذریعے سامنے آنا شروع ہوئے تو ملک کی فوجی بیورو کریسی میں کھلبلی مچ گئی۔ پاکستان میں سیاست دانوں اور سول بیورو کریسی کی کرپشن کے راز افشا ہونا تو ایک معمول کی بات تھی جبکہ اگر فوج کے کسی اعلیٰ عہدیدار کی کرپشن منظر عام پر بھی آتی تو عموماً اس کی ملازمت ختم ہونے کے بعد ہوتا۔ کسی حاضر سروس فوجی سینئر اور ایسے فوجی عہدیدار جس کے پاس بحری فوج کے کمانڈر کا عہدہ تھا' اس کی بدعنوانیوں کے بارے میں اس کی سروس کے دوران انکشافات ہونا بہت حد تک حیران کن تھا۔

بحریہ کے سربراہ منصور الحق کی شخصیت کے متنازعہ ہونے میں اہم ترین کردار آصف علی زرداری کا تھا جو منصور الحق کے ساتھ مل کر کروڑوں روپے کی کرپشن کا ذمہ دار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سابقہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے پرنسپل سیکرٹری احمد صادق کا بھی بہت اہم رول تھا جو منصور الحق کا بہت قریبی عزیز تھا۔ انہی الزامات کے ثابت ہو جانے کے بعد ایڈمرل منصور الحق کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ایڈمرل منصور الحق نہ صرف آصف علی زرداری کے دوست تھے بلکہ ان کی ایڈمرل کے طور پر تقرری بھی آصف علی زرداری کا کارنامہ تھا۔ ایڈمرل منصور الحق نے اپنے تعلقات کو مستحکم کرنے کی خاطر آصف زرداری کے دوست خلیل شیخ اور ان

کی اہلیہ منزہ شیخ کو "کیپ مونز" کے قریب زمین الاٹ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ منزہ شیخ کیپ مونز کے قریب ایک فائیو سٹار ہوٹل بنانا چاہتی تھی جبکہ یہ حساس ترین علاقہ ہے کیونکہ ایک جانب کیپ (Cannp) کا ایٹمی بجلی گھر ہے اور دوسری طرف پاکستان نیوی کی خفیہ تنصیبات۔ ملکی دفاع کے نقطہ نظر کی بدولت لینڈ یوٹیلائزیشن ڈیپارٹمنٹ نے ۳۰ ہزار روپے فی ایکڑ کے حساب سے ۹۹ سال کی لیز پر وزارت دفاع کی معرفت پاک بحریہ کو الاٹ کی تھی اور اس وقت یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ اس زمین کو تجارتی مقاصد کے لیے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ سمندر کنارے اس زمین پر آصف زرداری کے دست راست طفیل شیخ اور اس کی بیوی منزہ شیخ کی نظر تھی جو پاکستانی حکمرانوں کی عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

انہوں نے آصف زرداری سے اس زمین کی الاٹمنٹ کے متعلق کہا تو زرداری صاحب نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ کو ہدایت کی کہ فوری طور پر یہ کام مکمل کروائیں۔ کاغذات کی تکمیل کے باوجود یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک پاکستان نیوی منزہ شیخ کو این او سی جاری کرتی۔ مگر زرداری صاحب کے کہنے پر اس حساس علاقہ میں ۱۰۰ ایکڑ زمین کو سیاحت کے فروغ اور ساحل پر ماحولیاتی آلودگی کو دور کرنے کے لیے منزہ شیخ کو دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ۲ ستمبر ۱۹۹۴ء کو عبداللہ شاہ نے فائل مکمل کر کے متعلقہ محکمے کو بھیج دی جس نے سمری بنا کر واپس وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ کو بھیج دی اور وزیر اعلیٰ نے زمین منزہ شیخ کو الاٹ کر دی۔ اس کے بعد فائل تکمیل احکامات کے لیے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے وزیر اعلیٰ سندھ کو مطلع کیا کہ یہ زمین پہلے ہی پاکستان نیوی کو الاٹ ہو چکی ہے اس لیے منزہ شیخ کو الاٹ نہیں ہو سکتی، مگر بحریہ کے سربراہ ایڈمرل منصور الحق نے وزیر اعلیٰ کو اپنے ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء کے خط میں منزہ شیخ کو زمین الاٹ کرنے کی حمایت کر دی۔

اس خط کے جواب میں وزیر اعلیٰ نے نیول چیف کو اپنے بھرپور تعاون کی پیشکش کی تاکہ ساحلی علاقے میں سیاحت کو "فروغ" اور ماحولیاتی آلودگی کو "دور" کیا جا سکے۔ اس طرح نیوی کے ڈائریکٹر ورکس لیاقت ملک کی جانب سے این او سی جاری ہونے کے بعد فائل وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچی اور ۱۸ اکتوبر کو یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ

گیا۔ ایڈمرل کی سفارش سے ۶ روپے فی مربع گز کے حساب سے زمین طفیل شیخ اور منزہ شیخ کو الاٹ کر دی گئی۔ اس طرح ۳۰ کروڑ کی زمین صرف ۳۰ لاکھ میں بخش دی گئی۔

ایف آئی اے امیگریشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر حاجی قدیر نے عبداللہ شاہ کو کے پی ٹی کی زمین کوڑیوں کے مول فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ دوران تفتیش سابقہ وزیر اعلیٰ نے ایف آئی اے کو بتایا کہ کیپ موز کی زمین جو میں نے پاکستان نیوی کو الاٹ کی تھی' آصف زرداری کے دباؤ پر ان کے دوست طفیل شیخ کو ایڈمرل منصور الحق کے کہنے پر الاٹ کی کیونکہ جب پاکستان نیوی کو اعتراض نہیں تھا تو میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔

۱۹۹۴ء میں پاکستان اور فرانس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی بدولت فرانس نے ۲۳۳ ملین ڈالر کے عوض ۱۸ عدد ۳۹۔ ایس ایم میزائل پاک بحریہ کو فراہم کرنا تھے۔ یہ میزائل آب دوز سے فائر کیے جاتے ہیں۔ ایڈمرل منصور الحق نے اس معاہدہ کی بدولت ۸۔۱۲ ملین ڈالر کا کمیشن لیا یعنی ۲ ارب ۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کمائے اور پاکستان نیوی کو اڑھائی ارب روپے کا نقصان پہنچایا۔ اس معاہدہ کی شرائط بہت سخت طے کی گئی تھیں کیونکہ معاہدہ میں ایک میزائل کی قیمت ۵۔۳ ملین ڈالر رکھی گئی اور اس طرح ایک میزائل ۲ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے میں پڑا اور اگر ان میں سے کوئی میزائل سٹیٹ فائر کے دوران ناکام رہے گا تو اس کی قیمت بھی پاکستان ہی کے کھاتے میں جائے گی۔

بے نظیر اپنے دور حکومت میں سویڈن گئیں تو سویڈن نے پاکستان کو ۷۰۰ ملین ڈالر کا قرض دینے کا وعدہ کیا۔ آصف زرداری نے ایڈمرل منصور الحق سے رابطہ کیا اور ۵۰۰ ملین ڈالر کا کھاتہ پورا کرنے کے لیے اریکسن کمپنی کے بنائے ہوئے خاص قسم کے ساحلی ریڈار خریدنے کی درخواست دے دی۔ منصور الحق نے نیوی کے متعلقہ شعبے کے افسران سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہمیں ایسے ریڈار کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس پہلے سے ہی ساحلی علاقوں کی نگرانی کے لیے مکمل نظام موجود ہے۔ نیوی کے انکار کے باوجود منصور الحق نے مذکورہ نظام کی خریداری کی درخواست

دے دی۔ ۵۰۰ ملین ڈالر میں خریدے جانے والے سامان کی اصل مالیت ۲۵۰ ملین ڈالر سے زیادہ نہ تھی۔ سامان کی خریداری میں نیوی کے مروجہ طریق کار کی خلاف ورزی کی گئی۔ آصف زرداری کی گرفتاری کے بعد ایڈمرل منصور الحق کی خواہش تھی کہ کمیشن کی ساری رقم میں خود لے لوں۔

کراچی میں نیوی کے اسٹیڈیم کو پولو گراونڈ میں تبدیل کرنے کا کارنامہ بھی ایڈمرل منصور الحق نے انجام دیا۔ آصف زرداری کی خواہش کے سامنے ایڈمرل صاحب نے اپنے تمام تر اصول و ضوابط رد کر دیئے اور ملک کے اہم ترین عہدے اور قومی ذمہ داریوں کو "دوست" کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

مرد اول جب کراچی آئے تو ان کو تحفے کے طور پر نیوی کی حساس تنصیبات میں واقع قیمتی زمین پر قائم اسٹیڈیم پیش کیا جس کو آصف زرداری نے بخوشی قبول کر لیا اور راتوں رات اس کو پولو گراونڈ میں بدلنے کا کام شروع کرا دیا۔ جب بے نظیر حکومت توڑ دی گئی تو اس منصوبہ پر کام روک دیا گیا لیکن اس وقت تک کروڑوں روپے ضائع ہو چکے تھے جو پاکستان نیوی کے کھاتے میں پڑے۔ ایڈمرل منصور الحق جب پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کے سربراہ تھے تو انہوں نے اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو پی این ایس سی بلڈنگ میں مدعو کیا اور تیس (۳۰) ہزار ڈالر مالیت کی قیمتی گھڑی بطور تحفہ وزیراعظم کی خدمت میں پیش کی جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ منصور الحق صاحب نے یہ گھڑی پی ایس ایس سی کے فنڈ میں سے نیویارک سے خریدی تھی۔

(ایڈمرل منصور الحق پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ریٹائرڈ نیوی کے افسر کو دوبارہ اسی عہدے پر بحال کر دیا۔

ایڈمرل منصور الحق نے اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر بے شمار دیانت دار افسران کا مستقبل تاریک کر دیا اور نیوی کے ڈسپلن کو تباہ و برباد کر کے کرپشن مافیا کو جنم دیا۔

ایڈمرل منصور الحق کو پی این ایس سی کے نئے جہازوں کی خریداری کمیٹی کا چیئرمین ان کے بھانجے اور بے نظیر بھٹو کے سابق پرنسپل سیکرٹری اور آصف زرداری

کے "معاون خصوصی" احمد صادق نے بنایا۔ منصور الحق نے پی این ایس سی کے لیے ۳ سستے جہاز مہنگے داموں خرید کر لاکھوں روپے کمیشن حاصل کی۔

پی این ایس سی کے کھاتے سے ان کے بچے اور وہ خود امریکہ کے دورے کرتے رہتے کیونکہ ان کی ایک بیٹی حمیدہ اپنے انجینئر شوہر کے ہمراہ ہیوسٹن امریکہ میں مقیم ہیں۔

وہ ۱۹۹۵ء کے آخر میں ہیوسٹن اپنے بچوں کے ہمراہ گئے اور وہاں کے مہنگے ترین گرانڈ ہوٹل میں ٹھہرے۔ ان کے ہمراہ بیٹی اور داماد بھی تھے۔ سارا خرچ پی این ایس سی کو ادا کرنا پڑا۔

ایڈمرل منصور الحق نے کیماڑی میں تیل ذخیرہ کرنے کے لیے آئل ٹینک بنانے کی خاطر من پسند کمپنیوں کو اجازت نامے جاری کر دیئے حالانکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جب بھارتی حملے سے آئل ٹینکروں میں آگ لگ گئی تھی اس کے بعد وفاقی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا اگر کراچی کو تباہی سے بچانا ہے تو آئندہ کسی کو یہاں پر آئل ٹینک بنانے کی اجازت نہ دی جائے' مگر موصوف نے قانون اور وفاقی کمیٹی کے اس فیصلے کی دھجیاں اڑا دیں جس کے پیچھے صرف دولت اکٹھی کرنے کی ہوس تھی۔ کیونکہ کیماڑی آئل ٹرمیل کے لیے مختص پلاٹوں کی قیمتیں آسمان تک پہنچ جائیں گی اور منصور الحق کی منظوری سے جاری کردہ ہر پلاٹ کوئی بھی تیل کمپنی بآسانی دو سے اڑھائی کروڑ روپے میں خریدنے پر آمادہ ہے۔

سیالکوٹ کے دیہی علاقے میں ۴۰۰ کنال سستی اور ناکارہ زمین ۳۰ ہزار روپے فی کنال میں خریدی۔ عرصہ تک زمین بیکار رہی اور اس کی غیر افادیت کو چھپانے کے لیے وہاں پر نیول سینٹر کی تعمیر کا حکم دے دیا۔

منصور الحق کو بحیثیت چیئرمین پی این ایس سی برمودا امریکہ میں ہونے والے جہاز ران کمپنیوں کے سربراہی اجلاس میں پی اینڈ آئی کلب کی جانب سے مدعو کیا گیا تو وہ بیوی کے ساتھ بچوں کو بھی "برمودا" لے گئے۔ موصوف نے بچوں کو ہدایت کی کہ اپنے تمام بل کا اندراج ان کے کمرے کے بل میں کریں۔ اس طرح ایڈمرل منصور الحق کے کمرے کا بل ۱۸۷۳ امریکی ڈالر بنا اور ان کے بچوں کے کمرے کا بل صرف

۹۹۳ ڈالر تھا۔ روانگی کے وقت انتظامیہ نے بل کی ادائیگی کا کہا تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں میں پاکستان سے بھیج دوں گا۔ مگر پاکستان پہنچ کر بل ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

نیوی چیف ایڈمرل منصور الحق نے بحریہ کی اکثر تنصیبات پر فرنیچر کی سپلائی اور لکڑی کے کام کے کئی ٹھیکے بیلٹ اور سٹیٹ نامی کمپنی کو صرف اس لیے دیئے کہ کمپنی والے ان کی بیوی کو نذرانے اور تحفے تحائف دیتے تھے۔

ایڈمرل توقیر نقوی نے استعفیٰ میں صاف لکھا کہ موجودہ چیف آف نیول سٹاف (ایڈمرل منصور الحق) کی موجودگی میں ماتحت باوقار طریقے سے کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ چیف نیول اسٹاف کی جوڑ توڑ' سازشوں اور سیاست میں بے جا دلچسپی ان کی قیادت کی اعلیٰ روایات سے کوئی مطابق نہیں رکھتی۔ مگر ان سب کے باوجود عسکری قیادت نے ایڈمرل منصور الحق کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی حالانکہ نیول چیف کی مشکوک سیاسی سرگرمیوں جوڑ توڑ و سیاست میں حد سے زیادہ دلچسپی اور رابطوں کو مستحکم کرنے کے لیے ہمیشہ گرم جوشی کے مظاہروں سے عسکری حلقے بخوبی آگاہ تھے۔

ایڈمرل منصور الحق نے "بحریہ ٹاؤن" کے ذریعے بھی فوج کے کردار کو عوام کی نظر میں داغ دار کیا۔ بحریہ ٹاؤن کے ذریعے فوج کی روایات کو پامال کیا گیا۔ اس کے بروشر میں کسی بھی ذمہ دار فرد کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن خصوصی طور پر "بحریہ فاؤنڈیشن" کا امتیازی نشان استعمال کیا گیا جس کے نیچے پاکستان نیوی کا مخفف (P N) استعمال کیا گیا۔

بحریہ ٹاؤن (پرائیویٹ) لیمٹڈ کے نام سے جب ایک کمپنی رجسٹر کرانے کے لیے درخواست دی گئی تو کسی ایک شق میں بھی بحریہ ٹاؤن اور پاکستان پاکستان نیوی کے درمیان اشتراک کا تذکرہ تک نہ کیا گیا اور نہ ہی اس کا ذکر کیا گیا کہ یہ کمپنی پاکستان بحریہ کی راہنمائی میں کام کر رہی ہے۔ ایڈمرل منصور الحق کے توسط سے اس منصوبہ کا چیف ایگزیکٹو ملک ریاض حسین سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اور بحریہ کے نام پر اپنے مفادات کو آگے بڑھاتا اور منصور الحق کے مفادات کی نگہبانی کرتا رہا۔

بحریہ ٹاؤن کا منصوبہ اس کے اشتہارات' دفاتر' بروشر اور عوام سے رقوم کی وصولی کا سلسلہ اڑھائی سال تک جاری رہا۔ سارے عمل کو منصور الحق کی مسلسل سرپرستی حاصل رہی۔ اگر بحریہ کے کسی سینئر افسر نے اختلافی رائے دی تو اسے ایڈمرل منصور الحق نے اسے خاموش کرا دیا۔ سینٹر گلزار' ناہید خان اور زرداری کے اشتراک سے چلنے والے اس منصوبے نے کروڑوں روپے کما لیے۔

منصور الحق اور دیگر مقتدر شخصیات کے براہ راست ملوث ہونے کے باعث کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ وہ قواعد و ضوابط کی پامالی کی دلیرانہ وارات کا نوٹس لیتا۔ صرف پاک بحریہ کے نام پر اعتبار کر کے کئی افراد جنہوں نے زندگی بھر کی جمع پونجی پلاٹوں کی نذر کر دی اب اس فراڈ کے بعد پریشان حال ہیں۔ بعد میں منصور الحق کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا لیکن اس کے باوجود ان کو ان کے سنگین جرائم کی کوئی سزا نہیں دی جا سکی۔

نواب زادہ نصراللہ خان

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے چند جاندار کرداروں میں نواب زادہ نصراللہ خان کا بھی شمار ہوتا ہے کیونکہ نواب زادہ عموماً اپوزیشن کی سیاست کرتے رہے ہیں۔ لیکن ماضی کی سیاسی زندگی میں شاید نوابزادہ نصراللہ خان کی شخصیت اتنی متنازعہ نہیں بن سکی جتنی ۱۹۹۳ء میں بننے والی بے نظیر بھٹو کی حکومت کے دوران متنازعہ بن کر سامنے آئی۔ اس دورانئے میں نہ صرف نواب زادہ نصراللہ خان نے اپنی ماضی کی حاصل کردہ سیاسی نیک نامی کو داؤ پر لگایا بلکہ اپنی پوری سیاسی زندگی میں پہلی بار نواب زادہ نصراللہ خان کو کرپشن اور بدعنوانیوں کے الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ نواب زادہ نہ صرف ذاتی طور پر کرپشن کے الزامات کا نشانہ بنے بلکہ اپنے بیٹے نوابزادہ منصور علی خان کے حوالے سے بھی نواب زادہ کو شدید نوعیت کی تنقید اور الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے سامنے ایک قطعی مختلف نواب زادہ نصراللہ وارد ہوئے جن کا وجود ان کے ماضی سے بہت زیادہ متضاد تھے۔

جنوبی پنجاب کے علاقے مظفر گڑھ کے قصبہ خان گڑھ کے رہائشی نواب زادہ نصراللہ کے خاندان کی تاریخ انگریزوں کے ساتھ تعاون اور پھر تعاون کے صلے میں حاصل ہونے والی جاگیر سے چلتی ہے۔ ان کے آباؤ و اجداد کو انگریزوں سے تعاون کے صلے میں ۱۹۰۹ء میں گیارہ گاؤں الاٹ ہوئے تھے۔ نواب زادہ کے خاندان کے افراد آنریری مجسٹریٹ اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدوں پر فائز رہے۔ نواب زادہ

نصراللہ کے والد نواب زادہ خان محمد عبداللہ آنریری مجسٹریٹ اور چار مواضع کے نمبردار تھے اور ساتھ ہی زمیندار بینک کے صدر بھی۔

نواب زادہ نصراللہ خان نے ۱۹۳۳ء میں طالب علم کی حیثیت سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ قیام پاکستان میں ان کا سیاسی کردار نمایاں ہوتا گیا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی نواب زادہ نصراللہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں نواب زادہ نصراللہ خان نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد جمہوری مجلس عمل میں شامل ہو کر نواب زادہ نصراللہ خان نے ایوب خان کی آمریت کے خلاف اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں ایوب خان نے گول میز کانفرنس کے نام پر اپنے خلاف تحرک سیاست دانوں سے مذاکرات کیے اور یہ مذاکرات نصراللہ خان کی پہلی سیاسی سطح کی کامیابی تھی کیونکہ ایوب خان ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نواب زادہ نصراللہ اپنی سیاسی پارٹی پاکستان جمہوری پارٹی سمیت بہت بری طرح شکست سے دو چار ہوئے۔ نواب زادہ نے دو حلقوں سے شکست کھائی۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں نواب زادہ نصراللہ خان نے اپوزیشن رہنما کی حیثیت سے حکومتی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نواب زادہ نے پیپلز پارٹی کے امیدوار سردار امجد دستی کو شکست دی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ۷۷ کے انتخابات کے بعد تحریک چلانے والوں میں سب سے معتبر سیاسی نام نواب زادہ نصراللہ خان کا تھا۔ بعد میں ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور نواب زادہ نصراللہ نے بحالی جمہوریت کے لیے محنت شروع کر دی۔ تحریک بحالی جمہوریت کے نام سے پلیٹ فارم کی تشکیل بھی نواب زادہ نصراللہ خان کے ذہن کی پیداوار تھی۔ ضیاء الحق کے خلاف نواب زادہ نصراللہ نے جس استقامت کے ساتھ اس تحریک میں حصہ لیا' اس کو ملک کے سیاسی حلقوں نے بہت سراہا۔

بالآخر انھوں نے ایم آر ڈی کی رہنما محترمہ بے نظیر بھٹو پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ نواب زادہ نصراللہ نے بے نظیر کے پہلے دور اقتدار میں نہ شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور اپوزیشن کے رہنما کی حیثیت سے اپنا سیاسی کردار نبھاتے رہے۔ صدارتی انتخابات میں انھوں نے غلام اسحاق خان کا ساتھ دیا اور آہستہ آہستہ بے نظیر

سے بہت دور ہوتے گئے۔ ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت ختم کی گئی تو اس موقع پر ایک بار پھر انہوں نے اپوزیشن رہنما کا کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۳ء میں بے نظیر حکومت دوبارہ قائم ہوئی تو نواب زادہ نصراللہ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس میں شامل ہو گئے جبکہ ان کے صاحبزادے نواب زادہ منصور علی خان پنجاب میں صوبائی وزیر مال بن گئے۔ یہی وہ موقع تھا جب نوابزادہ اور ان کے بیٹے پر "مال بنانے" کے الزامات لگنے شروع ہوئے۔

نواب زادہ نصراللہ نواز شریف کی ناپختہ سیاست کی وجہ سے پنجاب میں میاں منظور وٹو کے قریب ہوتے گئے اور ان کے ساتھی کہنے لگے کہ نواب زادہ نصراللہ خان میاں منظور وٹو کی خاطر مرکز میں بے نظیر کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہی وہ خوف تھا جس کے باعث پیپلز پارٹی پنجاب میں وٹو کو برداشت کرتی رہی کہ کہیں نواب زادہ جیسے "کنگ میکر" ناراض نہ ہو جائیں۔ ۱۹۹۳ء کے بعد نواب زادہ نصراللہ خان پوری بساط کے ساتھ بے نظیر حکومت میں شامل ہو کر قواعد سمیٹنے لگے۔ ۱۹۹۳ء میں مسلم لیگ کے ایک دھڑے کی حکومت ختم کرانے کے بعد نصراللہ خان کنگ میکر سے خود کنگ بن گئے اور ان کی ہدایات پر بے نظیر بھی عمل کرتی رہیں۔

اسی دوران نواب زادہ نصراللہ نے پنجاب حکومت سے ایک پرمٹ مانگا۔ تاخیر کی وجہ سے ناراض ہو کر خان گڑھ چلے گئے۔ خان گڑھ روانگی سے قبل انہوں نے تاثر دیا کہ وہ حکومت سے شدید ناراض ہیں۔ سیاسی دانشوروں نے فوراً فال نکالی کہ ملک میں اب ایک اور سیاسی اتحاد بنے گا جس کی قیادت نواب زادہ نصراللہ خان کریں گے۔ اس تاثر کے ساتھ نواب زادہ نصراللہ خان کا ایک ناراض بیان اگلے روز کے اخبارات میں شائع ہو گیا۔ جب اس کی اطلاع وزیر اعظم ہاؤس پہنچی تو محترمہ بے نظیر نے پیپلز پارٹی کے ایک بزرگ رہنما کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ خان گڑھ جا کر معاملات کا جائزہ لیں اور ہر صورت میں نواب زادہ کو راضی کریں۔

پیپلز پارٹی کے اس رہنما نے جب انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ پرمٹ کے مطالبے کے ساتھ ساتھ نواب زادہ کی اسلام آباد والی رہائش گاہ کے ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر نہیں اور اس وجہ سے انہیں ناقابل برداشت گرمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ نواب زادہ کو اپنے مکان میں وفاقی وزیر کے پروٹوکول سے زیادہ ایئر کنڈیشنر درکار ہیں۔ ان کی یہ مانگ اسلام آباد کا عملہ پوری نہیں کر سکتا۔ وہ قواعد کے مطابق انھیں تین سے زیادہ ایئر کنڈیشنر نہیں دے سکتا۔

نواب زادہ نصراللہ سے متعلقہ شکایت سن کر وزیراعظم بے نظیر نے حکم دیا کہ فوری طور پر نواب زادہ کی رہائش گاہ پر اتنے ایئر کنڈیشنر لگا دیئے جائیں جتنے وہ کہتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنروں کی تعداد میں اضافہ کے بعد نواب زادہ نصراللہ خان گڑھ سے اسلام آباد چلے آئے۔

نواب زادہ نصراللہ خان کا خاندان پہلے ابرار فلور مل کا مالک تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مل بھی "شاندار" ترقی کرتی گئی۔ اس کے بعد کشمیر کمیٹی کے چیئرمین نواب زادہ نصراللہ خان نے "شاندار مل" کھلانے کے لیے ۱۵ کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کر لیا۔ ۶ کروڑ روپے میں لگنے والی مل کے لیے آسان شرائط پر ۱۵ کروڑ روپے کا قرضہ وی سی پی انداز میں منظور کیا گیا۔ نصراللہ کے قریبی عزیز ابرار خان کو جو نامساعد حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے تھے' بے نظیر حکومت نے نواب زادہ کی خواہش پر زرعی ترقیاتی بینک میں ڈائریکٹر بنا دیا۔ ابرار خان کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب نگران حکومت کے دوران حکومت کی طرف سے گندم کی نقل و حمل پر پابندی تھی اور فلور مل مالکان کو حکومتی عتاب کا سامنا تھا تو ابرار فلور مل اس دور میں بھی موج اڑاتی رہی اور اسے غیر محدود کوٹہ عطا کیا گیا۔ ابرار خان نے جن کی مل بند پڑی تھی' کروڑوں روپے کی گندم افغانستان کو سمگل کر دی۔

ایک روز محکمہ تعلیم کو وزیراعظم ہاؤس سے فون آیا کہ انھیں نواب زادہ نصراللہ خان فون کریں گے انھیں ناراض نہ کیا جائے۔ بعد ازاں نواب زادہ نصراللہ خان کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے حلقے کے ایک آدمی کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا ریذیڈنٹ ڈائریکٹر لگا دیا جائے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کہا یہ تو ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے پروفیسر کی سطح کی تعلیمی قابلیت کی ضرورت ہے جبکہ "سفارش یافتہ" کا تجربہ انتخابی مہم چلانے کا تو ہے پروفیسر کا نہیں۔ چنانچہ "کنگ میکر" کو "ناں"

کر دی گئی۔ جس پر سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک بار پھر متعلقہ حکام کو ایوان وزیراعظم سے فون آیا کہ "خان کو ناراض نہیں ہونا چاہیے" چنانچہ خان کی ناراضگی سے بچنے کے لیے اس محض کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مشاورت دے دی گئی۔

بے نظیر حکومت کے ساتھ ملک غلام مصطفی کھر کی ناراضگی کا ایک بڑا سبب نواب زادہ نصراللہ خان کو ملنے والا وی وی آئی پی پروٹوکول بھی تھا۔ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے ان کا رتبہ ملک غلام مصطفی کھر کے برابر تھا لیکن نواب زادہ نصراللہ خان کی سفارش پر وفاقی حکومت کی طرف سے ان کے علاقے میں کم و بیش ۲ ارب روپے کے منصوبے منظور کیے گئے جنہیں نواب زادہ کے خاندان کی شخصیات کی "زیر نگرانی" مکمل کرایا گیا۔ نواب زادہ نصراللہ خان کو نوکریوں کے معاملے میں بھی کھر پر فوقیت دی گئی۔ نواب زادہ نصراللہ خان کو وزیراعظم ہاؤس سے جاری ہونے والے کھلے تقرر نامے دیے گئے۔ اس کے علاوہ نواب زادہ کی فیملی میں شادی کے موقع پر سرکاری خرچ سے ریسٹ ہاؤس کی مرمت کی گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پوری قومی اسمبلی کا سالانہ خرچ ۹ کروڑ روپے تھا جبکہ نواب زادہ کی چھوٹی سی کشمیر کمیٹی کا سالانہ خرچ ۱۰ کروڑ سے زائد تھا۔

جون ۱۹۹۶ء میں نواب زادہ نصراللہ خان نے اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے لاہور میں ایک پیٹرول پمپ لگانے کی منظوری حاصل کی۔ نواب زادہ نے ترقیاتی کاموں کے لیے بھی بہت بڑی رقم حاصل کی لیکن یہ رقم بدقسمتی سے کہیں بھی استعمال نہ کی جا سکی اور بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد نواب زادہ نصراللہ رقم ڈکار گئے۔ نواب زادہ پر یہ مہربانیاں گورنر پنجاب راجہ سروپ خان نے کیں۔

نواب زادہ نصراللہ خان کے صاحبزادے صوبائی وزیر مال نواب زادہ منصور علی خان نے بھی صوبائی خزانے سے ایک نئی اور قیمتی ٹویوٹا کرولا کار حاصل کی۔ اس کے علاوہ نواب زادہ منصور علی خان نے مظفر گڑھ میں ۹۹ سالہ لیز پر ۵۰ کنال کا ایک قیمتی پلاٹ کوڑیوں کے مول حاصل کر لیا۔ نواب زادہ نصراللہ خان نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کو ایک مراسلہ ارسال کیا جس کا نمبر درج ذیل ہے:

کے سی ۱۹۵۵ / ۵ / ۱ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۹۵ء۔ اس مراسلہ میں تحریر تھا "سردار

بشیر احمد ساکن ۱۷ ایل ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن لاہور نے استدعا کی ہے کہ اسے علامہ اقبال میڈیکل کالج کے نزدیک کینال بینک لاہور پر پیٹرول پمپ لگانے کی منظوری دی جائے۔ اگر درخواست دہندہ کی استدعا پر ہمدردی سے غور فرمایا جائے تو کرم ہوگا"۔

مراسلہ موصول ہونے کے بعد سردار نکئی نے حکم دیا کہ ایک مہینے کے اندر اندر سردار بشیر احمد کو پیٹرول پمپ لگانے کی منظوری دی جائے۔ لہٰذا چند ہی دنوں میں سردار بشیر احمد کو ان کا دل پسند پلاٹ پیٹرول پمپ لگانے کے لیے مل گیا۔

حکومت پنجاب کی ایک دستاویز کے مطابق جب ترقیاتی فنڈز استعمال کرنے کی مدت ختم ہوگئی اور کوئی نیا منصوبہ زیر غور نہیں تھا تو گورنر نے مالی سال ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے ممبر قومی اسمبلی مظفر گڑھ نواب زادہ نصراللہ خان کی تیار کردہ سکیموں کے لیے ۵۰ لاکھ روپے کی فاضل رقم منظور کر دی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ رقم کی منظوری ۱۳ فروری ۱۹۹۶ء کو ملی یعنی مجوزہ سکیموں کی متعلقہ اتھارٹی سے منظوری یا تیاری یا دوسرے ضابطوں کی تکمیل سے بہت پہلے یہ منظوری دے دی گئی۔

نواب زادہ نصراللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے فرزند نواب زادہ منصور علی خان نے بھی وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی سے دو گاڑیاں حاصل کیں اور حتیٰ کہ اپنے ڈرائیور کی آسامی منظور کرنے کے لیے بھی وزیر اعلیٰ کی منظوری حاصل کی اور ۳ لاکھ روپے گاڑی کے پرزوں اور مرمت وغیرہ کی مد میں حاصل کر لیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۳۰۰ سی سی سنی کار کے علاوہ ایک ہزار سی سی سوزوکی بھی مانگی اور وزیر اعلیٰ سے ۱۲ لاکھ روپے کی منظوری حاصل کر لی۔

اتنی طویل "سیاسی جدوجہد" کا اصل "ثمر" نواب زادہ نصراللہ خان نے بے نظیر حکومت کے دوران موصول کیا اور پہلی بار ایک بدعنوان سیاست دان کے طور پر سامنے آسکے۔

مس ناہید خان

پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی واحد سیاسی جماعت ہے جس نے لاتعداد متنازعہ شخصیات کو جنم دیا ہے۔ یہ متنازعہ شخصیات نہ صرف پیپلز پارٹی کو اقتدار سے بہت دور لے گئیں بلکہ عوامی سطح پر ان شخصیات کے توسط سے پیپلز پارٹی کا جو تشخص ابھرا' پارٹی کو اس کی بہت بھاری قیمت اٹھانا پڑی۔

پیپلز پارٹی کے آخری دور حکومت ۹۳ تا ۹۶ء کا جائزہ لیا جائے تو اس دور کی متنازعہ شخصیات کے جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں اہم ترین نام بے نظیر کی سابق "مشیر اعظم" مس ناہید خان کا ہے۔ اگر آصف علی زرداری اور مس ناہید خان کا بدعنوانیوں کے حوالے سے تقابل کیا جائے تو بلاشبہ آصف علی زرداری کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے لیکن اگر پاکستان کی سیاسی بدعنوانیوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو مس ناہید خان کا نام خواتین سیاسی لیڈروں کی صف میں سب سے آگے نظر آتا ہے۔ آصف علی زرداری کی تمام کرپشن "ذاتی فیصلوں" سے پھوٹتی ہے اور اس میں ان کی بیوی محترمہ بے نظیر کا وجود کم نظر آتا ہے لیکن اگر مس ناہید خان کی بدعنوانیوں کو پرکھا جائے تو ناہید خان کی بدعنوانیاں براہ راست بے نظیر کی بدعنوانیاں محسوس ہوتی ہیں۔ کیونکہ آصف علی زرداری "باہم مشاورت" اور بیورو کریسی کے کارندوں کی "آشیرباد" سے کرپشن کرتے رہے لیکن مس ناہید خان کے لئے فوری "وسیلہ ہدایت" بے نظیر کی ذات تھی اور مس ناہید خان اپنی ہر بات بے نظیر سے منوانے کی صلاحیت

رکھتی تھیں۔

جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے مس ناہید خان کو اپنے سیکرٹریٹ میں گریڈ ۲۲ میں اپنی پولیٹیکل سیکرٹری مقرر کردیا تو مس ناہید خان کے توسط سے رونما ہونے والی بدعنوانیوں کے راستے مزید کھل گئے۔

ناہید خان وفاقی حکومت کے تمام معاملات میں "حرف آخر" تصور کی جانے لگیں اور مس ناہید خان کی مداخلت کا یہ عالم ہوگیا کہ وہ بے نظیر حکومت کے کٹھن مرحلوں میں خود لاہور اور کراچی پہنچ جاتیں اور بے نظیر کے لیے وفاداریوں کی خرید کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیتیں۔ پنجاب میں اس نوعیت کی مثالیں وٹو حکومت کے خاتمے اور نکئی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تیاریوں کے دوران ملتی ہیں۔

ناہید خان کی شخصیت اس وقت مزید کھل کر سامنے آگئی جب ناہید خان نے پنجاب میں بدعنوانیوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پیپلز پارٹی پنجاب میں ایک علیحدہ گروپ تشکیل دے دیا۔ ناہید خان نے سینئر وزیر مشتاق اعوان کے ساتھ مل کر یہ گروپ بنایا جو پنجاب میں وزارتیں بانٹا' کروڑوں روپے وصول کر کے مشیر بناتا اور مراعات بیچتا رہا۔ اس گروپ کو ابتدائی مخالفت کا سامنا اپنی ہی پارٹی کی طرف سے کرنا پڑا اور پی پی پی کے باقی ارکان اسمبلی نے اس گروپ کو "باجی گروپ" کا نام دیا۔ یہ گروپ وفاق اور پنجاب میں پوری طاقت کے ساتھ پیپلز پارٹی کے لیے وفاداریاں خریدتا اور بدلے میں ترقیاتی فنڈز کی مد میں سے کروڑوں روپے تھما دیتا۔ اس دوران مس ناہید خان کی شخصیت کا مکمل نقشہ سامنے آیا۔ مس ناہید خان جو اس سے پہلے صرف بے نظیر کی ذاتی "خدمت گار" کے طور پر جانی جاتی تھیں' الگ سے ایک "زوردار شخصیت" کے طور پر سامنے آئیں اور ناہید خان کی دسترس نہ صرف وفاداریوں خریدنے تک محدود رہی بلکہ کہا جاتا ہے کہ ناہید خان باقاعدہ کمیشن وصول کرنے لگیں۔ اس دوران ذرائع ابلاغ بے نظیر دور کی بدعنوانیوں کا حوالہ دیتے ہوئے ناہید خان کو آصف علی زرداری کے "شانہ بشانہ" قرار دینے لگے۔

ناہید خان کا پس منظر ایک معمولی سیاسی کارکن کا سا ہے۔ ناہید خان اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتی ہے تو اپنے پردادا کو افغانستان کے ایک علاقے کا سردار بتاتی

ہے۔ ناہید خان کا دادا تقریباً پچاس برس پہلے کابل سے پشاور آیا اور پشاور میں اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنا کر پاک افغان سرحد کے ذریعے تجارت کرنے لگا۔ ناہید خان کے بقول اس کے دادا نے پشاور میں تھوڑی سی زمین بھی خریدی۔

ناہید خان کے والد عبدالواحد خان نے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں بسے ایک درمیانے درجے کے خاندان میں شادی کی۔ عبدالواحد خان نے شادی کے بعد راولپنڈی کے علاقہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک گھر تعمیر کیا اور اس میں رہنا شروع کر دیا۔ ناہید خان نے اپنی ابتدائی تعلیم مری پبلک سکول میں حاصل کی۔ میٹرک وقار النساء پبلک سکول راولپنڈی سے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور پھر اسلام آباد سے بیالوجی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔

مس ناہید خان نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں پیپلز پارٹی سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔ ایم۔ ایس سی کے بعد ناہید خان نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد میں داخلہ لے لیا۔ انسٹی ٹیوٹ میں ناہید خان نے پی ایس ایف (PSF) کے پلیٹ فارم سے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ادارے کے ذمہ داروں نے ناہید خان کو سیاسی سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ناہید خان نے سیاست جاری رکھی۔ آخرکار ناہید خان کے وجود کو ادارے میں ایک سیاسی اور ضیاء الحق مخالف وجود قرار دیا گیا اور کچھ عرصہ بعد پی پی پی کے ایک اور باغی اقتدار علی شاہ سمیت انسٹی ٹیوٹ سے نکال دیا گیا۔

ناہید خان نے باقاعدگی کے ساتھ پیپلز پارٹی کے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۸۱ء میں ناہید خان کے نوعمر بھائی کو پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے کی سازش میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے بعد ناہید خان کا خاندان بھی پی پی پی میں شامل ہو گیا۔ ناہید خان نے پی پی پی کے مفرور کارکنوں کو اپنے گھر میں پناہ دینا شروع کر دی اور یوں اس کی مکمل ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ منسلک ہو کر رہ گئیں۔ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں نے ناہید خان کا کھوج لگانا شروع کیا اور ناہید خان کے گھر کی زبردست نگرانی شروع کر دی گئی۔ اس دوران ناہید خان راولپنڈی سے سندھ چلی گئی اور پیپلز پارٹی کی زیر زمین کارروائیوں میں شامل ہو گئی۔

ناہید خان نے کراچی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں پناہ حاصل کی اور ایک ٹریول ایجنسی میں ملازمت شروع کر دی۔ اس ملازمت کے دوران ناہید خان پر بدعنوانی کا پہلا الزام لگایا گیا۔ ٹریول ایجنسی کے حوالے سے ناہید خان پر الزام لگایا گیا کہ اس بیرون ملک جانے کے خواہش مند لوگوں سے ۸۲۰۰۰ ہزار روپیہ وصول کیا اور غائب ہو گئی۔ ناہید خان کے خلاف کراچی پولیس نے دھوکہ دہی کے الزام کے تحت مقدمہ درج کر لیا اور روپوش ناہید خان کو راولپنڈی تک تلاش کیا گیا لیکن یہ تلاش بے سود رہی کیونکہ ناہید اس عرصہ میں ملک چھوڑ کر لندن جا بسی تھی۔

ناہید خان نے وائی ایم سی اے (YMCA) لندن میں ایک کمرہ حاصل کیا اور پاکستانی سفارت خانے کے سامنے پیپلز پارٹی کے احتجاجی مظاہروں میں شرکت کرنے لگی۔ اس دوران ناہید خان نے لندن میں رہائش پذیر ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ جنوری ۱۹۸۴ء میں مس ناہید خان لندن میں جام صادق علی کے گھر بے نظیر سے ملی۔ اگلے دن پھر ناہید خان جام صادق علی کے گھر پہنچ گئی اور بے نظیر سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے پاس کام کرنے کی اجازت دے دیں۔ بے نظیر نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی اور مس ناہید خان بے نظیر کے ساتھ کام کرنے لگی۔ اس دوران ناہید خان نے برطانیہ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دائر کر دی۔

ناہید خان کی سیاسی پناہ کا کیس برطانوی عدالت میں زیر سماعت تھا کہ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء تک ناہید خان نے بشیر ریاض اور صفدر ہمدانی کے ساتھ مل کر بے نظیر بھٹو کی لندن والی رہائش گاہ کے ایک کمرے سے رسالہ "عمل" شائع کرنا شروع کر دیا۔ یہ رسالہ بیرون ملک پیپلز پارٹی کا ترجمان کہلانے کا دعویدار تھا۔ اسی دوران حکومت برطانیہ نے مس ناہید خان کو سیاسی پناہ دے دی۔ ناہید خان بے نظیر کے قریب ہوتی گئی اور ایک دن وہ بے نظیر کی پرسنل سیکرٹری بن گئی۔

۱۹۸۶ء میں بے نظیر پاکستان لوٹ آئیں تو ناہید خان بھی بے نظیر کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ شروع میں ناہید خان نے لاڑکانہ میں بے نظیر بھٹو کے گھر میں رہائش اختیار کی لیکن بعد میں جب بے نظیر بھٹو کراچی منتقل ہو گئیں تو ناہید خان نے کراچی

میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لیا اور رہنے لگی۔ اس دوران ناہید خان بے نظیر کے ساتھ جلسے جلوسوں میں شرکت کرتی رہی۔ بے نظیر بھٹو جب ۸۸ء میں پہلی بار وزیراعظم پاکستان بنیں تو ناہید خان بے نظیر کی پولیٹیکل سیکرٹری نامزد ہوئی۔ یہ ناہید خان کے دوسرے سفر کا آغاز تھا۔

اس موڑ سے ناہید خان کی "مالی آسودگی" کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ناہید خان حکومتی حلقوں میں طاقتور ترین کا درجہ رکھتی تھی۔ ناہید خان نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ناہید خان کے بقول اس کے والد اس کی شادی ایک افغان رشتہ دار کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا موقف تھا کہ وہ وہاں شادی کرے گی جہاں اس کی والدہ چاہے گی۔ والد اور والدہ کی اس کشمکش میں کئی برس بیت گئے لیکن ناہید خان کی شادی کے بارے میں فیصلہ نہ ہو سکا۔

ناہید خان نے بے نظیر کی پہلی حکومت میں وفاقی وزیر تعلیم شہناز وزیر علی کے ساتھ روابط بڑھائے اور دونوں خواتین بے نظیر کے قریب رہتے ہوئے پارٹی کی بہبود کے لیے حکومتی وسائل کو بروئے کار لانے لگیں۔ ناہید خان پر پہلا الزام یہ لگایا گیا کہ اس نے شہناز وزیر علی کے ساتھ مل کر "پیپلز ورکس پروگرام" کے فنڈز کی تقسیم میں وسیع پیمانے پر بدعنوانیاں کیں۔ صرف راولپنڈی، لاہور، گوجرانوالہ اور سرگودھا ڈویژن سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں میں "سیاسی امداد" کے طور پر ۶ کروڑ روپے کی سلائی مشینیں اور سائیکلیں اور ترقیاتی رقوم بانٹ دیں۔ اسی طرح ناہید خان پر الزام لگایا گیا کہ اس نے پنجاب اور سندھ میں جیالوں میں ترقیاتی فنڈز کی رقوم بڑی بے دردی کے ساتھ تقسیم کر دیں۔ ناہید خان نے سیاسی کارکنوں کو خوش کرنے کے لیے بھرتیوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور ان ناراض ارکان صوبائی و قومی اسمبلی کو نوازنے لگیں جنہیں وزارت یا مشیر کا منصب نہیں مل سکا تھا۔ پہلی حکومت کے دوران مس ناہید خان کی شخصیت قدرے غیر متنازعہ رہی اور جو الزامات اپوزیشن جماعتوں نے عاید کیے صرف انہی کو ذرائع ابلاغ میں جگہ ملی جبکہ مس ناہید خان کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہ لائے جا سکے۔

بے نظیر کی پہلی حکومت کے دوران مس ناہید خان ایک درمیانے درجے کی

سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک کے طور پر جانی جاتیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد دارالحکومت میں ناہید خان کے دفتر کا رخ کرتی کیونکہ انہیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ مس ناہید خان کا براہ راست تعلق وزیراعظم بے نظیر کے ساتھ ہے اور اگر وہ چاہیں تو کوئی بھی کام آسانی سے کرایا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۳ء میں جب ایک بار پھر محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیراعظم نامزد ہوئیں تو مس ناہید خان پہلے سے زیادہ متحرک کردار کے طور پر سامنے آئی۔ نومنتخب وزیراعظم بے نظیر کی طرف سے ناہید خان کو بدعنوانی کی پہلی باقاعدہ ذمہ داری اس وقت سونپی گئی جب ۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو وفاقی کابینہ نے اپنے ایک اہم اجلاس میں فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ۱۰ کروڑ روپے سے "پیپلز ورکس پروگرام" کو دوبارہ شروع کیا جائے۔ مرکز میں لوکل گورنمنٹ کا وزیر نہ ہونے کی وجہ سے وزیراعظم بے نظیر نے اپنی پولیٹیکل سیکرٹری مس ناہید خان کو ذمہ داری سونپی کہ وہ "سوشل ایکشن پروگرام" کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کریں۔

ناہید خان کو ترقیاتی فنڈز تقسیم کرنے کی ذمہ داری اس لیے سونپی گئی تاکہ مس ناہید خان پیپلز پارٹی کے لیے وفاداریاں خرید سکیں اور ایسے کارکنوں کو اپنے قابو میں رکھ سکیں جو پیپلز پارٹی سے بدظن ہو کر مسلم لیگ (ن) کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ اس دوران خصوصی طور پر ناہید خان کو ہدایت کی گئی کہ وہ مرکز اور پنجاب میں پیپلز پارٹی کی اتحادی جماعت مسلم لیگ (ج) کے ارکان اسمبلی کو "خوش" رکھیں۔ تاکہ اپوزیشن ان کے لیے کشش کا باعث نہ بن سکے۔

ناہید خان نے "سوشل ایکشن پروگرام" کے لیے منصوبہ بندی شروع کی اور سب سے پہلے سوشل ایکشن پروگرام کو ضلعی سطح پر سنبھالنے کے لیے "سوشل ایکشن بورڈز" کی تشکیل کی۔ ناہید خان نے ایسے افراد کے نام بے نظیر کو سوشل ایکشن بورڈز کے چیئرمین کے لیے پیش کیے جن کی اس سے پہلے کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی۔ ان میں ان لوگوں کی بھی اکثریت تھی جو یا تو قومی اسمبلی یا پھر صوبائی اسمبلی کے رکن تھے اور ان کو نہ تو کوئی وزارت مل سکی تھی اور نہ ہی اس طرح کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔ جن اضلاع میں پیپلز پارٹی کا کوئی بھی رکن اسمبلی نہیں تھا' وہاں ایسے افراد کو سوشل

ایکشن بورڈ کا چیئرمین بنا دیا گیا جو سیاسی لحاظ سے تقریباً گمنام تھا۔ البتہ ان اضلاع میں ناہید خان مکمل طور پر ناکام رہیں جہاں پیپلز پارٹی کا تو کوئی فرد رکن اسمبلی نہیں بن سکا تھا لیکن اتحادی جماعت مسلم لیگ (ج) کا رکن اسمبلی موجود تھا۔

سوشل ایکشن پروگرام کے تحت صرف پنجاب میں ۳۳ کروڑ روپے کے ترقیاتی اخراجات سالانہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ مس ناہید خان کی کوششوں سے پہلی بار ایسا ہوا کہ پورے ملک میں سوشل ایکشن بورڈز کے چیئرمینوں کو لینڈ کروزر گاڑیاں فراہم کی گئیں۔ مثال کے طور پر صرف پنجاب میں سوشل ایکشن بورڈز کے چیئرمین ۴۰ لاکھ روپے صرف ان گاڑیوں کے تیل اور مرمت وغیرہ پر خرچ کر دیتے۔ مس ناہید خان پر الزام لگایا گیا کہ اس نے سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمینوں سے فی کس ۵۰ لاکھ روپے کمیشن وصول کیا اور ترقیاتی فنڈز کے "ذاتی استعمال" کی کھلی چھٹی دے دی۔

ترقیاتی فنڈز کے نام پر تقسیم ہونے والی اس رقم کا اصل محرک صرف پی پی پی کے ساتھ مضبوط وابستگی اور وفاداریاں تھیں۔ صرف ایک سال ۱۹۹۴ء کے لیے صوبوں کو جو ترقیاتی فنڈز جاری کیے گئے ان کی مثال نہیں ملتی۔ سندھ کو ایک سال کے لیے ۷ ارب ۷ کروڑ ۵۷ لاکھ روپے' پنجاب کو ۴ ارب اور ۳ کروڑ روپے' بلوچستان کو ایک ارب ۲ کروڑ روپے اور سرحد کو ایک ارب ۹۱ کروڑ روپے کے ترقیاتی فنڈز دیے گئے۔ واضح رہے کہ اس رقم میں وزیراعظم کی پولیٹیکل سیکرٹری مس ناہید خان نے کروڑوں روپے بطور کمیشن حاصل کر لیے۔ ناہید خان نے سینکڑوں جیالوں کو سوشل ایکشن بورڈز میں ملازمت دلوا دی۔ صرف پنجاب میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ ان ملازموں کی تنخواہ اور دیگر مراعات کی مد میں ادا کیا جاتا رہا جبکہ ۶۰ فیصد جگہوں پر کوئی ترقیاتی کام سرے سے ہوا ہی نہیں بلکہ میاں نواز شریف دور کے ترقیاتی منصوبے "تعمیر وطن پروگرام" کے تقریباً زیر تکمیل اور ادھورے منصوبوں کو آخری ٹچ دے کر ان پر سوشل ایکشن پروگرام کی تختیاں لگا دی گئیں۔ یہی حال "میرے گاؤں میں بجلی آئی ہے" نام کے پراجیکٹ میں ہوا۔ یہ بھی مس ناہید کی صوابدید پر تھا اور ناہید خان نے بھاری کمیشن وصول کر کے ارکان اسمبلی کو کوٹے فراہم کیے۔

اسی طرح ۸ جنوری ۱۹۹۴ء کو مس ناہید خان' جہانگیر بدر' این ڈی خان اور سلمان تاثیر نے طویل ملاقات کے بعد وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو قائل کر لیا کہ وہ وفاقی کابینہ کے اجلاس میں وفاقی وزیر داخلہ کے اعلان کردہ "بے روزگاری الاؤنس" کی نوعیت کو تبدیل کر دیں کیونکہ اس "بے روزگاری الاؤنس" سے پی پی پی کے مخلص نوجوانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ واضح رہے کہ اقتدار سنبھالتے ہی وزیراعظم نے اعلان کیا تھا کہ حکومت بے روزگار نوجوانوں کو بے روزگاری الاؤنس فراہم کرے گی جبکہ کچھ عرصہ بعد وفاقی وزیر داخلہ نصیراللہ بابر نے خود اعلان کیا تھا کہ تقریباً ۱۲۰۰ روپیہ فی کس کے حساب سے گریجوایٹ نوجوانوں کو "بے روزگاری الاؤنس" فراہم کیا جائے گا۔ مس ناہید خان نے خصوصی طور پر محترمہ بے نظیر بھٹو کو مجبور کیا کہ وہ "بے روزگاری الاؤنس" کے لیے مختص کی گئی رقم (ایک ارب روپیہ) یوتھ انوسٹمنٹ پرموشن سوسائٹی کے ذریعے پی پی پی کے نوجوانوں میں قرضوں کے ذریعے تقسیم کروا دیں۔ وفاقی کابینہ نے اس فیصلہ کو خاموشی کے ساتھ تسلیم کر لیا اور تقریباً آٹھ ماہ کے عرصے میں ایک ارب روپے کی یہ رقم دو لاکھ روپے کے انفرادی اور ۲۰ لاکھ روپے کے اجتماعی قرضوں کی شکل میں بانٹ دی گئی۔ اس دوران جو سب سے حیران کن بات روا رکھی گئی وہ یہ تھی کہ وفاقی حکومت کی طرف سے قرضہ حاصل کرنے والوں کے لیے شروع دن سے عائد جائیداد کے ثبوت اور ٹھوس ضمانتوں کی پابندی ایک سال کے لیے ختم کر دی گئی۔ یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا کہ ارکان قومی اسمبلی اور سینٹ کے ممبران کے دستخطوں سے قرضے جاری کر دیئے گئے۔ صرف ۹۴ء کے سال میں اڑھائی ارب روپیہ وصول کیا گیا۔

اس دوران ذرائع نے الزام لگایا کہ قرضہ حاصل کرنے والوں نے ۲۵ اور ۳۰ فیصد رقم بطور کمیشن ادا کر کے وہ قرضے چند دنوں میں حاصل کر لیے جن کے حصول کے لیے مہینوں چکر کاٹنا پڑتے تھے۔ قرضہ حاصل کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد بیرون ملک چلی گئی اور قرضوں کی واپسی کی شرح ۸۳ فیصد سے گر کر ۶۸ فیصد رہ گئی۔ اس سارے کھیل میں بھی اصل کمال وزیراعظم کی پولیٹیکل سیکرٹری مس ناہید خان کا تھا جو اس سارے منصوبے کی محرک تھیں اور پھر اس کو وفاقی کابینہ سے منظور کرانے میں

کامیاب رہیں۔

مس ناہید دسمبر ۱۹۹۵ء میں ایک بار پھر موضوع بحث بن گئیں جب پنجاب میں پیپلز پارٹی کے ۱۷ ارکان اسمبلی نے بدعنوانیوں اور وزارتوں کی غلط تقسیم پر بغاوت کر دی۔ ذرائع کے مطابق اس بغاوت کے خالق صدر فاروق احمد خان لغاری کو قرار دیا۔ یہ بغاوت اس وقت بہت زیادہ زور پکڑ گئی جب پنجاب کی کابینہ میں توسیع کی جا رہی تھی۔ صوبائی کابینہ میں شمولیت کا اولین معیار "پارٹی فنڈ" کے نام سے طے شدہ مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر مس ناہید خان' جہانگیر بدر اور سید فیصل صالح حیات لاہور میں براجمان رہے۔ مس ناہید خان کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ وہ جس کو جب چاہیں وزارت سونپ سکتی ہیں۔ مس ناہید خان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے کروڑوں روپے میں صوبائی وزارتیں فروخت کی ہیں۔ کئی ارکان اسمبلی نے اس موقع پر برملا کہا کہ انھیں بھاری رقم کی ادائگی کے باوجود وزارت نہ مل سکی۔ پی پی پی کے ایک سابق صوبائی وزیر نے "اچھی وزارت" کے حصول کے لیے مس ناہید خان کو تین کروڑ روپیہ "پارٹی فنڈ" کے نام پر دیا لیکن موصوف پھر بھی "اچھی وزارت" حاصل کرنے سے محروم رہے۔ بعد میں اس گروپ میں ناہید خان کے ساتھ پنجاب کے سینئر صوبائی وزیر ملک مشتاق اعوان بھی شامل ہوگئے اور باغی ارکان اسمبلی نے اس گروپ کو "باجی گروپ" کا نام دیا۔ پنجاب میں مس ناہید خان کی مداخلت کا یہ عالم تھا کہ پی ڈی ایف کے کسی کارکن کے سخت بیان پر بھی ناہید خان اسلام آباد سے لاہور پہنچ جاتیں۔

مس ناہید خان کا منافع بخش سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ۹۱ کے دوسرے ہفتہ میں پہلی بار یہ دیکھنے میں آیا کہ مرد اول آصف علی زرداری اور مشیر اعظم ناہید خان کی مشترکہ کاوش سے لاہور اور کراچی کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے مالک مسٹر بہرام آواری کو شراب کا کارخانہ لگانے کی اجازت دے دی۔ اس اقدام سے چند روز پہلے ۱۷ جنوری کو مری بروری کارخانے پر درجنوں پولیس والوں نے بلہ بول دیا اور مری بروری کے ساڑھے تین سو کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ اس سارے واقعے کی اصل وجہ مری بروری کے مالک مسٹر بھنڈاری کی وہ بڑی غلطی تھی جو اس نے مس ناہید خان

اور آصف علی زرداری کو "بھتہ" نہ پہنچا کر کی تھی۔ ذرائع کے مطابق مسٹر آصف علی زرداری اور مس ناہید خان نے مسٹر بہرام آواری سے مری بروری بند کرانے کے عوض ۳۰ کروڑ روپیہ وصول کر لیا تھا۔ اس دوران مری بروری کو ۱۵ کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مری بروری کی اس غیر قانونی بندش کو عدالت نے غلط قرار دیا۔ تب جا کر کہیں معاملہ ٹھنڈا پڑا لیکن اس دوران مرد اول اور مس ناہید خان اپنا کام کر چکے تھے۔

مس ناہید خان ایک بار پھر منظر عام پر آ گئیں جب منظور وٹو کیس کے عدالتی فیصلے سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے پنجاب میں وفاداریاں خریدنے کے لیے میدان لگ گیا۔ مس ناہید خان آصف علی زرداری کے ہمراہ لاہور پہنچ گئیں اور حکومتی خزانے کا منہ کھول دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے مس ناہید خان کو یہ ذمہ داری سونپ رکھی تھی کہ وہ ہر قیمت پر صوبائی ارکان اسمبلی کو اپنی طرف لائیں چاہے اس کے لیے بہت بھاری قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ مس ناہید خان کو اس سلسلے میں ملک مشتاق اعوان کی معاونت بھی حاصل تھی۔ مس ناہید خان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس دوران ۲۰ کروڑ روپیہ ارکان اسمبلی میں بانٹ دیا جنہوں نے وٹو کی بحالی کی صورت میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنا ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

مس ناہید خان کی پنجاب میں ہر طرح کی مداخلت یہ رخ اختیار کر گئی کہ انہوں نے سینئر صوبائی وزیر ملک مشتاق اعوان سے مل کر صوبے کے تعلیمی اداروں پر پی ایس ایف کے قبضے کی مہم کو آخری شکل دی۔ ناہید خان اور مشتاق اعوان کی کوششوں سے پی ایس ایف کے نام پر غنڈہ عناصر لاہور، رائے ونڈ، راولپنڈی، سیالکوٹ اور شاہدرہ وغیرہ کے تعلیمی اداروں پر قابض ہو گئے اور خرچ چلانے کے لیے ڈکیتی، راہزنی اور بھتہ وصول کرنے جیسی وارداتیں کرنے لگے۔ اسی دوران مس ناہید خان نے ۳۵ ہزار لیڈی انگلش ٹیچر کی آسامیوں کی طرف دھیان دیا اور اپنے وفادار حواریوں میں اسامیاں بانٹ دیں۔ مس ناہید خان پر الزم لگایا گیا کہ انہوں نے ۲۰ ہزار آسامیاں خود فروخت کیں اور کروڑوں روپے کمیشن وصول کیا۔ واضح رہے کہ ان بھرتیوں کے دوران مس ناہید خان کے ایک خصوصی "لیٹر پیڈ" پر اجازت نامہ

ملازمت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح مس ناہید خان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے آئی بی میں انسپکٹروں اور دیگر افسروں کی بھرتیوں میں کروڑوں روپے وصول کیے ہیں۔ اسی طرح مس ناہید خان پر یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے انکم ٹیکس میں انسپکٹروں کی بھرتیوں کے دوران بھی رشوت وصول کی اور پی پی پی کے جیالوں کو انکم ٹیکس میں بھرتی کرا دیا۔ اس کے علاوہ کسٹمز میں مس ناہید خان کی مداخلت کے نشان ملتے ہیں۔ پاکستان کسٹمز میں ناہید خان اور آصف علی زرداری کی خواہش پر سینکڑوں افراد کو بھرتی کر لیا گیا۔

یہی صورت حال ملکی بینکوں کی رہی جن میں درجنوں افراد مس ناہید خان کی ہدایت پر بھرتی کیے گئے۔ پی آئی اے بھی ناہید خان کی مکمل دسترس میں رہی اور بے شمار جیالوں کو اعلیٰ نوکریوں پر رکھا گیا۔ مس ناہید خان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ملک مشتاق اعوان کے ساتھ مل کر نیویارک میں ایک قیمتی ہوٹل خریدا ہے جس کی کبھی ناہید خان نے تردید نہیں کی۔ البتہ ناہید خان ایک ایسا کردار ہیں جو پی پی پی کے دونوں ادوار حکومت میں مکمل طور پر مستفید ہوا۔

نواز شریف

میاں محمد نواز شریف کی پیدائش دسمبر ۱۹۴۸ء میں لاہور میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام میاں محمد شریف ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ میاں نواز شریف کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے صنعتی کاروبار سے وابستہ ہوگئے۔ اتفاق گروپ کی متعدد کمپنیوں کے ڈائریکٹر رہے۔

"اتفاق اسلامک اکاڈمی" کے نام سے تعلیمی ادارہ بنایا جس کا ڈاکٹر طاہر القادری کو سربراہ بنایا۔ ماڈل ٹاؤن میں اپنی رہائش گاہ کے قریب ایک ہسپتال بنایا جس کا نام "اتفاق ہسپتال" رکھا۔ میاں نواز شریف ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں لاہور سے قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

جونیجو حکومت کے خاتمے پر میاں نواز شریف کو پنجاب کا نگران وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد ایک بار پھر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔

۱۹۹۰ کے انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف نے وزیر اعظم پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو صدر غلام اسحاق خاں نے اسمبلی توڑ دی اور میاں نواز شریف کی حکومت برخاست ہوگئی۔ جولائی ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف کو

اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھنا پڑا۔ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو ہونے والے عام انتخابات میں میاں نواز شریف کو دو تہائی اکثریت حاصل ہوئی اور وہ وزیراعظم پاکستان بن گئے۔

یوں تو سیاسی اقربا پروری ہماری قومی تاریخ کے ہر لمحے کی افسوس ناک کہانی ہے مگر مزاج شناسی اور مزاج شاہی کی جتنی داستانیں میاں نواز شریف کے انداز حکمرانی سے وابستہ ہیں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ قومی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جسے انہوں نے کسی نہ کسی انداز میں کرپٹ کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

میاں نواز شریف امرتسر سے آنے والے کشمیری گھرانے میں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میاں محمد شریف ٹین کے ڈبے بنانے کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو اکٹھا رکھ کر ایک ہندو کی چھوڑی ہوئی لوہے کی بھٹی الاٹ کروا لی اور پورا خاندان محنت کرتا رہا۔ میاں محمد شریف بھی دوسرے کاروباری لوگوں کی طرح ہمیشہ غیروابستگی کی سیاست کرتے رہے۔ نواز شریف کی فیملی پہلی بار ۶۰ کی دہائی کے آخر کے سیاسی ابھار میں سیاست سے متاثر ہوئی۔ نواز شریف اور شہباز شریف ۷۰ کی دہائی میں ترقی پسند نوجوانوں میں اٹھتے بیٹھتے رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی نیشنلائزیشن سے اتفاق گروپ بھی متاثر ہوا۔ اس پر شریف فیملی نے کھل کر سیاست کرنے کا فیصلہ کیا اور میاں نواز شریف باقاعدہ طور پر ۱۹۷۷ء میں تحریک استقلال میں شامل ہوگئے۔ جب نواز شریف فیملی کی صنعت قومیائی گئی تو ان کی فیملی متحدہ عرب امارات شفٹ ہوگئی اور وہاں پر تجارت کرنے لگے۔ ان کے چھوٹے بھائیوں نے والد صاحب سے تجارت اور کاروبار کے گر خوب سیکھے۔

اسی دوران ان لوگوں کے متحدہ عرب امارات کے شیخ خاندان سے اچھے مراسم پیدا ہوگئے۔ شیخ زید کی سفارش پر جون ۱۹۷۹ء میں ضیاء الحق نے اتفاق فاؤنڈری واپس شریف فیملی کی تحویل میں دے دی۔ اتفاق فاؤنڈری کی واپسی اور شیخ زید کی سفارش پر میاں فیملی کے تعلقات اس وقت کے گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی اور ضیاء الحق سے استوار ہوگئے۔ گورنر پنجاب سے تعلقات کی استواری اور گہرائی میں سب سے اہم کردار نوجوان شہباز شریف نے ادا کیا۔ مارشلائی حکمرانوں سے قائم ہونے والے تعلقات کی وجہ سے اتفاق گروپ دن دگنی، رات چوگنی ترقی اور نئی نئی ملوں کو

جنم دینے لگا۔ اتفاق گروپ نے اپنی واگزاری کے بعد پہلا بچہ ۱۹۸۲ء میں اتفاق شوگر ملز کی صورت میں دیا۔

اسی دوران میاں نواز شریف کو صوبائی وزارت خزانہ کا قلمدان سونپا گیا۔ وزیر خزانہ بننے سے لے کر اپنی پہلی وزارت عظمٰی کی برطرفی تک کے دس برسوں میں اقتدار کے فیضان سے اتفاق گروپ نے میاں شریف کی ۳۵ سالہ محنت شاقہ سے تمیں گناہ سے زیادہ ترقی کی جو دنیا میں بذات خود ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ یہ ساری ترقی ڈیوٹیوں اور ٹیکسوں کے ہیر پھیر اور سرکاری ٹھیکوں میں لوہا سپلائی کر کے کی گئی۔ دوسری طرف تمام بینکوں کے دفاتر اتفاق گروپ پر نوازشات کرنے پر آمادہ بیٹھے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں میاں نواز شریف کے صنعتی گروپ کے ذمے صرف ۴ کروڑ کے قرضے واجب الادا تھے جبکہ دس سال بعد وہ بینکوں سے بارہ ہزار ملین روپے قرضے لے چکے تھے۔ جبکہ ایوان اقتدار سے محروم لوگوں کو ایک لاکھ روپے کا قرضہ بھی جان لیوا کوشش کے بعد ۱۸ فیصد سود پر ملتا ہے۔ مگر ان "مغل شہزادوں" کی پرورش کے لیے اسی زمانے میں ۱۸ کروڑ روپے معاف اور قرض پر شرح سود صرف ایک فیصد تھی۔

ایسا کیوں نہ ہوتا ایک ابھرتا ہوا سیاست دان جو بھی وزیر خزانہ اور کاروبار بھی نہ چمکا سکے۔ جب میاں صاحب وزیر خزانہ سے ترقی کر کے وزیر اعلٰی پنجاب بنائے گئے تو س وقت پنجاب مالی طور پر مضبوط صوبہ تھا اور اس کے ریونیو وسائل نہ صرف اضافی تھے بلکہ وفاق کے ساتھ بہتر معاشی رشتوں میں منسلک بھی تھا۔ میاں نواز شریف نے جلد ہی پنجاب کی بہتر اقتصادی صورت حال پر ہاتھ صاف کیا۔ میاں صاحب نے اپنے متعینہ فنڈز جن میں ایک لاکھ روپیہ صوابدیدی فنڈ کا تھا' کے بجائے ۲۷ ملین روپے "شاہ" کی نذر کیے جس کی وجہ سے مستحکم معاشی صوبہ ۵۰۰ کروڑ روپے کے خسارے کا شکار ہوگیا۔ ان شاہ خرچیوں کی ایک چھوٹی سی مثال حکومتی پارٹی کے ایم پی اے چودھری عبدالوکیل سکینڈل ہے۔ چودھری عبدالوکیل کو ۲۵ ملین روپے ۳ سال ایڈوانس کے طور پر ادا کر دیے گئے اور ضمانت گندم کی ہونے یا نہ ہونے والی فصل رکھی گئی تھی۔ ۱۹۸۶ء میں آڈیٹر جنرل کی پنجاب سے متعلق سالانہ رپورٹ پیش کی جس میں نشاندہی کی گئی کہ ۱۲۰ کروڑ روپے بدعنوانیوں کی نذر ہوئے۔ جب پنجاب کا

خزانہ سکڑنے لگا تو میاں نواز شریف نے ریڈکو اور غشا گروپ کی سیاسی سرمایہ کار کے طور پر سرپرستی شروع کر دی اور مری تک جاری سڑک کی تعمیر روک کر ریڈکو کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔ اور اس طرح اتفاق گروپ ۲۱۵ فیصد کے حساب سے ترقی کرتا ہوا رائے ونڈ کے قریب انڈسٹرل اسٹیٹ کا مالک بن گیا اور اس کا دائرہ ملکیت بڑھتا بڑھتا ۴۰ کے قریب صنعتی اداروں پر پھیل گیا۔ میاں صاحب کے دور حکمرانی میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے کرپٹ افسروں کو بھلا پھسلا کر چند گھنٹوں میں ایسے ایس آر او Order Statutory Regulative جاری کروائے گئے جس کی وجہ سے کروڑوں کا منافع میاں نواز شریف کی جھولی میں آن گرا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو میاں نواز شریف کے سر سے سیاسی سرپرست کا سایہ اٹھ گیا تو شریف فیملی ایک دم پریشان ہو گئی اور میاں صاحب نے سیاست سے علیحدگی کا سوچنا شروع کر دیا' مگر حکمران گروہوں اور اداروں میں پائے جانے والے اختلافات نے ایک بار پھر میاں نواز شریف کے نصیب چمکائے اور آئی ایس آئی کے زیر سرپرستی بننے والے انتخابی اتحاد آئی جے آئی (بروزن آئی ایس آئی) کی قیادت میاں نواز شریف کے ذمے لگی۔

۱۹۸۸ کے انتخابات میں آئی جے آئی کی پنجاب میں حکومت بنی تو میاں صاحب پھر وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ اسی عہد میں میاں صاحب نے کرپشن کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سب سے بڑا سکینڈل کواپریٹو اور فنانس اداروں کا تھا جس میں غریب اور نادار یتیم بچوں' بیوگان اور ریٹائرڈ ملازمین کے ۱۷ ارب روپے ڈوب گئے۔ ان کواپریٹو اور فنانس اداروں کے مالکان اور ڈائریکٹر صاحبان میں سے اکثریت کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر میاں نواز شریف فیملی سے جا ملتا ہے۔ میاں نواز شریف کے انتہائی قریبی ساتھی گجرات کے چودھریوں کا سب سے بڑا شیئر اس لوٹ مار میں تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت کی کواپریٹو رجسٹرار سروش سلطان میاں صاحب کی کابینہ کے سب سے بااثر وزیر سردار نصراللہ دریشک کی بیوی تھیں۔ لہٰذا کواپریٹو لوٹنے والے لٹیروں کو بہت آسانی رہی۔

میاں صاحب کے برادر خورد میاں شہباز شریف نے مالیاتی اداروں کی خرد برد

کی تحقیقات نہ ہونے دیں۔ اسی زمانے میں لوگوں نے میاں شہباز شریف کو مسٹر ۹۰ پرسنٹ اور باب کینڈی کا خطاب دیا۔ انہوں نے مبینہ طور پر ۲۵ ملین روپے کا چیک وصول کر کے ان لٹیروں کو آئی جے آئی کی سیاسی چھتری تلے پناہ دے دی۔ اس سکینڈل کے بعد بننے والے لون کمیشن نے دو تین صفحات کی رپورٹ جاری کر کے میاں نواز شریف اور چودھری شجاعت حسین کو سرکاری پیکیج کا غسل دے کر فارغ کر دیا۔ مگر بعد میں میاں زاہد سرفراز نے پنجاب بینک کے چیکوں کے ثبوت پیش کر کے اس راز کو فاش کر دیا۔ میاں زاہد کی تفصیلات کے مطابق میاں نواز شریف نے ملکی خزانے کو ایک ارب روپے کا نقصان پہنچایا۔ انہوں نے ۸۳ کروڑ روپے ناجائز طور پر خرچ کیے اور اپنے زرعی فارم اور صنعتی کمپلیکس کے لیے رائے ونڈ میں ۵ کروڑ روپے خرچ کر کے سڑکیں بنوائیں جبکہ حکومت پنجاب کے احتجاج کے باوجود ۵۰ کروڑ روپے دیگر کاموں میں خرچ کر دیئے۔

انہوں نے بتایا کہ میاں نواز شریف نے ۱۵ ہزار روپے سے مسلم کمرشل بینک میں اکاؤنٹ کھولا اور اس کے اگلے ہی دن ۱۵ کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کر لیا۔ زاہد سرفراز کے مطابق نواز شریف نے سکریپ کی ڈیوٹی میں کمی کر کے ۲۳ کروڑ روپے اور سیلز ٹیکس کی مد سے چار کروڑ روپے اتفاق فاؤنڈری کو دلوائے۔ میاں صاحب نے سیاسی وفاداریاں خریدنے کے چکر میں سیاسی کارکنان کو کرپٹ کیا۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء کے الیکشن میں زکوٰۃ فنڈ جو کہ غریبوں، ناداروں اور مساکین کے لیے مختص ہے، سے کروڑوں روپے اپنی انتخابی مہم پر خرچ کر ڈالے۔ اپنی دوسری وزارت اعلیٰ کے دوران ہی میاں نواز شریف نے بی سی سی آئی بینک کا حق نمک ادا کرنے کی غرض سے ایک شخص ظفر اقبال جو کہ ان دنوں بینک ڈوبنے کی وجہ سے سزا کاٹ رہے ہیں، کو اونے پونے داموں جون ۱۹۹۰ء میں ۲۳ ایکڑ اعلیٰ جنگلاتی زمین مری میں الاٹ کر دی اور پھر اس کی معمولی قیمت بھی ان کے صوابدیدی فنڈ سے ادا ہوئی۔

اگست ۱۹۹۰ء میں ایک بار پھر اسمبلیاں توڑ دی گئیں جن میں نواز شریف نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ سرکاری مشینری اور وسائل کی مدد سے وہ ۱۹۹۰ء کے الیکشن جیت کر ملک کے وزیراعظم بننے میں کامیاب ہو گئے۔ وزیراعظم بنتے ہی میاں صاحب

نے قومی تحویل میں چلنے والی صنعت اور مالیاتی اداروں کی بندربانٹ شروع کی۔ میاں صاحب نے بگاری مہم کے نتیجے میں اہم ضروریات زندگی پر ان کے مخصوص ساتھیوں کی اجارہ داریاں قائم کر دیں۔ مسلم کمرشل بینک میاں صاحب کے دوست میاں منشاء کو ان کی حسب منشاء دے دیا گیا۔ حالانکہ بولی میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ میاں صاحب نے اثاثے فروخت کر کے سنٹرل ایشیاء کی ریاستوں کے لیے مال دار شیخ کا کردار ادا کرنے کی بھی کوشش کی اور موٹر وے کے منصوبے میں اربوں روپے کوریائی فرم ڈائیو کو ٹھیکہ دے کر کمائے۔ وزارت اعظمیٰ کے زمانے میں میاں صاحب نے پابندیوں کی آڑ میں خفیہ طور پر اپنے حواریوں کے لیے تھانیدار اور تحصیلدار جیسی منافع بخش نوکریوں کے دروازے کھول دیئے جبکہ عام لوگوں کے لیے ان کی قیمت ایک لاکھ روپے سے پانچ لاکھ روپے تک تھی۔

نوکریوں کی اس طرح تقسیم کے باوجود میاں صاحب مسلسل میرٹ میرٹ کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے۔ اس میرٹ کا اندازہ اس بات سے خوب لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے ایک وزیر رانا پھول' ایک ایم اے پاس خاتون کی درخواست لے کر جب پنجاب کے درویش منش وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے پاس گئے تو انہوں نے دریافت کیا کہ انہیں کون سی نوکری دی جا سکتی ہے۔ رانا پھول نے کہا کہ میں پرائمری پاس ہو کر وزیر ہوں' آپ میٹرک پاس ہو کر وزیر اعلیٰ ہیں' میاں نواز شریف بی۔ اے کر کے وزیراعظم ہیں تو اس خاتون کو اسے اوپر لگا دیں۔ کیونکہ یہ بے چاری تو ایم۔ اے پاس ہے۔ "مغل شہزادے" نے اپنی پیلی شہرت کو بڑھانے کے لیے غریب ملک میں پیلی ٹیکسیوں کی سکیم شروع کی اور ۶۸۰۰۰ نوجوانوں کو ان کے گھر والوں سمیت بینکوں کے زیربار کر دیا اور بینکوں سے ۲۷ بلین روپے نکلوا کر بینکوں کو خسارے میں مبتلا کر دیا۔ ادھر اسی سکیم میں ۵۸۵ ملین ڈالر ان گاڑیوں کی درآمد پر خرچ کر کے ملکی معیشت کو ریکارڈ تجارتی خسارے میں مبتلا کر دیا۔ میاں صاحب کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز نے ملک میں نئے نئے ٹیکس متعارف کرائے۔

ایک نیا ٹیکس جو سرچارج کے نام سے آیا' اس نے وزیر موصوف کو بھی سرچارج عزیز کے نام سے مشہور کر دیا۔ وزیر موصوف نے کہا کہ پاکستان پر غیر ملکی

قرضوں کا بوجھ ۲۰ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے اور ہمیں پہلے سے زیادہ سخت شرائط پر قرضے مل رہے ہیں جبکہ ملکی قرضے ان کے علاوہ ہیں۔ یہ تمام قرضے میاں صاحب نے وزیراعظم رہنے کے لیے وفاداریاں خریدنے میں اڑائے۔ مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ میاں نواز شریف نے اعلیٰ افسران کی وفاداریاں خریدنے کے لیے ایک ارب روپے مختص کر دیئے ہیں۔ اس کا مقصد اپنی گرتی ہوئی حکومت کو بچانا ہے۔ دوسری طرف حکومت نے ایک معاہدے کے تحت کسٹم کا محکمہ اور اس کا بیس فیصد کام ایک غیر ملکی کمپنی کے حوالے کر دیا۔ حکومتی پالیسیوں نے ملک کو سیاسی دیوالیہ پن کا شکار کر دیا اور ہماری پہلے سے امریکہ سے وابستہ خارجہ پالیسی اس حد تک امریکی دباؤ میں آ گئی کہ امریکہ کے سینئر سرعام آ کر اسلام آباد میں پاکستان کے اندرونی معاملات کے متعلق پریس کانفرنسیں کرنے لگے اور ان پریس کانفرنسوں کے جواب میں وزیراعظم صاحب معذرت خواہانہ وضاحتی بیانات دیتے رہے۔ اسی دور میں صدر بش نے بھارت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات میں اپیل کی کہ بھارت جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے سے متعلق پانچ ملکی کانفرنس میں شرکت کرے۔

بھارتی وزیراعظم نے جرأت سے کام لیتے ہوئے یہ اپیل مسترد کر دی۔ میاں صاحب کی وزارت عظمیٰ کے دور میں امریکی سفارت خانے نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا کہ پارلیمینٹ کے کم از کم تین ارکان منشیات کی سمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہیں۔ اسمبلیوں کے ارکان منشیات کے علاوہ سرکاری خزانے اور ترقیاتی فنڈز کی بھی خوردبرد کرتے رہے۔ بیت المال اور جنیز فنڈز سے خوردبرد کی ایک سے بڑھ کر ایک مثالیں قائم ہوئیں۔ صرف پنجاب میں ۹۳-۱۹۹۰ کے درمیان تین وزرائے اعلیٰ نے جنیز فنڈ سے ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے خرچ کیے جبکہ اس فنڈ کی مد ۳ کروڑ روپے تھی اور اس میں پنجاب کا حصہ صرف ایک کروڑ روپے تھا۔ اس فنڈ کو ہضم کرنے والوں میں چار سینیٹر' ۲۱ ایم۔ این اے' ۲۳۵ ایم پی اے شامل تھے۔ ارکان قومی اسمبلی میں سے وزیر بہبود آبادی رانا نذیر احمد جو میاں صاحب کے پانچ پیاروں میں سے ایک تھے' بھی شامل تھے۔ میاں نواز شریف نے اپنے صوابدیدی فنڈز میں تجاوز کرتے ہوئے

(۸) لاکھ کے بجائے (۴۴۲) ملین روپے خرچ کر ڈالے۔ یہ رقم ہارس ٹریڈنگ کے عمل میں استعمال ہوئی۔

اسی طرح بیت المال سے ۲ بلین روپے نکلوائے۔ غضنفر ہدایت اللہ کے مطابق میاں نواز شریف نے مولانا عبدالستار نیازی کو ا ملین روپے دیئے۔ میاں نواز شریف نے بحیثیت وزیر اعلیٰ اور وزیراعظم جن لوگوں کو نوازا' خود بھی ان سے ہر قسم کے کام لیے۔ اپنے اتفاق گروپ کے لیے انتہائی ناکافی سیکیورٹیوں کے عوض تین بلین روپے کا قرضہ لیا۔ یہ قرضہ ان مختلف فرموں کے نام پر لیا گیا:

1۔ برادرز شوگر ملز 302 ملین روپے
2 برادرز ٹیکسٹائلز 75 ملین روپے
3 برادرز سٹیل ملز 92 ملین روپے
4۔ رمضان شوگر ملز 392 ملین روپے
5۔ خالد سراج ٹیکسٹائلز 102 ملین روپے
6۔ اتفاق شوگر ملز 385 ملین روپے
7۔ اتفاق ٹیکسٹائلز یونٹ I' 6 ملین روپے
8۔ اتفاق ٹیکسٹائلز یونٹ II' 30 ملین روپے
9 اتفاق ٹیکسٹائلز یونٹ III' 56 ملین روپے
10۔ اتفاق فاؤنڈری 1.05 بلین روپے
11۔ اتفاق برادرز 239 ملین روپے

اتفاق گروپ نے سرکاری بینکوں سے کم و بیش اتنا ہی قرض حاصل کر کے اپنے کاروبار کو فروغ دیا' جتنا قرض ساری حکومت نے قومی بینکوں سے لیا۔ مگر اس کے باوجود وزیراعظم صاحب عوام سے اپیل کرتے رہے کہ عوام چندہ دے کر ملک سے قرضوں کا بوجھ اتاریں۔ حالانکہ عوام نے اس قرضے سے ایک پائی بھی وصول نہیں کی۔ ملک کے تمام قرضے حکمران گروہ نے آپس میں بندر بانٹ کی طرح بانٹ ہے۔ اس کی عمدہ مثال یہ تھی کہ بڑے بڑے سیاست دانوں اور ۸ سرکاری ملازمین کے بیرون ملک علاج پر ۱۴ ملین روپے تحفہ کر دیئے گئے۔ جن ۳۸ افراد کو یکم جنوری

۱۹۹۳ء تک بیرون ملک علاج کے لیے بھیجا گیا' ان کے نام' ملک کا نام اور ان کی قیمتی صحتوں پر اٹھنے والے اخراجات درج ذیل ہیں:

پہلے دور حکومت میں نواز شریف نے سیاست دانوں اور سرکاری ملازمین کے بیرون ملک علاج پر ۲۹ ملین روپیہ خرچ کر دیا۔

۳۸ افراد کو یکم جنوری ۱۹۹۳ء تک بیرون ملک علاج کے لیے بھیجا گیا جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1_	میاں عبدالخالق	Rs 537000	(USA)
2_	میر نبی بخش خان کھوسہ	Rs 305000	(UK)
3	مولانا محمد خان شیرانی کی بیٹی زینت	Rs 216000	(UK)
4_	چودھری ناصر اقبال کی بیوی شیلہ ناصر اقبال	Rs 462000	(UK)
5_	سینیٹر یحییٰ بختیار	Rs 212000	(UK)
6_	غلام دستگیر خان	Rs 315000	(USA)
7_	غلام دستگیر خان کی بیوی مخدومہ نازلی	Rs 280000	(USA)
8_	عبدالماجد ملک	Rs 497000	(USA)
9_	ماسٹر جمال آصف	Rs 669000	(UK)
10	نقیب الرحمان خٹک (ڈپٹی سیکرٹری فنانس منسٹری)	Rs 437000	(UK)
11_	محمد خاور جمیل ڈپٹی سیکرٹری (پرائم منسٹر سیکرٹریٹ)	Rs 395500	(USA)
12_	مس فرح جمال	Rs 687000	(USA)
13_	اے ایچ سجاد (جائنٹ سیکرٹری مین پاور اینڈ اوورسیز)	Rs 436000	(UK)
14_	محمد خان اچکزئی (جائنٹ چیف اکنامک پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن)	Rs 441000	(UK)
15_	محمد پرویز اسٹیٹ انچارج اسسٹنٹ	Rs 193000	(USA)
16_	چودھری طالب حسین	Rs 396000	(UK)
17_	مس حنا عمر (منسٹری آف کامرس کے سیکشن افسر کی والدہ)	Rs 416000	(UK)

18۔ ظہیر الدین بابر (سینئر انسپکٹر سی بی آر راولپنڈی)	(UK) Rs 150000
19۔ محمد حبیب اللہ (انکم ٹیکس افسر لاہور)	(UK) Rs 334500
20۔ امتیاز علی کی والدہ (اے ایس پی اسلام آباد)	(USA) Rs 1224000
21۔ غلام حیدر (اسسٹنٹ ڈائریکٹر مین پاور اینڈ اوورسیز پاکستان)	(USA) Rs 926000
22۔ جسٹس محمد لون کی بیوی	(UK) Rs 426000
23۔ سید صدر علی شاہ (منیجنگ ڈائریکٹر بورڈ آف فیڈرل ایمپلائی)	(UK) Rs 1,325993
24۔ محمد شہریار عمر (وفاقی محتسب سیکرٹریٹ کے DG ولی احمد خان کا بیٹا)	(UK) Rs 259000
25۔ مسز اقبال راشد ملک (FG جونیئر پبلک سکول راولپنڈی کے پرنسپل کی بیوی)	(UK) Rs 354000
26۔ قاضی محمد علیم اللہ (سیکرٹری آف پرائم منسٹر کا پرنسپل)	(UK) Rs 615000
27۔ عامر علی چانڈیو (ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے)	(UK) Rs 150000
28۔ ماسٹر محمد احمد	(UK) Rs 669000
29۔ حسن رضا پاشا (ایڈیشنل سیکرٹری اکنامک افیئرز)	(UK) Rs 437000
30۔ مسز اکرم ذکی (سیکرٹری جنرل فارن افیئرز)	(USA) Rs 236000
31۔ مظفر محمد قریشی (ایڈیشنل سیکرٹری فنانس)	(UK) Rs 35627
32۔ شریف الدین پیرزادہ	(USA) Rs 300000
33۔ ڈاکٹر شمیع لون	(USA) Rs 374000
34۔ محمد احمد	(UK) Rs 205000
35۔ راجہ اورنگزیب	(UK) Rs 478000
36۔ صاحبزادہ روف علی خان (ریٹائرڈ آئی جی پولیس)	(UK) Rs 437000

(ریٹائرڈ آئی جی پولیس)

ان نوازشات اور اپنی جیبیں بھرنے کے علاوہ میاں نواز شریف پر یہ بھی الزامات ہیں کہ انہوں نے پنجاب حکومت کے فنڈز کو اتفاق انڈسٹریل کمپلیکس اور اتفاق ایگریکلچر فارم کی ترقی پر استعمال کیا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۹۲ء کو اسلام آباد وزیراعظم سیکرٹریٹ کے ایک آرڈر سے کمشنر لاہور کو ۵ کروڑ روپے لاہور سے رائے ونڈ تک سڑک کی تعمیر کے لیے دیئے گئے اور یہ سڑک اتفاق کمپلیکس اور اتفاق فارم کے درمیان سے گزارنے کے لیے اضافی ۱۴ کروڑ اور ۹۰ لاکھ روپے مہیا کیے۔ انہوں نے بیت المال سے ۱ بلین روپے اپنی TWP فنڈز میں جمع کرائے۔ اپنے فنڈز کو بڑھانے کے لیے وزیراعظم صاحب نے ۲۳۹۰۰ سے زیادہ افراد کو میرٹ پالیسیوں کو پس پشت ڈال کر مختلف ملازمتیں دیں۔

ان ملازمین کو مختلف محکموں میں مختلف پوسٹوں پر لگایا گیا۔ اور یہ تمام بھرتیاں ۱۹۷۴ء کے ریکروٹمنٹ ایکٹ کو نظر انداز کر کے کی گئیں۔ ۳۸۰۰ سے زیادہ افراد کو گریڈ ۱۷ میں بھرتی کیا گیا اور ۳۸۰۰ سے زیادہ افراد کو گریڈ ۱۶-۱۱ میں بھرتی کیا جبکہ ۱۷۰۰۰ سے زیادہ کو مختلف گریڈوں میں بھرتی کیا۔ وہ اسامیاں جن کا پبلک سروس کمیشن کے ذریعے انتخاب ہوتا تھا' ان کو تعلیمی معیار' تجربہ اور دوسری رعایات دی گئیں حالانکہ یہ رعایت صرف متعلقہ محکمہ دینے کا مجاز ہوتا ہے۔ میاں صاحب نے یہ تمام ذمہ داری محکمے کے سپرد کر دی کہ جس کو چاہے رعایت دے دیں اور ان رعایت دینے کی کوئی وجہ بھی نہیں درج کی گئی جو ریکروٹمنٹ رول نمبر ۲۳ کے تحت بتانا ضروری ہے۔

گریڈ ۱۶ کی بھرتیوں میں رشتہ نمبر ۱۶' ۱۷' ۱۸ کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ پنجاب پبلک سروس کمیشن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کس کو رعایت دینی ہے اور کس کو نہیں۔ ان قوانین کو نظر انداز کر کے محکمہ تعلیم میں سب سے زیادہ بھرتیاں کیں جن کی تعداد ۹۰۰۰ سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ PTC ٹیچرز کی ہزاروں اسامیاں بغیر اشتہار دیئے بھر دی گئیں۔ ۳۰۰۰ سے زائد ورکس ڈیپارٹمنٹ میں مختلف گریڈوں میں بھرتی کیے۔ محکمہ صحت میں ۲۵۰۰ اور رورل ڈویلپمنٹ میں ۱۹۰۰ اسامیوں پر بھرتیاں ہوئیں۔ سب سے زیادہ بھرتی کی خلاف ورزی نائب تحصیلدار'

اے۔ ایس آئی اور ٹیکسیشن انسپکٹر کی اسامیوں کے لیے ہوئی۔ میاں نواز شریف پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے سینئر گریڈوں کی اسامیوں میں میرٹ کو نظرانداز فوج کے کہنے پر کیا۔ یہ سب بھرتیاں ان مختلف محکموں میں ہوئیں:

۱۔	تعلیم	۹۲۰۰
۲۔	کمیونیکیشن اینڈ ورک	۳۰۰۰
۳۔	صحت	۲۶۰۰
۴۔	لوکل گورنمنٹ اور رورل ڈویژن	۱۸۰۰
۵۔	ہوم	۱۳۵۰
۶۔	ایس اینڈ جی اے ڈی	۱۰۰۰
۷۔	ہاؤسنگ	۹۵۰
۸۔	فنانس	۸۰۰
۹۔	اریگیشن	۸۰۰
۱۰۔	ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن	۵۰۰
۱۱۔	فوڈ	۳۵۰
۱۲۔	بورڈ آف ریونیو	۳۰۰
۱۳۔	لیبر	۲۵۰
۱۴۔	انفارمیشن	۲۵۰
۱۵۔	پاپولیشن ویلفیئرز	۱۵۰
۱۶۔	پلاننگ ڈویژن	۱۰۰
۱۷۔	لاء	۱۰۰
۱۸۔	ایگریکلچر	۱۰۰
۱۹۔	لائیو سٹاک	۱۰۰
۲۰۔	کوآپریٹو	۱۰۰
۲۱۔	فارسٹ	۵۰
۲۲۔	سوشل ویلفیئر	۱۰

۲۳۔ ٹرانسپورٹ ۴

۲۴۔ اوقاف ۵

یہی ساری لوٹ مار اور بے ضابطگیاں ہی تھیں جن کی وجہ سے میاں صاحب پر صدر پاکستان نے الزامات لگا کر چھٹی کرا دی مگر ریاست کے اندر پائے جانے والے تضادات کی وجہ سے میاں صاحب کا ستارہ اقتدار ایک بار پھر چمکا اور وہ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو حیرت میں مبتلا ہو کر بھاری ووٹوں کی اکثریت سے دوسری مرتبہ بھی وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ جب میاں صاحب نے اقتدار کی کرسی پر بوجھ ڈالا تو انھوں نے کہا کہ ملک بہت خسارے میں ہے۔ ملک کے ذمے بہت سارا قرض ہے۔ ہمارے عوام کی حالت ابتر ہے۔ معیشت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ملک میں قرض نادہندوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جس کی وجہ سے تمام بینک بیٹھ گئے ہیں اور قرضوں کی واپسی مشکل ہو رہی ہے۔ مگر میاں صاحب نے آتے ہی ۲۷ ملین روپے کا قرضہ حاصل کیا۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے ناکافی سیکیورٹی کے عوض قرضہ حاصل کیا۔ ملکی معیشت کی بحالی کے لیے تو وہ کچھ نہ کر سکے البتہ اپنے گھر کی معیشت کو ضرور بہتر بنا لیا۔

نصیراللہ بابر

نومبر۱۹۹۶ء میں صدر فاروق لغاری نے بے نظیر حکومت ختم کرتے وقت جو الزامات عائد کیے' ان میں شامل کئی سنگین الزامات کا براہ راست تعلق بے نظیر حکومت کے وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیراللہ بابر کے ساتھ تھا۔ جنرل (ر) نصیراللہ بابر کا نام بے نظیر کے دوسرے دور حکومت میں "دہشت کی علامت" کے طور پر سامنے آیا۔ نصیراللہ بابر نے ایف۔ آئی۔ اے' رینجرز اور دیگر اداروں کو حکومت مخالف قوتوں کے خلاف استعمال کیا اور اس دوران ملک میں مجموعی طور پر امن و امان کی صورت حال خراب رہی۔ وزیر داخلہ نصیراللہ بابر ان تمام واقعات کا ذمہ دار "غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں" کو قرار دیتے رہے۔ جنرل (ر) نصیراللہ بابر پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے کراچی میں ایم کیو ایم کا زور توڑنے کے لیے اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور تمام میسر حکومتی وسائل کو بروئے کار لا کر ایم کیو ایم حقیقی گروپ کی امداد کرتے رہے۔ جنرل (ر) نصیراللہ بابر پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ انہوں نے افغانستان میں برسرپیکار گروپ "طالبان" کی تشکیل کی اور انہیں جدید ترین اسلحہ اور جنگی مہارت مہیا کی۔

جنرل صاحب نے اپنی "ذمہ داری" کو وزارت داخلہ کے دائرہ کار تک ہی محدود نہ رہنے دیا بلکہ وہ ایف آئی اے کی "تحقیقاتی قوت" کے ساتھ اس وقت کے اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف اور ان کے سیاسی ساتھیوں پر بھی چڑھ دوڑے اور نواز شریف کے ضعیف والد میاں شریف کی بے رحمانہ گرفتاری کے علاوہ چودھری برادران سے بھی ان کا سلوک معاندانہ رہا۔ جنرل موصوف ، ہر دوسرے روز ٹیلی ویژن

سکرین پر حاضر ہو جاتے اور اپنی "فوجی چھڑی" کی مدد سے نواز شریف خاندان کی بدعنوانیوں پر مبنی پیچیدہ گراف کی گتھیاں سلجھاتے رہتے۔

نصیراللہ بابر کا المیہ یہ رہا کہ وہ تمام تر انتظامی معاملات میں خود کو عقل کل تصور کرتے ہوئے مشورے اور تحقیق سے کنارہ کیے رہے۔ پنجاب میں پھوٹ پڑنے والی بم دھماکوں کی لہر کو انہوں نے انتہائی غیر سنجیدہ انداز میں لیا اور بغیر کسی تفتیش اور تحقیق کے مذہبی رہنماؤں کی طرح بیانات داغنے شروع کر دیے اور اعلان کر دیا کہ بم دھماکوں میں بھارتی خفیہ ایجنسی "را" اور اسرائیلی خفیہ ایجنسی "موساد" ملوث ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

نصیراللہ بابر کی "اندھی تقلید" کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا تحقیق محض اپنے وجدان کو بروئے کار لاتے ہوئے تحقیقاتی اداروں کو کسی مشن پر لگا دیتے۔ اس کی روشن مثال راولپنڈی کا بم دھماکہ تھا۔ اس بم دھماکے میں شدید جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ وزیر داخلہ موصوف نے اپنی تحقیق اور عرق ریزی کا آغاز لاہور کے ایک پبلشر "گوتم پبلشرز" کے سیلزمین سے کیا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ اس بم دھماکے میں زخمی ہونے والے افراد میں گوتم پبلشرز کا ملازم عمانوئیل مسیح بھی تھا جو ادارے کی نئی کتب کی لسٹ لے کر مختلف شہروں میں آرڈرز وصول کر رہا تھا اور پبلشروں اور بک سیلرز سے پچھلا حساب بے باک کرنے کی مہم پر تھا۔ جب بم دھماکہ ہوا تو وہ جائے وقوعہ سے قریب ہونے کے باعث زخمی ہو گیا۔ اگلے روز جب عمانوئیل مسیح کو ہسپتال میں ہوش آئی تو اس غریب نے فوری طور پر اپنے گمشدہ ۱۵ ہزار روپے کے لیے واویلا شروع کر دیا۔ موقع پر موجود تحقیقاتی اداروں کے افراد نے اس کا نام پوچھا اور اس کے ادارے کے بارے میں معلوم ہونے پر اسے حراست میں لے لیا گیا۔ فوری طور پر وزیر داخلہ نصیراللہ بابر کو اطلاع دی گئی کہ "را" کا ایجنٹ گرفتار کر لیا گیا ہے کیونکہ گرفتار ہونے والا خود بھی دھماکے میں زخمی ہو گیا تھا۔

وزیر داخلہ نے تمام مصروفیات ترک کر دیں اور ایک تحقیقاتی ٹیم گوتم پبلشرز کے مالک عامر ریاض کی گرفتاری کے لیے لاہور روانہ کر دی گئی۔ جبکہ عامر ریاض اپنے سیلز مین کے زخمی ہونے کی اطلاع پا کر خود ہی اسلام آباد پہنچ چکا تھا۔ وزیر داخلہ

نے فوری طور پر پریس کانفرنس طلب کی اور اعلان کر دیا کہ بم دھماکے کے ملزمان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان کا تعلق بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ساتھ ہے اور ملزمان لاہور میں "گوتم پبلشرز" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہے تھے۔ یہاں عامر ریاض اور اس کے ملازم کی بدقسمتی آڑے آئی اور تحقیق کاروں نے "گوتم" لفظ کی تحقیق شروع کر دی۔ عامر ریاض جو دیگر پبلشروں کی طرح کتب کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ہندوستان جا چکا تھا' اس کے اس "عمل" نے تحقیق کاروں کو اور ولاسہ دیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وزیر داخلہ نے برملا اس کا اعلان کیا کہ گوتم پبلشرز "را" کا قائم کردہ اشاعتی ادارہ ہے جو اشاعت کے پردے میں "را" کو مختلف کارروائیوں کے لیے معلومات فراہم کرتا ہے۔

جب گوتم پبلشرز کے خلاف تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو ایک فوجی خفیہ ادارے کے افسران نے وزیر داخلہ پر انکشاف کیا کہ گوتم پبلشرز کے مالک نے ایک ایسی "مسلک" کتاب بھی شائع کر دی تھی جس کی اشاعت سے ادارے کے مالک کو روکا گیا تھا۔ ضیاء میاں نامی ایک شخص نے پاکستان کے مختلف دانشوروں کے مضامین پر مبنی اس کتاب کو مرتب کیا اور گوتم پبلشرز نے اس کتاب کو شائع کر دیا۔ واضح رہے کہ یہ کتاب خفیہ ایجنسیوں نے لاہور کے مختلف پبلشروں کے ہاں چھپنے سے روک دی تھی۔ اس ساری داستان کو بھی عامر ریاض اور عمانوئیل کی تحقیق میں جرم کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ عامر ریاض کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا اور عمانوئیل بے چارہ قید میں پڑا خفیہ ایجنسیوں کی مار کھاتا رہا۔

بے نظیر حکومت ختم ہونے کے بعد راقم الحروف نے اسلام آباد میں جنرل صاحب سے ملاقات کی اور دوران ملاقات گوتم پبلشرز کی داستان چھیڑی اور جنرل صاحب کو یاد دلایا کہ محض ان کی جذباتیت اور عجلت نے یہ تمام واقعہ جنم دیا تو انہوں نے فوراً اپنی چھڑی سامنے رکھی میز کے کنارے پر ماری اور جواب دیا کہ میں آج بھی اپنے اس دعوے پر قائم ہوں کہ گوتم پبلشرز کا براہ راست تعلق ہندوستانی خفیہ ایجنسی "را" کے ساتھ تھا اور راولپنڈی بم دھماکے میں عمانوئیل مسیح ملوث تھا۔

کراچی کے اندر جاری فوجی آپریشن کی کوریج --- نے اسی طرح سنبھالی

جس طرح جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں سنبھالی تھی مگر اس مرتبہ نامور کمانڈر کے دست کرم پر اپنے ہی ملک کے معصوم شہری تھے۔ کراچی کے فوجی آپریشن میں جنرل نصیراللہ بابر کا کردار اور بیانات رہ رہ کر کسی فاتح کمانڈر کی یاد دلاتے تھے جبکہ وہ اس وقت کمانڈر نہ تھے اور نہ ہی ملک میں فوجی حکومت تھی۔ وہ ایک آئینی جمہوری حکومت کے وزیر داخلہ تھے اور پیپلز پارٹی کے سیاسی رہنما تھے۔ انہوں نے کراچی آپریشن کے پورے عرصے میں ایک دن بھی اپنی سیاسی دانش اور حکمت عملی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ ایک مہم جو سپاہی کی مانند رہے اور پورے شہر کو دشمن قرار دے کر للکارتے رہے اور مسلسل کہتے رہے کہ میں پٹھان بچہ ہوں اور میرے سائز کی کوئی بوری ابھی نہیں بنی ہے جس میں میری لاش بند کی جا سکے۔ جنرل بابر کے ان اشتعال انگیز بیانات نے کراچی شہر کے زخموں پر مرہم لگانے کی بجائے نمک پاشی کا کام دیا اور شہر میں احساس بیگانگی اور احساس بے چارگی میں اضافہ ہوا۔

گورنر سندھ فخر الدین جی ابراہیم نے وزیر داخلہ کی اس روش پر اظہار ناپسندیدگی کیا۔ وہ کہتے تھے کہ کراچی کے عوام پہلے ہی ایم کیو ایم کی دہشت گردی کا شکار ہیں لہٰذا دہشت گردوں اور قانون شکن عناصر سے نبٹنے کے لیے شہریوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ جس کے لیے انہوں نے شہریوں اور پولیس کی کمیٹیاں بنوائیں جو جنرل صاحب کو پسند نہ آئیں اور انہوں نے اس درست اقدام پر پانی پھیر دیا اور گورنر صاحب کو بھی استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ جنرل نصیراللہ بابر انصاف کے مسلمہ اصول کہ ایک معصوم کو بچانے کے لیے تو مجرمان کو بھی چھوڑ دیا جائے تو حرج نہیں ہے' جنرل صاحب نے یہ فارمولا پیش کیا کہ ایک مجرم کو ختم کرنے کے لیے اگر تو معصوم شہریوں کی بھی جان لینی پڑے تو لے لینی چاہیے۔

جنرل نصیراللہ بابر کے آنے سے پہلے ایک عرصے سے ملک میں سیاسی مخالفین کو وطن دشمن اور ہر کام کے پیچھے دوسرے ملکوں کی ایجنسیوں کے ہاتھ کی باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ جنرل بابر صاحب نے اپنی کج فہمی اور مسائل سے نبٹنے کی سیاسی نااہلی کی بنا پر ہر واقعہ کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ تلاش کرنا شروع کر دیے جن کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں جبکہ خود جنرل بابر صاحب نے ہمسایہ ملک کی آئینی حکومت کو ختم کرنے کے

لیے طالبان کا پراجیکٹ تیار کیا اور طالبان پراجیکٹ کے بارے میں جنرل نصیراللہ بابر کی قائد بے نظیر بھٹو کا کہنا تھا کہ طالبان کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتیں۔ اس کے بارے میں برطانوی حکومت بہتر بتا سکتی ہے اور افغان راہنما گلبدین حکمت یار کے مطابق طالبان کو سرمایہ عرب حکمران' تربیت اور اسلحہ اسرائیل برطانیہ اور امریکہ بہم پہنچا رہا ہے۔ اب یہ بات خود نصیراللہ بابر بتا سکتے ہیں یا بے نظیر بھٹو بتا سکتی ہیں کہ جنرل بابر کس حیثیت سے اسرائیل' برطانیہ' امریکہ اور عرب حکمرانوں سے منسلک تھے۔

نصیراللہ بابر پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے حکومت پنجاب کو زبانی حکم دے دیا کہ وہ آصف علی زرداری کے دوست بلوچ قبائلیوں (کلیر بگٹی) کو ہر ماہ معقول خرچ دے۔ واضح رہے کہ نواب اکبر بگٹی کے مخالف کلیر بگٹی خاندان کے لوگ پنجاب میں پناہ لیے ہوئے تھے اور انہوں نے ملتان شہر میں چھوٹی سی غلط فہمی کی بنا پر ملتان کے شہریوں پر فائر کھول دیا جس میں پانچ بے گناہ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ آصف علی زرداری ان کو لاہور کے نواحی علاقے تورے والا جنگل میں لے آئے جہاں آصف علی زرداری کے دوست طاہر خان نیازی کا قبضہ تھا۔ اس جنگل میں بلوچ قبائلیوں کو ہر ماہ حکومت پنجاب کروڑوں روپیہ فراہم کرتی رہی۔ بلوچوں نے ایک گاؤں کی معصوم لڑکیوں کو اغواء کر کے انہیں زیادتی کا نشانہ بنایا تو آصف علی زرداری کی ہدایت پر اس معاملے کو مقامی پولیس نے وہیں دبا دیا۔ بعض ذرائع بیت المال کے ایک اعلیٰ آفیسر کے استعفیٰ کو بھی اس سلسلے سے جوڑتے ہیں کہ وزیر داخلہ نے بیت المال کے اس عہدیدار کو ہدایت کی کہ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے بیت المال فنڈ سے ۲ کروڑ روپیہ ان بلوچوں کو فراہم کرتے رہیں لیکن بااصول عہدیدار نے وزیر داخلہ کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی بجائے اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پسند کیا۔

۹۵ء میں شیخوپورہ کے علاقہ میں بانڈڈ لیبر فیڈریشن کا ایک سرگرم رکن اقبال مسیح ایک نشئی کے ہاتھوں قتل ہوگیا اور اس کی فیڈریشن نے اس قتل کا ذمہ دار کارپٹ انڈسٹری کو ٹھہرایا لیکن چند روز بعد اصل حقائق منظر عام پر آگئے اور اصل ملزم کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس دوران بی ایل ایل ایف نے بیرون ملک جو مہم

چلائی' اس کے نتیجے میں پاکستان کی کارپٹ انڈسٹری کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت پاکستان اسلام آباد میں بین الاقوامی میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کو اقبال مسیح قتل کے اصل حقائق تو نہ بتا سکی لیکن اس نے یہ "ٹارگٹ" نصیراللہ بابر کو سونپ دیا۔ جنرل موصوف لاہور تشریف لائے اور بی ایل ایل ایف کے ساتھ ایک صحافی کے طور پر کام کرنے والے ظفریاب کو گرفتار کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ ایف آئی اے نے ظفریاب احمد کو گرفتار کر لیا اور وزیر داخلہ موصوف نے دعویٰ کر دیا کہ ظفر یاب "را" کا نمائندہ ہے اور ملک کی انڈسٹری کے خلاف "را" کی ہدایت پر کام کر رہا ہے۔ نصیراللہ بابر کی وزارت داخلہ کی بے شمار ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جو نصیراللہ بابر کی شخصیت کی غمازی کرتی ہیں۔

افغانستان کے مسئلے کو الجھانے اور مجاہدین کے بارے میں جارحانہ اور غیر دوستانہ رویہ اختیار کرنے اور امن کے نام پر افغانستان کو ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں دھکیلنے کا ذمہ دار بھی جنرل نصیراللہ بابر کو قرار دیا جاتا ہے۔ نصیراللہ بابر کو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے زمانے میں افغانستان کی تحریک مزاحمت کے بارے میں ایک عمومی نوعیت کا مشن دیا گیا تھا اور وہ آج تک اپنی اس کارگردی کو اپنے سینے پر سجائے پھرتے ہیں۔

اگرچہ دیگر بڑے سیاسی لیڈروں اور ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں کی طرح جنرل (ر) نصیراللہ بابر کی ذاتی کرپشن نہیں ملتی اور اور نہ ہی ان پر ذاتی کرپشن کے حوالے سے کوئی سنگین الزام لگایا گیا ہے لیکن جنرل (ر) نصیراللہ بابر کی شخصیت کو متنازعہ بنانے میں ان کے اقدامات ہی کافی ہیں جو نہ تو کسی منطق پر مبنی تھے اور نہ ہی ان میں کسی نوعیت کی معروضیت تھی۔ وہ ایک پیپلز پارٹی کے کٹرے جیالے کی سطح سے سوچنے پر فوری عمل شروع کر دیتے اور ان کا مشن محض مخالفین کو طاقت کے ذریعے کچلنا اور بدنام کرنا تھا۔

یحییٰ خان

آغا محمد یحییٰ خان ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد فوج میں کمیشنڈ آفیسر منتخب ہوئے۔ کمیشن ملنے کے بعد ان کو سیکنڈ بٹالین ووسٹر رجمنٹ میں ٹرانسفر کر دیا گیا اور اپنی یونٹ کے ہمراہ بلوچستان چلے گئے۔

یحییٰ خان دوسری جنگ عظیم کے دوران مصر، قبرص، اٹلی، عراق اور سوڈان کے محاذوں پر تعینات رہے۔ جنگ کے خاتمے پر وطن واپس آنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں سٹاف کالج کوئٹہ چلے گئے جہاں سے گریجوایشن مکمل کی۔ اس کے بعد سٹاف کالج میں انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت کالج کی تمام ذمہ داری یحییٰ خان کو سونپ دی گئی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں یحییٰ خان کی لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ہو گئی اور ۱۹۵۱ء میں بریگیڈیئر بن گئے جبکہ ۱۹۵۷ء میں پاکستان آرمی کے چیف آف جنرل سٹاف بنائے گئے۔ یحییٰ خان ۱۹۶۰ء میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین بنا گئے جب پاک بھارت جنگ

شروع ہوئی تو یحییٰ خان چھمب جوڑیاں کے محاذ پر تعینات رہے۔ وہ مارچ ۱۹۶۶ء میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز کیے گئے جبکہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف بن گئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء میں جب ایوب خان نے صدارت کے عہدے سے استعفیٰ دیا تو یحییٰ خان نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے کے بعد صدر پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا۔

۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک ملک کے اندر لاتعداد سیاسی تبدیلیاں آئیں اور ملکی ڈھانچہ میں تبدیلی کے آثار واضح ہوگئے۔ مشرقی پاکستان میں جنگ کے بعد سقوط ڈھاکہ کا اعلان کیا گیا تو مغربی پاکستان میں ہنگامے شروع ہوگئے اور یحییٰ خان نے اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کر دیا۔ یحییٰ خان ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔

اقتدار چھوڑنے کے بعد یحییٰ خان پشاور چلے گئے۔ ۱۹۸۰ء میں کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئے اور ان کو پشاور میں دفن کیا گیا۔

یحییٰ خان کا شمار پاکستان کی سیاسی تاریخ کے متنازعہ ترین افراد میں ہوتا ہے۔ یحییٰ خان کی شخصیت' کارنامے اور فیصلے پاکستان کی قسمت پر کس طرح اثر انداز ہوئے' اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا نسب قزلباشوں کے ایک خاندان سے ملتا ہے جو ایران سے آکر پشاور میں آباد ہوا اور اس کا سلسلہ نادر شاہ کے ان لٹیروں سے چلتا ہے جنہوں نے ۱۷۳۹ء میں برصغیر پر حملہ کرکے دہلی میں عوام کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ یحییٰ خان نے ۱۹۳۸ء میں فوجی کمیشن حاصل کیا۔ سال بھر کے بعد انہیں بلوچ رجمنٹ کی تیسری بٹالین میں شامل کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران آٹھویں فوج کی رجمنٹ کے ساتھ مصر' سوڈان' عراق' لیبیا' قبرص اور اٹلی میں فوجی خدمات انجام دیں۔ اٹلی میں جرمن فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور فرار ہوگئے۔ وہ ابتداء ہی سے شراب کے رسیا تھے اور عورت ان کی کمزوری تھی۔ جنگ کو رومن جرنیلوں کی طرح اپنا پسندیدہ کھیل قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی فوج کے نوجوان افسروں میں کیپٹن تھری ڈبلیو (وائن' وومن اینڈ وار) کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں [illegible] (ڈبلیو) بن گیا۔

فروری ۱۹۶۹ء کے وسط تک جنرل محمد ایوب خان کو نوشتہ دیوار نظر آنے لگا تھا۔ چنانچہ انہوں نے انتقال اقتدار کا طریقہ طے کرنے کے لیے مارچ کے شروع میں سیاسی رہنماؤں کی ایک کانفرنس راولپنڈی میں طلب کی۔ مولانا بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو کے سوا تمام سیاسی لیڈروں نے اس میں شرکت کی۔ گول میز کانفرنس تسلی بخش طور پر اختتام کو پہنچی اور اس نے ایوب خان کو باعزت اقتدار سے دستبردار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ کانفرنس میں طے پایا کہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اسلام آباد میں عام طور پر یہ سوال پوچھا جاتا تھا کہ ایوب خان کے بعد کون آئے گا؟ کہنے والے یہی کہتے تھے کہ وہ فوج کا کمانڈر انچیف ہوگا اور فوج کا یہ کمانڈر انچیف یحیٰی خان تھا۔

۱۹۵۸ء میں فوجی بغاوت کی منصوبہ بندی کی تمام تفصیلات یحیٰی خان کے سپرد کی گئی تھیں۔ ان دنوں یحیٰی خان بریگیڈیئر تھے اور وہ ایوب خان کے زوال تک دس سال کے عرصہ میں ایوب خان کے قریب رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۶۶ء میں جب جنرل محمد موسیٰ خان کمانڈر انچیف کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تو یحیٰی خان کا اس عہدہ پر آنا کوئی تعجب خیز نہ تھا۔

گول میز کانفرنس جونہی ختم ہوئی، یحیٰی خان نے اپنے منصوبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ملٹری انٹیلی جنس تو ان کے قبضے میں تھی ہی، سول انٹیلی جنس بھی کسی حد تک ان کے کنٹرول میں تھی۔ انہوں نے سول اور ملٹری انٹیلی جنس کے ذریعے ایوب خان کو اپنی مرضی کی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ انہی اطلاعات کی بنیاد پر ایوب خان نے کچھ مخصوص علاقوں میں مارشل لاء نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر یحیٰی خان ایوب خان سے ملے اور ایوب خان کو باور کرایا کہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ان کے اقدامات ناکافی ہیں بلکہ ناقابل عمل بھی ہیں۔ یحیٰی خان نے کہا کہ اگر مارشل لاء نافذ کرنا ہے تو مسلح افواج کے سربراہ کے طور پر مجھے تمام قومی معاملات پر کنٹرول بھی کرنا ہوگا۔ ایوب خان کو یحیٰی خان کے عزائم سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ یحیٰی خان ایوب خان سے وہی سلوک کر رہا تھا جو ایوب خان نے سکندر مرزا سے کیا تھا۔ ملک گیر تحریک کے نفسیاتی اثرات اور دباؤ کے باعث ایوب خان نے یحیٰی خان کی تجویز مان لی اور

مارچ ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گیا اور اقتدار ایوب خان سے یحییٰ خان کو منتقل ہو گیا۔

سیاست دان تو ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے لیکن ایسا ایک شخص بھی تھا جو ان حالات و واقعات کے رونما ہونے سے اپنے اقتدار کے لیے درمیان راہ تلاش کر رہا تھا۔ یہ یحییٰ خان تھا' جس نے اپنی طویل سازشوں کو اب عملی شکل دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

کرنل صدی ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یحییٰ خان کے "کارناموں" کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"۳۰ جنوری ۱۹۶۸ء کو ایوب خان پر دل کا دورہ پڑا۔ یحییٰ خان ایک عرصے سے اس صورت حال کی تلاش میں تھا۔ انہوں نے ایوان صدر میں ایوب خان سے ملنے پر پابندی لگا دی۔ یہاں تک کہ ایوب خان کی کابینہ کے سینئر وزیر خواجہ شہاب الدین بھی جب ایوب خان سے ملنے آئے تو انہیں ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔ جس روز یحییٰ خان نے ایوب خان پر یہ پابندی عائد کی' اسی روز انہوں نے صدر کے مشیر اعلیٰ فدا حسن کو طلب کیا اور انہیں ہدایات دیں کہ تمام امور اور کاغذات اس کے سامنے پیش کیے جائیں۔ چند روز بعد ایوب خان سنبھل گئے۔ انہیں صورت حال کا اندازہ ہوا۔ ایوب خان خود کو یحییٰ خان کی گرفت میں دیکھ رہے تھے اور اس سے نجات کی سوچ رہے تھے۔ دوسری جانب یحییٰ خان اقتدار پر قبضہ کے لیے سرتوڑ کوشش میں مصروف تھا"۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء ایوب خان کے اقتدار کا آخری دن تھا۔ انہوں نے قوم کے نام اپنی تقریر اور کمانڈر انچیف یحییٰ خان کے نام اپنے خط پر دوبارہ نظر ڈالی لیکن یحییٰ خان نے ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہونے دی۔ ایوب خان نے آخری پیغام ریڈیو اور ٹی وی پر ریکارڈ کرایا تو یحییٰ خان نے ریکارڈنگ کے ٹیپ اپنے قبضے میں کر لیے۔ یحییٰ خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ یحییٰ خان نے تقریباً ۳ سال تک حکمرانی کی۔

یحییٰ خان کے دور میں ون یونٹ توڑ گیا۔ انتخابات کرائے گئے حکمران کے

نتائج یحییٰ خان کی امنگوں کے برعکس نکلے۔ یحییٰ خان کو خفیہ ایجنسیوں نے یقین دلایا تھا کہ انتخابات میں کوئی سیاسی جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کر سکے گی اور ہر صورت میں یحییٰ خان کو صدر قبول کر کے اقتدار میں شراکت کی خواہش مند ہوگی۔

یحییٰ خان کے دور میں مشرقی پاکستان کی صورت حال بے حد خراب ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ایک سیاسی پارٹی کے لوگ مسلسل زیادتیاں کر رہے تھے۔ اگر مشرقی پاکستان کی حکومت ان عناصر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی تو مرکزی حکومت کو اس جانب توجہ دینی چاہیے تھی۔ مگر یحییٰ خان کی حکومت نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی اور درگزر کی پالیسی اختیار کیے رکھی' جس سے شیخ مجیب الرحمن اور بھی دلیر ہو گئے اور مارچ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے بنگالیوں سے کھل کر کہہ دیا: "چھ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر خود مختاری حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جاؤ۔ ہم اپنی تحریک جنگ لڑ رہے ہیں۔ اب ہم صحیح معنوں میں بنگلہ دیش بنائیں گے"۔

مجیب الرحمن ۶ نکات کی بنیاد پر صریحاً حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا نشان تھے۔ اسی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لینے کا پرچار کرتے رہے۔ یحییٰ خان کی حکومت ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرات نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ جنوری ۱۹۷۰ء کو شیخ مجیب الرحمن نے مذکورہ نوعیت کی باتیں کئی ایک جلسوں میں کہیں دراصل شیخ مجیب الرحمن نے میدان ہموار کر لیا تھا اور انھیں اپنی فتح یقینی نظر آ رہی تھی۔

یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی ملک کی اصلاح اور قومی ترقی کا روایتی نعرہ لگایا۔ یہ ایک ایسا ڈھونگ تھا جس کا اس ملک میں بار بار اعادہ کیا گیا۔ یحییٰ خان نے جو انتخابات کرائے' تو عام تاثر یہی تھا کہ یہ شخص اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپ کر واپس چلا جائے گا۔ پھر اس نے کچھ سیاسی اور انتظامی اعلانات کیے۔ اس نے تین سو تین سرکاری افسروں کو نوکری سے نکال دیا لیکن ایوب خان' اس کے خاندان اور ان کے قریبی ساتھیوں کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

یحییٰ خان نے انتخابات کو اپنی مرضی کے مطابق رکھنے کے لیے نوازشات کا سلسلہ دراز کیا۔ راؤ رشید کے دعوے کے مطابق جب یحییٰ خان نے یہ اندازہ لگایا کہ مغربی پاکستان میں بھٹو شاید دوسروں سے زیادہ سیٹیں لے جائیں' انھوں نے کوشش کی

کہ مجیب' جو اس سے قبل اندازے کے مطابق اتنا کمزور نہیں رہا تھا کو اور کمزور کیا
جائے اور بھٹو کی سیٹیں کم کی جائیں۔ مغربی پاکستان میں اس نے جنرل عمر اور مشرقی
پاکستان میں این اے رضوی کو استعمال کیا۔ رضوی صاحب مولانا بھاشانی پر اثر انداز
ہوئے اور مغربی پاکستان میں دائیں بازو کی جماعتوں کے لیے جنرل عمر۔ جنرل عمر نے یحییٰ
خان کے ایماء پر بڑے بڑے صنعت کاروں سے لاکھوں روپے اکٹھے کیے اور انہیں
الیکشن میں صرف کیا اور لاکھوں روپے کھا گئے۔ انکوائری کے سلسلے میں بعد ازاں
این۔ اے رضوی نے اعتراف بھی کیا کہ انہوں نے پیسے کھائے ہیں۔ مغربی پاکستان
میں جنرل عمر کے ذریعے خان قیوم پر نوازشات کی گئیں کیونکہ فوجی حکومت چاہتی تھی
کہ خان قیوم ایک لیڈر کی حیثیت سے ابھریں۔ حکومت نے اس سلسلے میں ان کی
بھرپور امداد کی۔

یحییٰ خان کیونکہ شراب و کباب اور عیاشی کے دلدادہ اور بادشاہ تھے' اس لیے
اس فوجی حکمران نے اپنے حرم کی تزئین و آرائش اور سجاوٹ پر بے دریغ قومی خزانہ
اور حکومتی وسائل صرف کیے۔ اس لوٹ کھسوٹ اور عیاشی کی داستانیں زبان زد عام
ہیں۔ غیر ملکی جاسوس عورتوں کی اس دور میں حکمرانی رہی اور یحییٰ خان اس ضمن میں
اپنی عیاشی کی راتوں کو طول دیتا رہا۔ ایک تقریب میں سی آئی اے کی ایک جاسوس
عورت بھی موجود تھی اور جنرل یحییٰ خان کی ہر پارٹی میں شریک ہوتی تھی۔ اسی محفل
میں یحییٰ خان اس کے ساتھ موجود تھا اور وہ سوئمنگ پول میں نیم عریاں حالت میں نہا
رہی تھی اور یحییٰ خان اسے اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک رہا تھا اور محظوظ ہو رہا
تھا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب مشرقی پاکستان کے آخری دن تھے۔

جنرل یحییٰ خان کا دور انتہائی غیر سنجیدہ اور غیر یقینی فضا کا دور تھا۔ یحییٰ انتظامیہ
کی کوئی واضح پالیسی نہیں تھی۔ مارشل لاء انتظامیہ نے ایوب خان کے خلاف احتجاجی
تحریک کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ون یونٹ ختم کر دیا گیا۔

سابق مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے چوبیس سالہ سیاسی غلبے اور طویل
آمریت کے ردعمل کے طور پر عوام کی اکثریت شیخ مجیب الرحمن کے صوبائی خود مختاری
کے چھ نکاتی پروگرام پر متفق ہو چکی تھی۔ یحییٰ دور کے انتخابات کے نتیجے میں پیپلز پارٹی

اور عوامی لیگ اکثریتی پارٹی تھیں۔ اصولاً انتخابات کے بعد مارشل لاء انتظامیہ کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلا کر معاملہ منتخب نمائندوں پر چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن چونکہ انتخابی نتائج یحییٰ خان کے مطابق نہ تھے' اس لیے اقتدار کی منتقلی کے تاخیری حربے استعمال کیے گئے۔ پیپلز پارٹی نے اسمبلی کے باہر شیخ مجیب سے سودا بازی کرنے کی کوشش کی لیکن مجیب نے اپنی اکثریت کی بنیاد پر کسی قسم کی بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔

مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر بڑا واویلا مچا۔ بعض لوگوں کے مطابق ایوب خان کے ایک قریبی ساتھی نے تاشقند کے ڈرامے سے توجہ ہٹانے کے لیے ایوب خان کو بچانے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام میں تفریق پیدا کرنے کے لیے چھ نکات کا فارمولہ بنایا۔ ایوب خان نے ۶ نکات کے بارے میں شیخ مجیب کے بیانات کو بہت زیادہ ہوا دی۔ لیکن صدر ایوب نے جب محسوس کیا کہ تاشقند کا بحران ختم ہو گیا ہے تو وہ عوامی لیگ پر برس پڑے اور مجیب کو جیل ڈال دیا۔ بعد ازاں عوامی لیگ کے لیڈر پر اگر تلہ سازش کا مقدمہ چلایا گیا۔

جنرل یحییٰ خان نے یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو قومی اسمبلی کا ڈھاکہ میں ہونے والا اجلاس ملتوی کر کے عوامی لیگ کے ساتھ براہ راست محاذ آرائی کی۔ گورنر مشرقی پاکستان ان کا حامی نہ تھا۔ حکومت کے اس فیصلے کے خلاف بھرپور مہم شروع ہو گی۔ مجیب نے تحریک عدم تعاون شروع کرا دی۔

یحییٰ خان نے سیاست دانوں کی میٹنگ بلائی۔ مجیب الرحمٰن نے آنے سے انکار کر دیا۔ ۸ مارچ کو بڑے پیمانہ پر فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ یکطرفہ اعلان آزادی کیا گیا۔ مارشل لاء کی حکومت نے حالات کی سنگینی کا احساس نہ کیا اور فوجی آپریشن شروع کرا دیا جس سے عوام میں نفرت نے مزید اثرات مرتب کیے۔

مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات تھے۔ بھارت نے اس کا فائدہ اٹھایا اور براہ راست مداخلت کی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے باعث نسلی فسادات شروع ہو گئے۔ مغربی پاکستان کے عوام اس سے یکسر بے خبر رہے انہیں کچھ معلوم نہ ہوا کہ فوجی حکمران مشرقی پاکستان میں کیا کر رہے ہیں۔

۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان نے الزام لگایا کہ بھارت نے پاکستان کے خلاف غیر اعلانیہ جنگ چھیڑ دی ہے۔ "پاکستان کا قیادت میں بحران" میں میجر جنرل فضل مقیم کا کہنا ہے کہ ۲۲ نومبر کو جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو ایوان صدر میں ایک اجلاس ہوا جس کے اختتام پر تقریباً چلاتے ہوئے یحییٰ خان نے کہا کہ "مشرقی پاکستان کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں میں تو صرف دعا کر سکتا ہوں"۔

۳ دسمبر کو جب پورے زور و شور سے جنگ جاری تھی اور پاکستانی طیاروں نے بھارتی فضائی اڈوں پر حملے کا آغاز کیا تو بحریہ کے سربراہ کو ریڈیو سے یہ اطلاع ملی جبکہ خارجہ امور اور دفاع کے وزیروں کو اپنی بیویوں سے پتہ چلا کہ جنگ میں تیزی آگئی ہے اور باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ دراصل اس وقت یحییٰ خان کی قیادت سو رہی تھی خود یحییٰ خان طاؤس و رباب کی محفلوں میں غرق تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مرحلے پر اس قدر ابہام دیکھنے میں آیا جیسے ایک افراتفری کا عالم ہے۔ دو بار جی ایچ کیو راولپنڈی سے ڈھاکہ میں ایسٹرن کمان کو غلط پیغامات بھیجے گئے۔ ۵ دسمبر کو فوج کے چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید خان سے جنرل نیازی نے کہا ـــــــ "امید ہے چینی فوجی کارروائیاں شروع کر دیں گے"۔

حالانکہ چین کی جانب سے پاکستان پر واضح کر دیا گیا تھا کہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ۱۲ دسمبر کو جنرل گل حسن نے جی ایچ کیو سے ٹیلی فون پر پشتو میں یہ پیغام دیا "شمال اور جنوب سے دوست آ رہے ہیں (زرد اور سفید قوم' چینی اور امریکہ) اس وقت اسلام آباد جی ایچ کیو اور فوجی ٹولہ کا سارا ماحول خود فریبی' جھوٹ اور غلط فہمیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ یحییٰ خان نے دو مرتبہ اپنے سیکرٹری اطلاعات سے دریافت کیا کہ خلیج بنگال میں ساتویں بحری بیڑے کی پوزیشن کیا ہے؟ مشرقی پاکستان تباہی کے دہانے پر پہنچا ہوا تھا۔ اسلام آباد سے اعلان ہوا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو خلاف قانون قرار دینے سے خالی ہونے والی نشستوں پر باقی ماندہ ضمنی انتخابات غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کیے جا رہے ہیں۔

۱۵ دسمبر کو جب انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے ترجمان سے غیر ملکی اخبار نویسوں نے دریافت کیا کہ جنگ کون جیت رہا ہے تو ترجمان نے بڑی رازداری سے کہا "ہم

جیت رہے ہیں۔"

اس وقت پاکستانی فوج ہتھیار ڈالنے کی تیاری کر رہی تھی۔ عبرت ناک شکست اور ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی صدر یحییٰ "اسلامی آئین" کے نفاذ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے لیے ۲۹ دسمبر تاریخ مقرر ہو چکی تھی مگر ریڈیو پر اس سلسلے میں قوم سے خطاب' پندرہ منٹ پہلے منسوب کر دیا گیا۔ کیونکہ شکست اور ہزیمت کی ماری ہوئی قوم کے ساتھ اس سے بڑا اور کیا مذاق ہو سکتا ہے کہ جب بھارت نے پاکستان کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے بعد جنگ بندی کی تجویز دی تو پاکستانی قیادت دو گھنٹے اجلاس میں غور کرتی رہی کہ جنگ بندی گرین وچ ٹائم' بھارتی وقت' مغربی پاکستان یا مشرقی پاکستان کے وقت میں سے کس وقت ہونی چاہیے۔

یحییٰ خان کی شخصیت پر عیاشی اور شراب نوشی چھائی رہی اور وہ احمقانہ فیصلے کرتا رہا۔ یحییٰ خان دراصل پاکستان کا ایک ایسا مبہم کردار ہے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یحییٰ خان کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ان کے "کارناموں" کا چرچا رہا۔ حتیٰ کہ پاکستان میں ایک ایسی عورت بھی یحییٰ خان کی وساطت سے اقتدار کے ایوانوں کی طاقتور ترین ہستی قرار پائی' جس کا کام اعلیٰ عہدیداروں کو عورتیں سپلائی کرنا اور خود کو عیاشی کے لیے پیش کرنا تھا۔

یونس حبیب

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بدعنوانیوں کے حوالے سے مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یونس حبیب نے پاکستانی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز لوگوں سے لے کر تمام بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں تک دولت تقسیم کی اور حکومتوں کی تبدیلیوں میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ مہران بینک سکینڈل کے منظرعام پر آنے سے پورے ملک کے ذرائع ابلاغ نے شور مچا دیا اور روز نت نئے انکشافات اخبارات کے ذریعے منظر عام پر آنے لگے اور یونس حبیب کی شخصیت اور کارنامے "موضوع عام" کی حیثیت اختیار کر گئے۔ مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب کو جب گرفتار کیا گیا تو وہ بینک دولت پاکستان (STATE BANK OF PAKISTAN) کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ ایک میٹنگ کے بعد بیرون ملک جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب پر ان گنت دیگر بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کے علاوہ حبیب بینک اور مہران بینک میں ۵ بلین روپے کے غبن کا بھی الزام لگایا گیا اور اسے تفتیش کی غرض سے ریمانڈ پر بھیج دیا گیا۔ دوران تفتیش جو حقائق سامنے آئے ان کے مطابق یونس حبیب کا کردار صرف مہران بینک میں بے ضابطگیوں تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا سلسلہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز افراد اور اہم سیاست دانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یونس حبیب نے تفتیش کاروں کے سامنے اعتراف کیا کہ بڑے بڑے سیاست دانوں نے اس سے فیض حاصل کیا ہے اور

"فیض" کا یہ سلسلہ اس وقت سے جاری و ساری ہے جب وہ حبیب بینک میں تھا اور یہ سلسلہ مہران بینک میں بھی جاری رہا۔

یونس حبیب کی شخصیت اس وقت بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی جب اس نے انکشاف کیا کہ وہ برسر اقتدار پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ صدارتی انتخابات کا وقت آ گیا۔ اس کے بقول اس نے صدر فاروق لغاری کے صدر بنائے جانے کے دوران پی پی پی کو کروڑوں روپے مہیا کیے۔ اسی دوران یونس حبیب نے انکشاف کیا کہ وہ سرحد میں آفتاب احمد شیرپاؤ سے ملا اور پھر انور سیف اللہ اور سلیم سیف اللہ سے بھی ملاقات کی۔ واضح رہے کہ یونس حبیب کی ان مذکورہ افراد سے ملاقات کے فوری بعد سرحد کے وزیراعلیٰ پیر صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی۔ یونس حبیب نے آفتاب شیرپاؤ کے لیے نواز شریف گروپ کے ارکان صوبائی اسمبلی کو خریدنے کے لیے بینک رولنگ کے ذریعے سرمایہ فراہم کیا۔ کیونکہ یونس حبیب اپنے اس "تعاون" کے بدلے میں آفتاب شیرپاؤ کے اثر و رسوخ کے خواہاں تھے تاکہ سٹیٹ بینک کے گورنر سے اپنے بینک کے لیے "سب اچھا" کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکیں۔

لیکن یونس حبیب کی بدقسمتی کہ ایسا نہ ہو سکا اور یونس حبیب کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز دوست اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے اور یہ سارا عمل یونس حبیب کے لیے ناقابل یقین تھا۔ صابر شاہ نے سرحد اسمبلی توڑے جانے کے خلاف عدالت میں رٹ دائر کی اور یونس حبیب کو گواہ کے طور پر عدالت میں لانا چاہا کہ انہوں نے صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو مالی امداد فراہم کی تھی۔

اس سارے قضیئے سے مہران بینک کے سربراہ یونس حبیب اور صابر شاہ کے تعلقات بہت زیادہ دوستانہ تھے اور اسی سال جنوری میں سرحد کے وزیراعلیٰ پیر صابر شاہ نے اپنے تمام محکموں کو حکم نامہ جاری کیا تھا کہ وہ اپنے تمام فنڈز مہران بینک میں جمع کرائیں۔ وزیراعلیٰ کے اس حکم کا فوری نتیجہ نکلا اور چند ہی روز میں مہران بینک میں ۴۰۰ ملین روپے جمع کرا دیے گئے تھے۔

اس کے علاوہ یونس حبیب کے پیپلز پارٹی کے سربراہ سے قریبی تعلقات تھے

اور وزیراعلیٰ سرحد نے اوورسیز پاکستان فاؤنڈیشن کے منیجنگ ڈائریکٹر کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں کہ وہ OPF کے بھاری فنڈز مہران بینک میں جمع کروائیں تاہم OPF کے منیجنگ ڈائریکٹر نے اس معاملے کو لٹکائے رکھا۔ اسی دوران سٹیٹ بینک کی طرف سے یونس حبیب اور اس کے بینک کے خلاف کارروائی کی تو OPF کے منیجنگ ڈائریکٹر کا راستہ صاف ہوگیا۔ اس کے علاوہ پی پی پی کے ایک ایم این اے جو آصف علی زرداری کے قریبی دوست بھی ہیں' انہوں نے مہران بینک سے ایک تعمیراتی منصوبے کے لیے بھاری قرض لیا اور زرداری کی قربت داری کی پیشکش ہی جو یونس حبیب کے لیے بہت پرکشش تھی۔ لیکن سب کچھ حبیب یونس کی توقعات کے مطابق نہ ہوا۔ زرداری نے یونس حبیب کے پی پی پی کے ساتھ کسی قسم کے تعلق سے انکار کیا۔ تاہم زرداری مکمل طور پر اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ڈیوٹی فری کیس میں ۳۰۰ ملین روپے کے ایک خلاف قانون قرضہ میں ملوث ہیں۔

مہران بینک کی ابتداء ہی سے کارکردگی خراب تھی۔ اور بینک کا اتنی دیر قائم رہنے کی وجہ ہی حکومتی کھاتوں کا مہران بینک کے لیے مل جانا تھا اور ان کھاتوں کے بڑے ذرائع جام' ایم کیو ایم اتحاد اور صوبہ سرحد کے سیاست دان تھے۔ جام صادق علی نے اپنے وزیر خزانہ کو حکم دیا کہ سندھ حکومت کے کھاتوں کا کم از کم ۷۵ فیصد مہران بینک میں جمع کروا دیا جائے۔

ایف سی اے کے مطابق ۴۲۹ ملین روپے مہران بینک میں جمع کروائے گئے جن میں بڑے بڑے کھاتہ دار درج ذیل ادارے ہیں:

* K M C ------ 310 MILLION.
* I C P —— 60 MILLION.
* K P T —— 20 MILLION.

جام صادق کے جانشین مظفر حسین نے بھی حکومتی قوانین کی خلاف ورزیاں کیں جن میں پرائیویٹ بینکوں میں کھاتہ داری سے منع کیا گیا۔

دوسرے صوبوں نے بھی حسب توفیق مہران بینک میں کھاتہ داری شروع کی۔ اس میں سب سے بڑا حصہ پنجاب کا تھا جو ۳۱۰ ملین ہے۔ سرحد اور بلوچستان نے

بالترتیب ۱۳۰ اور ۳.۷ ملین روپے جمع کروائے۔ آزاد کشمیر حکومت نے بھی ۲۰ ملین روپے اس میں جمع کروائے۔

پانچ ماہ بعد جب اس بینک کے دروازے عوام کے لیے کھولے گئے تو اس وقت بینک دیوالیہ قرار دیے جانے کے قریب تھا۔ جنرل مرزا اسلم بیگ جو اس وقت آرمی چیف تھے اور آئی ایس آئی کے چیف جنرل جاوید ناصر نے بینک کو بچانے کے لیے اپنی تنظیم کے ۳۹ ملین ڈالر اس میں جمع کروائے' اور ایک مرتبہ پھر حکومتی قوانین کی خلاف ورزیاں ہوئیں۔

آئی ایس آئی کے اکاؤنٹ حاصل ہونے سے یونس حبیب شیر بن گئے اور انہوں نے خود تسلیم کیا کہ ان رقوم سے وہ اپنے دوسرے مقاصد کی تکمیل کرتے رہے۔

جنرل نصیر کے بعد آنے والے لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف اپنے پیش رو کے نقش قدم پر نہ چلے اور فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی رقم زیادہ محفوظ بینک میں جمع کروائیں گے۔ جب انہوں نے یہ رقم نکلوانا چاہی تو یونس حبیب کا بینک اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ رقم واپس کر سکے اور یہی وجہ تھی کہ یونس حبیب کو ایک قانون نافذ کرنے والے ادارے نے اٹھا لیا اور ان سے معاملہ طے کیا تو یونس حبیب نے وعدہ کیا کہ وہ رقم واپس کر دے گا۔

یونس حبیب نے ۳۶۷ ملین کی رقم جو ڈالر بیئرر سرٹیفکیٹ کی فروخت سے حاصل کی' اس میں سے ۲۰ ملین ڈالر آئی ایس آئی کو لوٹا دی اور دوسرے روپوں سے نئی سودے بازیاں کیں۔ قوانین کے مطابق ان سرٹیفکیٹس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ۷۲ گھنٹوں کے اندر اندر سٹیٹ بینک میں جمع کروانا ہوتی ہے۔ یونس حبیب نے ایسا نہ کیا اور فنڈز خرد برد کر دیے۔ اس سے قبل بھی ایک مرتبہ یونس حبیب نے ڈالرز بیئرر سرٹیفکیٹ سے حاصل ہونے والی رقم ۱۵ روز تک جمع نہیں کروائی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے جب پہلے بھی یونس حبیب سٹیٹ بینک سے اس طرح کے واجبات میں قوانین کی خلاف ورزیاں کر چکے تھے تو سٹیٹ بینک نے اسے ۴۳۰ ملین ڈالر کے سرٹیفکیٹ کیوں فروخت کیے؟

جب سٹیٹ بینک کے محتسب مہران بینک کے حسابات کی پڑتال کر رہے تھے تو اس وقت حسابات اتنے پیچیدہ ہوگئے کہ محتسب چکرا کر رہ گئے۔ انہوں نے کئی جگہ نامکمل اور کروڑوں کی خردبرد کی پڑتال کی۔ مہران بینک کے اندرونی لوگوں کے مطابق حبیب بینک کی مختلف برانچیں مہران بینک میں شامل ہیں اور ان کا تمام ریکارڈ تبدیل کر دیا گیا ہے تاکہ حبیب بینک کے زونل چیف کی حیثیت سے کی گئی بے ضابطگیوں کا علم نہ ہو سکے۔

مہران بینک کا کمپیوٹر سیکشن انتہائی حساس تھا۔ وہاں پر ہمیشہ گارڈ رہتی اور اسی دوران حبیب بینک کا ریکارڈ لاکر یہاں تبدیل کیا جاتا۔ یونس حبیب کے کارندے چھٹی کے دن بھی ذاتی طور پر اس کے لیے کام کرتے۔

یونس حبیب نے مہران بینک کو "صفر سرمایہ کاری" سے آگے نہ بڑھایا اور اپنی ساری جائیداد جو اس نے حبیب بینک کے دوران بنائی تھی' فیصل اسلامی بینک کو ۳۰۰ ملین روپوں کے عوض گروی رکھ دیا پھر اس نے ۲۰۰ ملین روپوں کے حصص اپنے اور اپنے خاندان کے افراد کے نام خریدے اور باقی ۱۰۰ ملین کے حصص اپنے ڈائریکٹر کے نام خریدے۔ اور ان ڈائریکٹرز نے کچھ بھی ادائیگی نہیں کی بلکہ یونس حبیب کو برے دنوں میں عام نرخوں سے ۴۰ روپے زیادہ قیمت پر حصص خریدنے پر مجبور کیا۔

ایکسپورٹ انٹرنیشنل کے معاملے میں یونس حبیب نے ۸۳۰۲۰۰ ڈالر فرم کے کھاتوں میں منتقل کیے اور ڈالر بیئرز سرٹیفکیٹ خریدے اور منافع دوسرے کھاتوں میں جمع کروا دیا اور کئی جعلی کمپنیوں کو قرضوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ یونس حبیب نے کوئی ۲۹ کے قریب جعلی کمپنیاں چلائیں جن کو باقاعدگی سے قرضہ دیا جاتا رہا اور اس روپے کو بھی بعد میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا۔ ۱۳ ملین روپے ان کمپنیوں اور جعلی کھاتوں میں جو زیادہ تر اس کے گھریلو ملازمین کے ناموں پر تھے' کا سراغ ملا ہے۔

اس نے حبیب بینک سے سیاست دانوں کو تقریباً ۲۸۰ ملین کی رقم فراہم کی اور فوائد حاصل کیے۔ ان میں سابق چیف آف آرمی سٹاف زیادہ نمایاں ہیں۔

جنرل صاحب کو ۱۴۰ ملین روپے کی رقم ایک آرمی اکاؤنٹ کے لیے ملی جو

یونس حبیب نے عطیہ کے طور پر دی۔ یہ رقم ۱۰ ستمبر سے ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کے دوران ایک انٹیلی جنس ایجنسی کے اکاؤنٹ میں الائیڈ بینک، مسلم کمرشل بینک، یو بی ایل اور نیشنل بینک آف پاکستان میں جمع کروائی گئیں۔ پھر یہ رقم فوراً نکلوا کر ۱۹۹۰ء کی الیکشن کمپین کے دوران مختلف سیاست دانوں کے لیے استعمال ہوئی۔

یونس حبیب نے ایم کیو ایم کے ٹرانسپورٹ کے مسئلے اور الطاف کی سماجی سرگرمیوں کے لیے سوزوکی پک اپ اور کاریں فراہم کیں۔ اسی دوران آرمی چیف اور الطاف کی ملاقاتیں خفیہ طور پر ہوتی رہیں اور یونس حبیب پس پردہ رہے۔ بے نظیر کے خلاف تحریک عدم تعاون کے لیے اسمبلی میں کم از کم ۳۰ ایسے ایم این اے چاہیے تھے جو کہ وزیراعظم کے کیس کو مضبوط کر سکیں لیکن مسئلہ پیسوں کا تھا۔ یہاں پر بھی یونس حبیب نے ۱۴۰ ملین روپوں کا عطیہ دیا۔ اس میں سے ۴۰ سے ۷۰ ملین تک روپے لوگوں میں بانٹے گئے اور باقی تمام رقم بیگ صاحب نے اپنے پاس رکھی اور جتوئی صاحب کے حصے ۵ ملین روپے آئے۔

یونس حبیب نے جاوید ہاشمی کو نواز شریف کی خلیج جنگ پالیسی کو عوامی رائے سے تبدیل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ایم این اے ملانے کے لیے ۳۰ ملین روپے دیے اور باقی رقم بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

جب بیگ صاحب تمام اطراف سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے آخری وقت پی ایم ایل (ج) کے ساتھ رابطے استوار کیے اور یونس حبیب کو ایک بے کار سی چیز قرار دے دیا اور اس کا ذکر دھوکے بازوں اور فراڈیوں میں کیا۔

یونس حبیب نے کہا کہ اگر میری رپورٹ ایف آئی اے کبھی عوام کے سامنے لائیں تو نوبت یہاں تک آجائے گی کہ ملک کے بڑے بڑے لوگ میرے ساتھ تباہ ہوں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ سکینڈل حل نہیں ہو سکا۔ ان بڑے بڑے لوگوں اور خود یونس حبیب نے غیر قانونی اقدامات سے فوائد حاصل کیے۔ ان کو سیاسی مصلحتوں کے تحت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق سے بہت کچھ سامنے آئے گا جو وقت کی ضرورت ہے۔ یہ ۱۵۰ ملین روپیہ عوامی فنڈز ہیں۔ یہ رقم ان لاکھوں کروڑوں روپوں سے الگ ہے جو کہ یونس حبیب یا دوسرے لوگ ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ یونس

حبیب کی پے در پے بے ضابطگیوں سے ایک بڑے اور مضبوط مرکزی بینک کی ضرورت شدت سے سامنے آئی ہے کیونکہ ملک میں بکھرے ہوئے پرائیویٹ بینکوں میں سے ایک اور مہران بینک ایک عام کھاتہ دار کا اعتماد بینکنگ سے ختم کر سکتا ہے اور پھر اس کی صفائی کا عمل تکلیف دہ اور مشکل ہے۔

مہران بینک سکینڈل کی غیر جانبدار تحقیق سے بہت سے لوگوں کے چہروں سے نقاب اترے گا۔ ایک بینک کلرک سے لے کر ایک طاقتور معاشیات دان تک یونس حبیب کے پیچھے بہت ساری سیاہ کاریاں' فراڈ اور دھوکہ دہی کے واقعات کی ایک لمبی قطار ہے۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان مملکت کا مرکزی بینک یونس حبیب کے فراڈ اور جعل سازیوں کا پہلا نشان نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بدعنوانی' فراڈ بینک کاری کے اصولوں سے انحراف کی ایک لمبی داستان ہے جس میں اس کی حبیب بینک میں تحکمانہ ترقیاں اور اس کا عروج' اس کی دولت جائیداد جو کہ ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقوں میں اس کی حرص' ہوس اور ہر طریقے سے دولت اکٹھا کرنے کی غماز ہے۔ وہاں یہ اس موجود بینک کاری کے نظام کی بھی قلعی کھولتا ہے کہ جو اس کی بے ضابطگیوں اور دھوکہ دہی پر گرفت نہ کر سکا۔

حبیب بینک کے ملازمین اس کے فراڈ اور دھوکہ دہی سے اکٹھی کی گئی چند ملین روپے رقم کی داستان سناتے ہیں۔ یونس حبیب کی ان سیاہ کاریوں کے بارے میں کئی داستانیں گردش کر رہی ہیں۔ کچھ لوگ اسلم بیگ کو اس کا محسن ٹھہراتے ہیں جو اس سے اپنے مفادات حاصل کرتا رہا اور یونس حبیب کو سٹیٹ بینک سے کلیر کروایا اور یوں وہ مہران بینک کا کرتا دھرتا بن گیا۔ جنرل اسلم کے سسر محمد علی نے حبیب بینک سے کئی بار قرضہ وصول کیا۔ دوسری کہانی میں جام صادق سے یونس حبیب کے تعلقات اور احسانات کا ذکر کیا جاتا ہے اور ایک بڑی شخصیت کے بیٹے کے اغوا کرنے کا ذکر بھی آتا ہے کہ انہوں نے یہ کام یونس حبیب کا نام کلیئر کروانے کے لیے کیا اور انہوں نے وزیر اعلیٰ سندھ کی حیثیت سے مرکزی حکومت میں اپنے اثر و رسوخ سے یونس حبیب کو مہران بینک کا چیف ایگزیکٹو منظور کروایا۔ سٹیٹ بینک نے ۱۸۰ ملین کا ڈرافٹ کیش نہ ہونے پر مہران بینک پر نئے کھاتے کھولنے کی پابندی نے بھی کوئی اثر

نہ کیا اور وہ مزید کھاتہ داروں سے ڈپازٹ لیتا رہا۔

FIA ڈالر بیریئر سرٹیفکیٹ کے بارے میں چھان بین کرتی رہی لیکن ان تمام افسران کو جو ابھی تک بینکوں میں کام کر رہے ہیں، سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ ان تمام سرکاری افسروں اور محکموں کی چھان بین کی ضرورت ہے جو مہران بینک سکینڈل میں ملوث ہیں۔

ذیل میں ان سیاست دانوں کا ذکر ہے جنہوں نے یونس حبیب سے مالی فوائد حاصل کیے۔

☆ - آفاق احمد (ایم کیو ایم) ۵ ملین۔

☆ - ڈاکٹر فاروق ستار ۲.۰ ملین

☆ - مظفر حسین شاہ سابق وزیراعلیٰ سندھ امتیاز شیخ کے ذریعے ۵.۰ ملین۔

☆ - نواز شریف (آصف شاہ کے لیے) ۳.۵ ملین۔

☆ - دوست محمد فیاض ۱ ملین۔

☆ - جام حیدر علی ۲.۳ ملین۔

☆ - جام معشوق علی ۰.۸ ملین

☆ - مصطفیٰ کھر (آصف شاہ کے ذریعے سے) ۳.۰ ملین۔

☆ - لیاقت جتوئی ۱.۵ ملین۔

☆ - اجمل خان (سابق وزیر کھیل) ۱۳ ملین۔

☆ - جام صادق علی (مہران بینک کے افتتاح کے لیے) ۱۵ ملین۔

درج ذیل جائیدادیں یونس حبیب نے یا تو ذاتی طور پر یا پھر اپنی فیملی کے نام پر خریدیں۔

☆ - بنگلہ نمبر 97/B مرکزی گلی نمبر ۱۴، فیز II ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ خیر النساء زوجہ یونس حبیب

☆ - بنگلہ نمبر 95/B سنٹرل سٹریٹ نمبر ۱۴، فیز II ڈی۔ ایچ۔ اے یونس حبیب۔

☆ - پلاٹ ایک ہزار گز سنٹرل ایونیو فیز DHA II مس فرحین یونس دختر یونس حبیب۔

☆ ۔ بنگلہ نمبر ۳ سنٹرل سٹریٹ DHA II مس فرحین یونس۔

☆ ۔ بنگلہ نمبر 26th 1/III سٹریٹ فیز DHA V زیب النساء زوجہ یونس حبیب۔

☆ ۔ بنگلہ نمبر 21/A سن سیٹ بلیوارڈ DHA زیب النساء کے نام لیکن مرزا اسلم بیگ کے تصرف میں۔

☆ ۔ کارنر بنگلہ 15th سٹریٹ خیابان توحید۔

☆ ۔ بنگلہ نمبر 19th x/16 سٹریٹ فیز DHA I زیب النسا۔

☆ ۔ ۳۰۰ ایکڑ زرعی زمین واقع سجاول —— زاہد یونس پسر یونس حبیب۔

☆ ۔ ۳۰۰ ایکڑ زرعی زمین واقع ٹھٹھہ ملکیتی یونس حبیب۔

☆ ۔ ۳۰۰ ایکڑ زرعی زمین اور فش فارم واقع ٹھٹھہ ملکیت یونس حبیب۔

☆ ۔ ۲۰۰ ایکڑ زرعی زمین ملکیت زیب النساء۔

اس کے ساتھ ساتھ یونس حبیب نے ۱۴۰ ملین روپے کے شیئرز اپنے اور اپنے خاندان کے نام سے خرید رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایف آئی اے کے مطابق ۲۱.۱ ملین روپے امریکہ میں منتقل کیے جا چکے ہیں۔ جو کہ ان کے خاندان کے استعمال کے لیے ہیں۔

پاکستانی ریاست نظریے کے جبر اور سسٹم جو طاقتور افراد کے ہاتھوں ختم ہوئی ہے۔ اس میں بسنے والوں نے اپنی انفرادی طاقت سے جمہوری اداروں کو تسخیر کر لیا ہے۔ از منہ وسطیٰ میں یہ خاتمہ مختلف مظہرات کے تحت ہوتا' لیکن آج کی دنیا میں بین الاقوامی قانون اس قدر مضبوط ہے کہ ریاست ختم ہو کر بھی قائم رہتی ہے۔ آج پاکستان میں ادارے مردہ ہو چکے ہیں۔ صرف سیاست دان زندہ ہیں۔ انھیں ریاست کی موت کا کافی حد تک اندازہ ہے' اس لیے انھوں نے اپنی کرپشن سے جمع کی ہوئی دولت بیرون ملک منتقل کر رکھی ہے۔ یہاں بھی الزام لگانے والے اور ملزم کے درمیان عمل اور کردار کی یکسانیت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قانون احتساب کے عدم توازن پر دنیا حیران ہے' وہاں پاکستانی معاشرے کو اس کا احساس بھی نہیں۔ دراصل پاکستان میں طاقتور فرد کا کردار تحیر کی حد سے تجاوز کر چکا ہے۔

خالد احمد